مختارالدین آرزو بحیثیت محقق

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

2015-2011

مقالہ نگار

محمد زبیر

نگراں

پروفیسر ابن کنول

شعبۂ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

CamScanner

تلخیص

مختارالدین آرزو بحیثیت محقق

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

2011-2015

مقالہ نگار

محمد زبیر

نگراں

پروفیسر ابن کنول

شعبۂ اردو

دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کا شمار یقینی طور پر دنیا کے ممتاز ترین اسکالروں میں ہوتا ہے۔ان کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع وعریض ہے۔عربی اردو اور فارسی زبانوں میں ان کی خدمات پائی جاتی ہیں۔ بظاہر وہ ہم کو عربی زبان وادب سے منسلک نظر آتے ہیں مگر انہوں نے اردو اور فارسی کے مسلم الثبوت محقق ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان زبانوں کے اہل علم میں ان کے کارناموں کو بڑی توجہ اور احترام کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔

پروفیسر مختارالدین احمد تحقیق وتدوین کے مرد میداں ہیں۔ان کا تحقیقی شعور نہایت پختہ ہے۔وہ ہر بات کو چھان پھٹک اور ٹھونک بجا کر پیش کرنے کے عادی ہیں کسی واقعہ یا فن پارے کو تاریخی واقعات اور فنی کسوٹی پر کس کر تحریر کرتے ہیں۔وہ کسی قلم کار کی بات یا تحریر کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے بلکہ وہ زیر بحث مسئلے کے جملہ پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے غور وفکر کرتے ہیں۔مزید اس تعلق سے تمام جزئیات پر مکمل یکسوئی کے ساتھ مطالعہ،محاکمہ اور تحقیق کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور اس کے بعد قول فیصل کو سپرد قلم کرتے ہیں۔اس عمل میں خواہ کتنا ہی وقت لگے یا کتنی ہی محنت کرنی پڑے ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔اسی طرح جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنا بھی ان کی طبیعت سے پرے ہے۔انہی وجوہات کی بنا پر ان کے تحقیقی کارنامے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان کی تحقیق کا معیار نہ صرف ان کی مرتب کردہ کتابوں میں ملتا ہے بلکہ ان کے مقالات کا معیار بھی انتہائی بلند ہے۔ان کے مقالات اور مضامین کو پڑھ کر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔وہ ان مقالات میں اس قدر اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں کہ دوسرے ضمنی موضوعات کی نشاندہی خود بخود ہو جاتی ہے۔ دراصل تحقیق وتدوین ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اس میدان میں کام کرنے کے لیے تحقیقی ذوق،تبحر علمی، وسعت

نظر اور مختلف میدانوں میں اچھی معلومات درکار ہوتی ہے تب یہ کام انجام کو پہنچتا ہے۔ آرزؔو صاحب میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین ہندو بیرون ہند میں ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے بہت کچھ لکھا ہے، ضخامت، تنوع، گہرائی و گیرائی ہر اعتبار سے ان کا کام توجہ کا طالب ہے۔ لیکن ان تمام کاموں میں اولیت وافضلیت ''کربل کتھا'' کو حاصل ہے۔ فضلی کی ''کربل کتھا'' جو تقریباً ایک صدی سے مفقود تھی جس کی دریافت کا سہرا مختار الدین احمد آرزؔو کے سر ہے۔ یہی ان کا وہ بیش بہا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے مختار الدین احمد محققین کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند اور بھی اہم مخطوطات ہیں جو انھیں کی کاوشوں سے زیور طباعت سے آراستہ ہوئے اور افادۂ عام کے لیے منظر عام پر آئے اور طلبا واسکالر نے بھرپور فائدہ اٹھایا ان میں حیدر بخش حیدری کا تذکرہ ''گلشن ہند''، مفتی صدر الدین آرزو کا ''تذکرہ ہائے اردو'' یا ''تذکرہ شعرائے اردو'' شیخ یحیٰ حضور عظیم آبادی کا ''دیوان حضور'' اور سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی کا ''تذکرہ شعرائے فرخ آباد''، اسی طرح خطوط اکبر، ذاکر صاحب کے خطوط، غالبیات میں نقد غالب اور احوال غالب وغیرہ۔

جہاں تک فضلی کی ''کربل کتھا'' کا تعلق ہے تو اب تک کی معلومات کے مطابق شمالی ہند کی اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف ہے۔ یہ ایک زمانے تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے اور اردو نثر کا یہ اہم فن پارہ تقریباً نہ کے برابر تھی، بلکہ اہل علم اس کی بازیافت سے مایوس ہوچکے تھے۔ اتفاق سے اس کتاب کی گمشدگی کے تقریباً ایک سو سال کے بعد اس کی دریافت ہوئی۔ یہ گرانقدر کارنامہ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے مالک رام کی معاونت کے ساتھ انجام دیا۔ اور اس فن پارے کو غیر معمولی انہماک کے ساتھ مرتب کر کے اپنے تحقیقی ذوق، تبحر علمی اور وسعت مطالعہ کا ثبوت پیش کیا۔ مختار الدین احمد ہمارے ان محققین و مدونین میں ہیں جنہوں نے ادب کے سمندر میں غواصی کر کے ادب و تحقیق کے خزانے میں گرانقدر اضافے کیے اور اعتبار بخشا ہے۔ ''کربل کتھا'' ان کی نگارشات میں سرفہرست ہے۔

کسی بھی اچھی تدوین کا معیار کا اندازہ اس کی ابتدا میں موجود مقدمہ سے کیا جاتا ہے اور پھر متن کو مختلف

نسخوں سے اصول تدوین کے مطابق مرتب کیا گیا ہو۔ اس کے آگے اختلافات نسخ ،حواشی ،فرہنگ اوراشاریہ ہوں''کربل کتھا'' کا مقدمہ جو کہ زیادہ تر مختارالدین احمد آرزو کا لکھا ہوا ہے ہر اعتبار سے جامع اور معتبر ہے۔ چونکہ کتاب کا ایک ہی نسخہ مل سکا تھا اس لیے متن صحت کے ساتھ پیش کرنا کار دشوار تھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ اس کی زبان فرسودہ معرب اور مفرس ہے۔لیکن خوش قسمتی یہ تھی کہ دونوں مرتبین عربی کے بھی عالم تھے۔اورنسخہ واحد ہونے کی وجہ سے اختلاف نسخ کا سوال ہی نہ تھا۔لہٰذ قرأت کی تصحیح ہر صفحہ کے نیچے فٹ نوٹ اور حواشی فٹ نوٹ میں ہیں۔اوراختتامی اجزاء میں سب سے پہلے عربی عبارتوں اورفقروں کی فرہنگ ہے جس میں اردو ترجمہ کے علاوہ یہ بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ عبارت کہاں سے ماخوذ ہے۔ پھر چار صفحوں میں فہرست ماخذ حواشی ہے۔سیدھے سادے لفظوں میں کتابیات کی فہرست ہے جو کہ کتاب کے آخری صفحات پر ہے۔کتابوں کے نام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے کتنی تحقیق وتدقیق سے کام لیا ہے۔اس کے علاوہ اعلام،امم وقبائل،غزوات وایام، بلدواماکن،متعلقہ ایات قرآنی، احادیث نبوی، اقوال وحکم کتب ادادۃ متن ، الفاظ مستعملہ قدیم کی فہرستیں بھی موجود ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بناپر مرتب کے علم وفضل اورعرق ریزی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔اس طرح ہم پورے اعتبار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ''کربل کتھا'' کی تدوین مثالی معیار کی ہے۔اوراس کارنامے نے مختارالدین احمد آرزوکو پایۂ اعتبار بخشاہے۔

اسی طرح جب غالب کے حوالے سے بات کی جاتی ہے تو اس میں بھی مختارالدین آرزو کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ غالب کے حالات اورخطوط کے سلسلے میں ان کی کاوشیں اوردلچسپیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان کا نام بجاطور پر ماہر غالبیات میں لیا جاتا ہے۔ بلکہ میں یہاں پر مختصراً یہ کہتا ہوں کہ غالب پر کام کرنے والا کوئی اسکالر،کوئی نقاد پروفیسر مختارالدین احمد کی مرتب کردہ کتابوں کے ان مقالات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ بالفاظ دیگر غالب کے سلسلے میں کوئی بھی تحقیق بغیر ان کتابوں سے رجوع کیے مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔اس سلسلے میں ان کا قابل ذکر کارنامہ''احوال غالب''،''نقد غالب''اورعلی گڈھ میگزین کا غالب نمبر شامل ہے۔

اسی طرح مکتوباتی ادب کے ادبی وتاریخی اہمیت وارتقاء کو نظر میں رکھتے ہوئے متقدمین کے اس دور کی چار

اہم وممتاز شخصیات یعنی غالب، مصطفیٰ غوث، بیخود، سر سید احمد خاں اور محمد حسین آزاد کے خطوط کی بازیافت کی اوران پر مناسب تعارفی نوٹ اور حواشی لکھے اور شائع بھی کرائے یہ بہت وقیع کام ہے جس کو انہوں نے انجام دیا۔اس کے علاوہ متاخرین ومعاصرین میں ڈاکٹر ذاکر حسین ، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودودوغیرہ کے خطوط بھی آپ نے بڑی محنت سے شائع کیے۔

قلم کو یارانہیں کہ پروفیسر مختارالدین احمد کی ادبی وتحقیقی خدمات کا ذکر ہواوران کی عربی زبان وادب کی خدمات کا ذکر نہ کیا جائے۔دراصل وہ عربی ہی کے آدمی تھے۔انہوں نے بین الاقوامی شہرت کی حامل علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے عالم اسلام کے مایۂ ناز محقق اور عربی کے جید عالم علامہ عبدالعزیز یمینی کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے پروفیسر گب کی نگرانی میں ۱۶ ماہ کی قلیل مدت میں ڈی فل کا مقالہ پیش کیا۔ان کی عربی خدمات میں **الامیر موید الدولہ اسامہ بن منقذا الکسائی الشیذری، فضائل من اسمہ احمد و محمد لابن بکیر البغدادی، المختار من شعرابن الدّمینیہ، الحماسۃ البصریۃلصدر الدین علی بن ابی الفرج البصری ، رسا لۃالمبّرد النحوی، کتاب مجالس المیمنی للعلامۃ الشیخ الاستاذ عبدالعزیز المیمنی قدّ لہ وحققہ علّق علیہ الدکتور مختارالدین الأحمد۔**

تحقیق وتدوین کی خشک اور سنگلاخ وادیوں کا یہ مسافر گل گلستان بلبل وچمنستان کی سیر کرتا ہوا اور فصل گل سے وسعت دامن کی دعا لیتا ہوا اور نشۂ عشق ومحبت سے سرشار، بادصبا سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا غزل کی زلف گرہ گیر کو سلجھاتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔اگر انھوں نے تحقیق وتدوین کے اعلیٰ نمونے پیش کیے تو ان کی شاعری میں بھی سلاست اور روانی کے ساتھ غزل کا چٹخارہ ملتا ہے۔نمونہ شاعری ملاحظہ ہو:

سکوں کے نام سے گھبرائے گی عمر رواں میری
قیامت تک نہ کم ہونگی خدا بے تابیاں میری
کبھی تو پر اثر ہونگے نالے فغاں میری
میں چپ سنتا رہوں گا وہ کہیں گے داستاں میری

مری بے تابیِ دل ڈھونڈھ لے گی خود ہی منزل کو

تو اے سعی عمل نذر سکونِ کارواں کیوں ہو

تلاشِ یار میں پائے سبک سے کام لیتا ہوں

مری وحشت خرامی دشت پر بار گراں کیوں ہو

تحمل کا سبق لیتا رہے انساں اگر غم سے

خوشی حد سے گذر کر وجہ مرگ ناگہاں کیوں ہو

پڑی رات بھر ساقی، سحر کو توبہ کر لینا

ابھی سے آرزوئے بادہ کش خوف اذاں کیوں ہو

بہار صحن گلشن کب رہیں آتش گل ہے

چمن کی داستاں کیا داستان سوز بلبل ہے

بتِ آتشِ شعا کے عارضوں گلگلوں پہ کاکل ہے

کہ صبح نور پرورده اسیر شام سنبل ہے

مجھے ڈر ہے صدا دونوں کی آپس میں ٹکرائے

ادھر ہیں شیخ کے نعرے ادھر آواز قلقل ہے

عجب انداز سے اس شوخ نے گیسو سنوارے ہیں

فلک پر صورت آئینہ حیراں سب ستارے ہیں

ورق بکھرے ہیں شاید مصحف ہستی بسمل کے

وگرنہ ہاتھ میں قاتل کے کیوں قرآں کے پارے ہیں

زیرِنظر مقالہ ''مختارالدین احمد آرزو بحثیت محقق'' کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چونکہ مقالہ کا تعلق تحقیق سے ہے لہٰذا پہلے دو ابواب میں تحقیق اور اصول تحقیق پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

پہلا باب ''تحقیق منظر و پس منظر'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس کو چھ حصوں میں تقسیم کر کے تحقیق کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تحقیق کی تعریف جو کہ متعدد محققین نے کی ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد تحقیق کی قسمیں، تحقیق کے مقاصد اور تحقیق کی اہمیت و افادیت پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر کے دو ذیلی عنوان میں تحقیق کے سرچشموں کی طرف رجوع کیا گیا ہے اوراسلامی طرزتحقیق کے عنوان سے تحقیق کے منبع اصلی تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اورسب سے آخر میں جدید سائنسٹفک تحقیق کے عنوان سے مغربی طرزتحقیق کا جائزہ لے کراس باب کواپنے اختتام تک پہنچایا گیا ہے۔

باب دوم''اردو میں تحقیق کی روایت'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف)''اردو میں تحقیق کا آغاز وارتقا''اس میں اردو زبان وادب میں تحقیق کی ابتدا سے لے کرآج تک تحقیقی کارناموں کولانے کی کوشش کی ہے اور پورے تحقیقی کارنامے پرایک طائرانہ مگر وقیع نظرڈالی گئی ہے۔دوسرا حصہ(ب)''جدیداردوتحقیق اوراصول تحقیق''اس میں جدیداردوتحقیق کا معیاراورمقام کے ساتھ ساتھ بعض محققین نے تحقیق کے جواصول مرتب کیے ہیں ان کا بھی خاطرخواہ جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم''مختارالدین احمد آرزوؔ آئینہ ایام میں'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اوراس باب کو پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔پہلے تین حصوں میں مختارالدین احمد کے وطن اصلی صوبہ بہار کا سماجی ومعاشی اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے بہار کے بعض علمی خانوادوں کا ذکر کیا گیا ہے اورزبان وادب کی خدمات میں ان کا جو حصہ رہا ہے اس کومختصراً پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔چوتھا حصہ پروفیسر مختارالدین آرزو کی زندگی سے متعلق ہے اس میں موصوف کے خاندان، پیدائش، تعلیم وتربیت، ملازمت اورشاعری وافسانہ نگاری کے ساتھ اہل وعیال حتیٰ کہ اعزازات تک کے ذکر پرمحیط ہے۔پانچویں حصہ میں پروفیسر مختارالدین آرزو کی تحقیقی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔اوراس کو بارہ مختلف خانوں میں رکھا گیا ہے(۱)اردوتصنیفات وتالیفات کا جائزہ(۲)عربی تصنیفات کا جائزہ(۳)انگریزی تصنیفات وتالیفات کا جائزہ(۴)ان کے اشاریے ومقالات(۵)ان کے وہ مضامین جوانھوں نے اپنے ہم عصروں پرلکھے ہیں(۶)وہ مضامین جو انھوں نے مستشرقین شخصیات پرقلم بند کیے ہیں(۷)تذکرہ علماء وصوفیہ(۸)تذکرہ ادباء وشعراء مشاہیر جوکہ اردواورفارسی دونوں زبانوں کے تھے۔(۹)غالبیات(۱۰)تذکرے متن وتعارف(۱۱)عربی ادب سے متعلق مضامین(۱۲)کتب خانے وتعارف مخطوطات۔آخرالذکر حصے میں پورے مقالے کا تفصیلی طور پرجائزہ لے کران تمام خدمات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم ''مختارالدین احمد آرزؔو اور فن تحقیق'' ہے اس کو بھی چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''پروفیسر مختارالدین تحقیقی فن'' کے عنوان سے ان کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مختارالدین آرزؔو کے معاصر محققین کے عنوان سے مختلف محققین پر مختصراً تبصرہ کیا گیا ہے جس میں امتیاز علی عرشی، مالک رام، گیان چند جین، تنویر احمد علوی، مسعود حسن خان، رشید حسن خان، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر حنیف نقوی اور قاضی عبدالودود شامل ہیں۔ تیسرا حصہ مختارالدین احمد کا طرز تحقیق ہے جس میں ان کے تحقیقی کارناموں کے طرز اور انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ ''فن تحقیق میں مختارالدین احمد کا مقام ومرتبہ'' میں مختارالدین کے تحقیقی معیار کو پرکھا گیا ہے اور محققین میں ان کا مقام ومرتبہ طے کیا گیا ہے۔ آخر میں خاتمہ اور کتابیات کے حوالے کے ساتھ مقالہ کو پایۂ اختتام تک پہنچایا گیا ہے۔

Abstract

MUKHTARUDDIN AARZOO BAHAISIYAT MOHAQIQ

Thesis submitted to University of Delhi

for the Degree of Ph.D

2011-2015

Submitted by

MOHD. ZUBAIR

Under the Supervision of

Prof. N.M. KAMAL

Department of Urdu

University of Delhi

Delhi-110007

فہرست

پیش گفتار

تحقیق اپنے مخصوص معنوں کے اعتبار سے ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے مگر جب اس کو اس کے وسیع ترین معنوں میں لیا جائے تو وہ صرف سنی سنائی، گڑھی گڑھائی، اور بنی بنائی چیزوں کو بنا سوچے سمجھے، بنا جانچے پرکھے، بنا ناپے تولے، کسی بات یا فن پارے کو قبول نہ کرنے کا طریقہ ہے۔ جس کو ہم ایک طرز حیات کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یہی تحقیق ہے جو انسان کو حقائق کی نئی راہیں اور دقائق کی نئی جہتیں فراہم کرتی ہے۔ اگر انسان کے اندر سوال، جستجو، کم یقینی، یا شک وشبہہ کا رویہ نہ ہوتا تو بہت سے ایسے مسائل ہوتے جو نہ تو حل ہو پاتے اور نہ ہی ان کی عقدہ کشائی ہو پاتی۔ اور انسان اپنے آغاز سفر ہی پر کسی ایسی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا جو اس کا منزل مقصود نہ ہوتا پر نشان منزل کی تلاش وجستجو اسے آگے کی طرف بڑھاتے ہیں۔ بقول حالیؔ:

یہ جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہر تی ہے جا کر نظر کہاں

شاید اقبال نے قوم کے اندر اسی تحقیق وتلاش کی کمی کی شکایت کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو قوم تحقیق وتفتیش سے نا آشنا ہو جاتی ہے اور اس کے اندر نشتر تحقیق کند ہو جاتے ہیں۔ تو وہ فکری غلامی ومحکومی اور جامد تقلید ان کے ذہنو میں جڑ پکڑ لیتی ہے، جرأت رندانہ مفقود ہو جاتی ہے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں:

حلقہ شوق میں وہ جرأت رندانہ کہاں
آہ ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق
ہوتے ہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

بہرحال جس دن سے دنیا قائم ہوئی ہے اور حضرت انسان نے یہاں قدم رکھا ہے روز اوّل ہی سے خالق نے اس کی طبیعت میں تحقیق وجستجو کا عنصر رکھا ہے۔ جو اسے دم نہیں لینے دیتا اور تلاش میں مصروف عمل رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تلاش وجستجو کے انداز اور طریق کار زمانے کے اعتبار سے بدلتے اور ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں۔ آج ہم سائنس اور جدید ٹکنالوجی کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ تحقیق کا یہ عمل دنیا کے تمام علوم وفنون حتیٰ کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی سے بھی متعلق ہے۔ علوم وفنون میں تحقیق بہت سے شعبہ جات تقسیم ہوجاتا ہے۔ ان میں سے ایک تحقیق زبان وادب کی بھی ہے۔

جہاں تک اردو تحقیق کا تعلق ہے اس کی تاریخ کافی قدیم ہے اور اس زبان میں بھی ایسے محقق اس کے افق پر نظر آتے رہے ہیں جو اس زبان کے اول سرمائے کو رطب و یابس سے پاک صاف کرتے رہے ہیں۔ اور ان محققین کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اس سلسلے کی ایک اہم کڑی پروفیسر مختارالدین آرزو بھی ہیں جنھوں نے تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ دراصل مختارالدین آرزو کا تعلق ہمیشہ شعبہ عربی سے رہا ہے مگر انہوں نے اردو میں جو تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں اس کی وجہ سے دنیائے اردو ان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کے کارنامے ہی ان کی شہرت اور عالی مرتبت کا باعث ہیں۔ اور اس نصابی مقالہ میں مختارالدین آرزو کو بحیثیت محقق کے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مقالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل ''تحقیق منظر و پس منظر'' کے عنوان سے ہے۔ اور اس کو چار ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) تحقیق کی تعریف اقسام اور مقاصد (۲) تحقیق کی اہمیت وافادیت (۳) اسلامی طرز تحقیق (۴) جدید سائنٹفک تحقیق۔ اس باب میں تحقیق کی تعریف واقسام کے جائزے کے بعد تحقیق کے بنیادی سرچشموں کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔

باب دوم ''اردو میں تحقیق کی روایت'' ہے۔ اس کو دو ذیلی عنوان کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱)

اردو میں تحقیق کا آغاز وارتقا (۲) جدید اردو تحقیق اور اصول تحقیق۔ اس باب میں اردو میں تحقیق کی ابتدا سے آج تک کی خدمات کے ساتھ ساتھ جدید تحقیق اور اصول تحقیق کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم ''مختارالدین آرزو آئینے ایام''۔ اس کو پانچ ذیلی عنوانات کے تحت رکھا گیا ہے۔ ان میں سے تین کا تعلق مختارالدین آرزو کے وطن اصلی سے ہے۔ اس میں صوبہ بہار کی سماجی ومعاشی حالت وہاں کے وہ خونوادے جو کہ علم وادب کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں ان کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے جز میں مختارالدین آرزو کے خاندانی حالات ان کی پیدائش تعلیم وتربیت اور ملازمت سے ان کی موت تک کے حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ پانچواں جز مختارالدین آرزو کی خدمات کے اجمالی جائزے سے متعلق ہے۔ جس کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی تصنیفات وتالیفات کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے، اشاریہ اور مقالات کو الگ جگہ دی گئی ہے۔ ان کے ہم عصروں پر مضامین کو الگ رکھا گیا ہے، شخصیات مستشرقین، تذکرہ علماء وصوفیہ، تذکرہ شعرا، ادبا ومشاہیر، غالبیات، تذکرے، عربی ادب، کتب خانے تعارف مخطوطات ان سب کا الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا باب ''مختارالدین آرزو کا تحقیقی فن'' ہے۔ اس کو بھی تین حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ اس میں مختارالدین آرزو کے طرز تحقیق سے بحث کی گئی ہے اور ان معاصرین کا جائزہ لیتے ہوئے فن تحقیق میں ان کے مقام ومرتبہ کی تعین کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

اس مقالہ کی تیاری میں جن حضرات کا بھر پور تعاون رہا ان میں استاد محترم پروفیسر ابن کنول صاحب، جنہوں نے مشفقانہ اور مربیانہ معاونت کی اور ہر گام پر شفقت اور محبت کے ساتھ مفید مشوروں سے نوازتے رہے میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں اس کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ کا بھی شکر گزار ہوں جن کے سایہ میں یہ مقالہ انتہا کو پہچا۔

یہ انتہائی احسان فراموشی ہوگی کہ میں اس وقت مادر علمی ندوۃ العلماء کا ذکر نہ کروں جہاں کی پر فضا ماحول نے علم ادب کا ذوق بخشا اور وہاں کے اساتذہ نے اس راہ میں انگلیاں پکڑ کر چلنا سکھایا۔ اور آج جو کچھ بھی شد بد ہے وہ اسی ادارہ کا مرہون منت ہے۔

میں پروفیسر طارق چھتاری اور ڈاکٹر طارق مختار صاحباب کا بھی بہت بہت ممنون ہوں جنہوں

نے مختارالدین آرزو کے ادبی سرمایہ کی فراہمی میں تعاون فرمایا۔ اس مقالہ کی تیاری میں جن احباب کا تعاون رہاان میں انوارالدین اور محمد مشفق اصلاحی قابل ذکر ہیں ۔جنہوں نے قدم قدم پر مفید مشورے دیئے۔

اس مقالہ کومکمل کرنے میں جن کتب خانوں سے استفادہ کیا گیاان میں کتب خانہ دہلی یونیورسٹی، کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ۔

وماتوفیقی الا باللہ محمد زبیر

شعبۂ اردو

دہلی یونیورسٹی

20/02/2015

بابِ اوّل

تحقیق منظر و پس منظر

(الف) تحقیق کی تعریف اقسام و مقاصد

(ب) تحقیق کی اہمیت و افادیت

(ج) اسلامی طرز تحقیق

(د) جدید سائنٹفک تحقیق

تحقیق کی تعریف اقسام و مقاصد

جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے تو اس کا جائزہ کئی حوالوں سے لیا جاتا رہا ہے۔ یہ تمام حوالے اپنے مخصوص دائرے میں اپنی اپنی جگہ پر ایک منفرد اعتبار اور اہمیت کے حامل ہیں۔ شعر و ادب کو جن حوالوں کے پیمانوں میں ناپا اور پرکھا جاتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تخلیق

۲۔ تنقید

۳۔ تحقیق

۴۔ تدوین

۵۔ ترتیب وغیرہ

شعر وادب کو عالم خیال سے لفظوں کا جامہ پہنانے کا عمل تخلیق کہلاتا ہے۔ اس عمل میں شاعر یا ادیب ایک ایسے تجربہ سے گزرتا ہے جس میں وہ اپنے خیالات، تجربات، مشاہدات اور واردات کو الفاظ کے ذریعے منظر عام پر رکھتا ہے۔ الفاظ کا یہ جامہ عام بول چال سے یہ مختلف نہیں ہوتا ہے بلکہ ذرا اہم اور پہلودار ہوتا ہے اسی لیے ادب کو زندگی کے فنکارانہ اظہار کا نام دیا جاتا ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص صفت میں اپنے خیالات کو پروتا ہے۔ یہ صنف ناول، افسانہ، نظم، غزل، رباعی کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ خیال کو لفظوں میں ڈھالنے کے اس عمل کو تخلیق کہتے ہیں۔

تنقید کسی تخلیقی فن پارے پر اس انداز میں گفتگو کرتا ہے جس سے اس کے محاسن اور معائب واضح

ہو جائیں اور فن پارے کی بلندی اور پستی کی نشاندہی ہو جائے۔ یوں تنقیدی عمل تخلیقی تجربے کے بعد اس کے جائزے کا نام ہے۔

تحقیق جیسا کہ ہم بعد میں دیکھینگے، تخلیقی محرکات سے تخلیقی فن پاروں تک اس زاویہ نظر کا نام ہے جس کے حقائق تلاش کئے جاتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے ہر تخلیقی اور تنقیدی ماخذات کی سچائی تک پہونچنے کے لئے سائنٹفک بنیادوں پر کام کیا جاتا ہے۔

تدوین کا عمل موجودہ تحریروں، فن پاروں کو سائنٹفک حوالوں سے جمع کرنے کا نام ہے۔ یہ بھی اپنے انداز میں تحقیق سے ملتا جلتا ہے اس کی بھی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

ترتیب کا عمل منتخبات اور انتخابات کے حوالے سے ہے۔ اس میں کسی خاص موضوع، زمانے یا گروہ کے حوالے سے تخلیق شدہ چیزوں کو جمع کیا جاتا ہے اور انہیں ایک خاص انداز میں مرتب کیا جاتا ہے۔

شعر وادب کے متعلق تمام امور وسائل الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے مشترکہ ہوئے ہیں۔ عام طور پر بعض ادبی مسائل کی تفہیم کے لئے انہیں تجزیاتی مطالعات میں الگ الگ کر کے دیکھا جاتا ہے ورنہ اگر ایک خاص حوالے سے دیکھا جائے تو یہ تمام سلسلے بڑی نمایاں حد تک اشتراک کے مظہر ہیں۔

تذکرہ نگاری کا عمل کم وبیش ان تمام ادبی رویوں کا احاطہ کرتا ہے، اس میں تخلیقی ادب، تنقید، تحقیق اور تدوینی ادب تک کے رجحانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد جب ہم اپنے موضوع اصلی کی طرف آتے ہیں تو شعر وادب کے تجزیاتی مطالعے میں تحقیق ایک منفرد اور نمایاں اور منفرد طریقے سے ہمارے سامنے آتی ہے جس کی اہمیت وافادیت کا کوئی بھی صاحبِ بصیرت انکار نہیں کر سکتا۔

ہر انسان اپنی بساط کے مطابق ہمہ وقت غور وفکر کیا کرتا ہے۔ زندگی کے عام مسائل سے متعلق اور جن مسائل سے اسے دلچسپی ہوتی ہے ان سے متعلق غور وفکر کیا کرتا ہے۔ فطرتاً تغیر پسند واقع ہوا ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو انسان کے دماغ میں نئے نئے مسائل پیدا کرتی ہے اور قدیم مسئلوں کے تعلق سے شکوک شبہات پیدا کرتی ہے۔ ان پیدا ہونے والے مسئلوں کو حل کرنا اور شبہات کو دور کرنے کی کاوشوں اور ساعی ہی

سے تحقیق کا آغاز ہوتا ہے۔

تحقیق کیا ہے: لفظ تحقیق عربی زبان کا مصدر ہے جس کا مادہ حقق، تَحۡقِیقاً ہے۔ جو باطل کی ضد ہے۔ حق کا مطلب ثابت کرنا، ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اس کی جمع حقوق اور حقائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔"**ولا تلبسوا الحق بالباطل**" (سورۃ البقرہ، آیت نمبر۴۲) یعنی باطل کو حق کے ساتھ نہ ملاؤ۔

تحقیق باب تفعیل سے ہے۔ باب تفعیل کی متعدد خصوصیات ہیں ان میں سے ایک معنیٰ میں تکثیر ہے یعنی معنی میں زیادتی پیدا کرنا ہے۔ دوسری خصوصیت سلب وازالہ ہے یعنی مفعول سے مادی معنی کو زائل کرنا ہے جیسے قشرت الفاکہ میں پھل سے چھلکے کو الگ کیا۔ پہلی خصوصیت کے مطابق خوب خوب چھان بین کرنا، تلاش وجستجو میں انہماک کا بڑھ جانا اور دوسری خصوصیت کے مطابق فن پارے کو رطب و یابس سے پاک کرنا ہے اور منظر عام پر اصل مغز کو رکھنا ہے۔

مشہور عربی لغت "**لسان العرب**" کے مولف ابن منظور الافریقی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''حق باطل کی ضد ہے اور اس کی جمع حقوق آتی ہے، ابو اسحاق فرماتے ہیں کہ حق سے مراد نبی اکرمؐ کی بات ہے جو حق اور اس کی معنی ثابت ہوتا ہے اور حق بات یقینی امر ہی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿**بل نقذف بالحق علی الباطل** یعنی ہم حق کے ذریعہ باطل کو مٹا دیں گے۔''[1]

تاج العروس کے مولف اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> ''**حققت الامر**'' کسی معاملے کی تحقیق کرنا یعنی بات کرنا مراد ہے مکمل یقین ہو جانا اور کسی شے کی حقیقت وہ ہوتی ہے جو یقینی طور پر ثابت ہو، اور اہل لغت کے نزدیک اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوا ہو، اور کسی چیز کی حقیقت اس کا خالص ہونا ہے اور کسی معاملے کی حقیقت سے مراد اس کی یقینی صورتِ حال ہے۔[2]

عربی اردو لغت مصباح اللغات میں اس حوالے سے درج ہے:

''حقق تاکید کرنا، واجب کرنا، حقق القول الظن: تصدیق کرنا، تحقق الخبر ، ثابت ہونا، یقین ہونا، الحقیقت وہومن جماۃ الحقائق یعنی وہ اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کا دفاع اس کے ذمہ لازم ہے۔ حق وہ لفظ ہے جو اپنے موضوع میں مستعمل ہو۔ حقیقت الشئی چیز کا منتہاء اور اور اصل جمع حقائق''۔ ۳؎

فارسی لغت مامہ ''دھخدا'' کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''حقیقت کردن، درست کردن، رسیدگی ووارسی کردن، بدانستن واجب کردن، چپ پر تحقیق بخشیدن، تحقیق کردن درعلوم ادبیات، حکمت و عرفان''۔

یہاں تک تحقیق کی لغوی تعریف سے بحث کی گئی ہے۔ اصطلاح میں تحقیق کی کیا تعریفات و تشریحات کی گئی ہیں، ادباء و محققین نے مختلف پیرایہء بیان استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

''اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں کسی امر واقعہ کے وقوع کے امکان وانکار کی چھان بین مدنظر ہوتی ہے''۔ ۴؎

قاضی عبدالودود کے مطابق:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے''۔ ۵؎

مالک کے رام کے الفاظ میں:

''تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ح ق ق ہے جس کے معنے کھرے کھوٹے کی چھان بین ہے یا بات کی تصدیق کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم وادب میں کھرے کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنیٰ اور مقاصد ہیں''۔ ۶؎

گیان چند جین مختلف تعریفات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے

اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے۔نا معلوم یا کم معلوم کو جاننا یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے ہیں انہی کو کھوجنا جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں ان کے دھند کو دور کر کے انہیں آئینہ کر دینا ہے"۔ ے

عبد الستار دلوی نے یوں تعریف کی ہے:

"تحقیق کسی مسئلے کے قابل اعتبار حل اور صحیح نتائج پر پہونچنے کا عمل ہے جس میں ایک منظّم طریقہ کار، حقائق کی تلاش، تجزیہ اور تفصیل کاری پوشیدہ ہوگئی ہے"۔ ۸

ڈاکٹر تلک سنگھ تحقیق کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

"تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظّم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم اور ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقہ کی توسیع ہوتی ہے"۔ ۹

عربی میں تحقیق کو بحث کہا جاتا ہے، تحقیق کی تعریف عرب باحثین کے یہاں بڑے جامع انداز میں یوں ملتی ہے:

"الاسلوب المنظم فيه جميعالمعلومات وتدوين الملاحظات والنحيل الموضوعى لتلك المعلومات باتباع اساليب ومناهج علميه محددة بقصد التاكد من صحتهااو تعديلهااو اضافة الجديد لها ومن ثم التوصل الى بعض القوانين والنظريات والتنبئو بحوث مثل هذه الظواهر والتحكم فى اسباها، هوالوسيله التى يمكن بوا سطتها الوصول الى حل مشكلة محدودة، اواكتشاف حقائق جديدة عن طريق المعلومات الدقيقة، كما أنّ البحث العلمى هوالطريقة الوحيدة للمعرفةحول العالم، وعبارة البحث العلمى"۱۰۔

سی سی کارفورڈ کا خیال ہے:

"Research may be defined as
matter of studying problems, whose
solutions are to be derived partly or
wholly from facts" (11)

اس کے بعد ہم چند تعریفات تحقیق کی یورپ محققین کی پیش کرتے ہیں۔ رسک (Rusk) کے مطابق:

''تحقیق کیا ہے؟ ایک نقطۂ نظر یا تفتیش کا انداز یا ذہن کا ایک طریقہ کار۔ یہ وہ سوالات اٹھاتی ہیں جو ابھی تک اٹھائے نہ گئے ہوں اور ایک خاص متعین طریق کار کے ساتھ ان کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ صرف نظریہ سازی نہیں بلکہ ایک کوشش ہے۔ حقائق کے استخراج کی اور جب وہ یکجا کر لئے گئے ہوں تو مجتمع شکل میں ان کا سامنا کرنے کی''

اسمتھ (Smith)

''تحقیق، شامل ہے محتاط اور ناقدانہ تلاش و تفتیش اور جانچ پرکھ کو، جو حقائق یا اصولوں کی تلاش میں کی جائے۔ نیز محنت اور تسلسل کے ساتھ ہوئی کھوج کو، جو سچائی کو پا لینے کی تلاش میں کی جائے''۔

گوڈ اور اسکیٹس (Good & Scates):

''تحقیق شامل ہے مسئلے کے تعین میں، قابلِ لحاظ حد تک احتیاط کو مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے بہترین طریقوں کے طے کرنے کو اور اس میں ہمیشہ جدت اور نئے پن کا ایک عنصر ہوتا ہے''۔

پال (Paul)

''تحقیق کیا ہے؟ ایک منظّم و مربوط تلاش، غیر منکشف حقائق کی ایک اداز کار جس کے ذریعہ لوگ مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں کہ انسانی جہل و ناواقفیت کی سرحدیں پیچھے دھکیل دیں''۔

وھٹنے (Whitney)

"تحقیق ایمانداری، جامعیت اور ذہانت کے ساتھ کی جانے والی کھوج ہے
جو حقائق کے لئے اور کسی پیش نظر مسئلے کے حوالے سے ان حقائق کے اثر
انداز ہونے والے نتائج کے لئے کی جاتی ہے۔ کسی تحقیقی کام کے نتائج کو
اس مطالعاتی میدان میں مستند قابل توثیق اضافہ ہونا چاہیے"۔[11]

دراصل تحقیق اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ مسائل کو قابل اعتبار حل تک پہونچایا جائے اور اس میں منصوبہ بندی اور باضابطگی سے معلومات کو ضم کیا جائے اور اس کا تجزیہ کیا جائے اور پھر اس کی توجیہ و تعبیر کی جائے۔

تحقیق کے ذریعہ علم کو دریافت کیا جاتا ہے۔ بے شک تحقیق بے پناہ قوت و توانائی کی حامل یہ ایک سرگرمی ہے جو معاملات کی تصدیق اور تردید اور ان کی تعمیر و تشریح میں کمی بیشی کی نشاندہی کرتی ہے اور انسانی ترقی و کامرانی کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ حقیقت کی تلاش کا جذبہ اور حقائق کی بازیافت تحقیق میں ضروری ہے جو مختلف ذرائع سے حاصل کئے گئے اعداد و شمار کی چھان بین کے بعد نئی دریافت پیش کرتی ہے۔ درحقیقت خود لفظ 'تحقیق' تنوع اور وسعت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔

تحقیق کے تعلق سے یہ تمام تعریفات محققین کے تصور کے مختلف پہلوؤں سے مختلف نقطہ ہائے نظر سے واضح کرتی ہے۔ ان میں سائنسی، سماجی، تعلیمی، ادبی نیز تحقیق کے قدیم وجدید تصورات کو لغوی و اصطلاحی طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لفظ تحقیق یوں معنوی حیثیت سے بھی بڑا ذرخیز ہے اور اپنے اندر تحقیق کے اصطلاحی مفہوم کو سمیٹتا نظر آتا ہے لیکن یہ اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ بادی النظر میں ایک لفظ ہے لیکن اپنے اندر بے پناہ روشنی اور قوت و توانائی رکھتا ہے۔ تحقیق کی تمام علوم میں یکساں اہمیت وضرورت ہے اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں بحیثیت مجموعی تحقیق کو ہم علم میں اضافہ کی خاطر موجود لیکن پوشیدہ حقائق کی فنکارانہ تلاش کا نام دے سکتے ہیں۔

تحقیق کی قسمیں

ابتداء میں علوم کی دنیا محدود تھی تو تحقیق بھی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن جیسے جیسے علوم کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور نئے نئے علوم متعارف ہوتے گئے۔ جو تحقیق ہی کے مرہون منت تھے۔ اسی وقت سے تحقیق کی مختلف قسمیں بھی وجود میں آئیں۔ چنانچہ اب تحقیق کی بے شمار قسمیں جن کو ماہرین نے تحقیق کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر سے مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے، اس سلسلے میں بعض ماہرین نے تحقیق کے مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے جبکہ تحقیق کے طریق کار کو بعض نے حسب نوعیت اس کی تقسیم کی ہے جبکہ کچھ نے موضوعات کو اس مقصد کے لئے پیمانہ بنایا ہے۔ غرض کہ تحقیق کی قسموں سے متعلق ماہرین کا نقطہ نظر یکساں ہے۔

تحقیق یوں تو ایک ایسا مکمل تجزیاتی عمل ہے جسے خانوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر اس عمل کی مختلف کیفیات کو سمجھنے کے لیے تقسیم کا عمل ضروری بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں سمجھنا چاہیے کہ کوئی تحقیقی کام لازمی طور پر ان میں سے کسی ایک ہی خانہ میں فٹ ہوسکتا ہے، اس کے بالکل برعکس ایک تحقیقی کام ان میں کئی اقسام سے بیک وقت متعلق ہوسکتا ہے۔ ان کی نوعیت ایک دوسرے سے مربوط ایسی اکائیوں سے ہے جن سے باہم مل کر ایک کل کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ ان اجزاء کی تفہیم ہی سے تحقیق کی مکمل نوعیت کو سمجھا اور برتا جاتا ہے۔

اگر تحقیق کی تقسیم مقاصد کے اعتبار سے کی جائے تو اس سلسلے میں ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش نے مندرجہ ذیل تقسیم کی ہے:

(۱) بنیادی تحقیق: بنیادی تحقیق میں صرف نظری مباحث شامل ہیں۔عمومی اصول وضع کرنا،تعبیر نو کرنا یا نظریے وضع کرنا اس کا بڑا مقصد ہوتا ہے۔اس کو فلسفیانہ بھی کہتے ہیں۔اس میں عموماً محرکات کو جانچنا اور صداقت کو پرکھنا شامل ہے۔

(۲) اطلاقی تحقیق: اس میں کسی مسئلے یا شے کے حصول کے طریقے کی افادیت معلوم کی جاتی ہے۔سائنس وٹکنالوجی سے لیکر سماجی صورت حال وضروریات میں اس قسم کی ضرورت پڑتی ہے۔اس میں تجرباتی طریق کار بھی شامل ہیں۔

(۳) اقدامی تحقیق: اقدامی تحقیق فوری اور محدود نوعیت کے مسائل میں زیادہ استعمال ہوتی ہے۔اس میں مسئلے کے حل اور تدارک کے اقدامات تجویز کئے جاتے ہیں۔اس قسم کی تحقیق سے نظریے یا اصول وضع نہیں ہوتے ہیں۔اسے عام طور پر تحقیق میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ادبی تحقیق میں اس کی تھوڑی بہت ضرورت ہوتی ہے۔[۱۲]

گیان چند جین تقسیم تحقیق کے باب میں مطالعہ ومباحث کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ:

''خاص اردو تحقیق کی تقسیم کرنا چاہیں تو بڑے بڑے زمرے بنانے ہونگے جو ایک طرح سے دیکھئے تو موضوعات گھٹے ہونگے''۔

ہم ذیل کے زمرے کر سکتے ہیں:

(۱) سوانحی وتاریخی تحقیق: اس میں کسی ادب یا صنف کے اہم تخلیق کاروں کی تصانیف پر تحقیقی بحث کی جاتی ہے جس کا انداز بہت کچھ تاریخ جیسا ہوتا ہے۔

(۲) تنقیدی تحقیق: یونی ورسٹیوں کے قوانین تحقیق میں جو ایک شق ہوتی ہے، پرانے یا معلوم حقائق کی نئی تشریح اس کے سایہء دامن میں تنقید تحقیق میں دراندازہو جاتی ہے۔ یونیورسٹیوں کی سندی تحقیق کے لیے ایسے موضوعات لیے جاتے ہیں جو محض اقداری اور فکری ہوتے ہیں۔ان کا

تحقیق کہلانا مشتبہ ہے۔ بہر حال اس گتھی پر چند سطور بعد غور کیا جائیگا۔

(۳) تدوین متن

(۴) حوالہ جاتی تحقیق: مثلاً وضاحتی فہرستیں، اشارے، انسائیکلو پیڈیا وغیرہ تیار کرنا۔

(۵) بین العلومی تحقیق (Inter-Disclinery): اس میں ادب اور کسی دوسرے مضمون مثلاً لسانیات، تاریخ، سیاسیات، سماجیات، معاشیات وغیرہ کے مشترکہ موضوعات پر تحقیق کی جاتی ہے۔[۱۳]

جب کہ شارب رودولوی کی تقسیم باعتبار موضوع اس طرح ہیں:

(۱) صحت متن کی تحقیق و تدوین

(۲) مصنف یا شاعر کی سوانح اور حالات زندگی کی تحقیق

(۳) لسانی حقیقتوں کی کھوج جس میں قدیم زبان محاورات عروض اور رسم الخط وغیرہ شامل ہوں۔

(۴) معلوم شدہ حقائق یا اصولوں کی تجدید کرنا اور نئے انداز سے پیش کرنا۔[۱۴]

اگر تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو تحقیق کی تمام تر اقسام کو متعلقہ حوالوں سے طے کیا ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تحقیق کی کونسی تقسیم درست ہے۔ بہر کیف اس بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق علم کی ایسی ناگزیر سرگرمی ہے۔ جو وسعت اور تنوع کی حامل ہے۔ اس کے مختلف اقسام نہ صرف اس دائرہ کار کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ تحقیق کے اعتبار کو بھی ترقی ملتی ہے۔ ہر علم اپنے لیے ایک الگ طرز تحقیق کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس کا انحصار محقق اور اس کی صلاحیت پر بھی ہوتا ہے لہ وہ اپنی تحقیق میں کون سی قسم استعمال کریگا۔ تحقیق کو مختلف خانوں میں بانٹنے کا یہ عمل دراصل تحقیق کی وسعت اور ہمہ گیری کو سمیٹنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اور ضروری نہیں کہ ہر قسم کی تحقیق ان میں سے ایک خانے میں فٹ ہو۔ اگر ادبی تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان سے اکثر قسموں پر تحقیق کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق کے مقاصد

تحقیق پورے انسانی معاشرے کی ایک مشترکہ کوشش کا نام ہے۔جس کے فوائد کا دائرہ انتہائی وسیع ہے جو کسی ملکی یا معاشرتی حصار میں محدود نہیں رہ سکتا اور تحقیق نظریات اور مآخذ تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ تحقیق سے تمام تر علوم کا حصول آسان اور ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ علم کے حصول کا منظّم ذریعہ ہے جس سے کارگردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔حقیقت سے آگاہی، توہمات سے چھٹکارا، تعصّبات سے بچاؤ اور اشیاء کی اصل تک رسائی تحقیق کے اولین مقاصد ہیں۔ترقی کا عمل تحقیق ہی کی بدولت اپنی معراج تک پہونچا ہے اور اسی کے سہارے ہر کام پر آگے کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔

تحقیق کے مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں، مثلاً نظریات میں ارتقاء کیفیت اور اس کی پرداخت، حقائق کا جمع کرے اس کو رطب و یابس سے پاک کرنا، بکثرت سروے اور تاریخی حقائق کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچنا یا پھر کسی مسئلہ کو فوری طور سمجھنا اور حل پیش کرنا، یہ تمام چیزیں تحقیق کے مقاصد سے متعلق ہو سکتے ہیں۔

تحقیق کے بے شمار ضمنی اور متنوع مقاصد ہو سکتے ہیں کیوں کہ مقاصد میں تنوع کے پیش نظر ہی محققین نے تحقیق کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

تحقیق کے کام عموماً حیات اور ماحول انسانی کو زیادہ سے زیادہ صحیح طور پر سمجھنے کے لیے شروع کیے جاتے ہیں ان میں سے کچھ کام اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان کے نتائج کی وسیع تر بنیادوں پر تقسیم کی

جاسکتی ہے تا کہ نئے نظریات کی تشکیل ہو سکے۔ تمام نظریات اپنے اندر ایک نظام منطق پنہاں رکھتے ہیں۔ جن کی مدد سے کچھ مظاہر توضیح اور تفہیم ممکن ہو جاتی ہے۔ پھر یہ توضیح اور تفہیم کچھ مسائل کے حل کا سبب بنتی ہے اور معاشرے کے لیے ترقی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصراً ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تحقیق کے وسیع مقاصد، حقائق کی رسائی، انسانیت کی خدمت، نئے نظریات کی تشکیل وغیرہ ہیں۔ لیکن محدود پیمانے پر تحقیق کے اپنے متعلقہ مقاصد بھی ہوتے ہیں جو ان سوالات اور مفروضوں سے تشکیل پاتے ہیں جن کے متعلقہ شعبے میں وہ تحقیق کے فرض کو انجام دیتے ہیں۔

تحقیق اہمیت وافادیت

اردو میں تحقیق کا آغاز مشہور فرانسیسی محقق گارساں دتاسی کی محققانہ مساعی کی مرہون منت ہے۔ ۱۸۴۶ میں الواس اسپرنگر کہ شاہان اودھ کے کتب خانہ کی فہرست مرتب کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔اور لگ بھگ پچاس سال تک اس کام میں لگے رہے۔ان کا کام گوکہ فرانسیسی زبان میں ہے لیکن اردو سے متعلق ہے جوکہ اب ترجمہ ہو چکا ہے۔

اردو میں سب سے باقاعدگی کے ساتھ تحقیق کرنے والوں میں سرسید احمد خان پہلے محقق ہیں اور انھیں نے سب سے پہلے اس کام کی طرف توجہ دی،اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک لوگوں کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں تھا۔اسی زمانے میں لوگوں کا ملی وقومی شعور بیدار ہوا اور زندگی کو قوم وملک کے لیے کارآمد بنانے کی فکر ہوئی،تو زبان وادب سے دلچسپی بڑھی اس کے نتیجے میں چیزوں کی تحقیق وجستجو کا شوق پیدا ہوا۔سرسید اوران کے رفقا میں کسی نہ کسی حد تک تحقیق وجستجو کا یہ شوق پایا جاتا ہے۔خود ان کے اندر بھی یہ شوق بدرجہ اتم ملتا ہے۔آثارالصنادید سرسید کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔مولانا حالی نے حیات جاوید میں سرسید احمد خان کے بارے میں لکھا ہے کہ سرسید احمد علیہ الرحمہ اپنی کتاب آثارالصنادید کی تالیف وتکمیل کی دھن میں دو بلیوں اور ایک جھنکے کی مدد سے قطب مینار پر گھنٹوں لٹکے رہ کر کتبوں کا چربہ اتارتے اور پھر نیچے اتر کر باقاعدہ قلم بند کرتے تھے۔لوگ سرسید کی حالت زار اور لگن دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔اگر تحقیق کی راہ میں اس قسم کی لگن اور جاں فشانی سے کام لیا جائے تو تحقیق کا معیار کتنا بلند سے بلند ترین ہوگا۔

جس طرح تحقیق کی تعریف کی گئی کہ کسی شئی کی حقیقت کا پتہ لگانا تحقیق ہے خواہ وہ مرورایام کے دھندلکوں میں گم حقائق کی بازیافت ہو یا پھر موجود فن پاروں کو ازسرنو مرتب کرنا ہو۔ بہرحال یہ دونوں عمل کسی طرح آسان نہیں معلوم ہوتے یہ عمل بڑے ہی جاں فشانی اور صبر آزمائی کے ہیں ۔عجلت پسند طبیعتیں، راہ تحقیقی میں آگے بڑھ سکتی ہیں نا ہی کسی نتیجہ پر پہونچ سکتی ہیں۔ کیوں کہ حقائق کو تلاش کرنا بہت دشوار اور وقت طلب کام ہے۔ تحقیق کا عمل محقق سے وقت، جگرگاوی اور جانفشانی کا متقاضی ہے۔ شارب ردولوی کی زبان میں:

''اس دشواری اور کام کی اہمیت پر نشانہ رکھنے والے اکثر غلطی کر جاتے ہیں اور ان کے نتائج سے وہی حشر ہوتا ہے جو خضر کی رہبری میں سکندر کا ہوا''۔ [۱۵]

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے جس میں ہمہ وقت جدید اشیاء کا علم ہوتا رہتا ہے، کیونکہ معلومات کے سرچشموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بہرکیف اس بات کی بھی تحدید نہیں کی جاسکتی کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں پنہاں ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ یکے بعد دیگرے حجاب اٹھتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے تحقیق میں اصل اشیاء کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر منحصر ہوتا ہے۔ تحقیق انسانی ذہن کے سفر ارتقاء کی ایک اہم دستاویز بھی ہوتی ہے۔ صدیوں کے انسانوں کی وہ آپ بیتی ہے جو فن کے پردوں میں کہی گئی ہوتی ہے۔ تحقیق کے ذریعہ قاری کی دلچسپی کا مرکز بنتی ہے۔ جس میں نہ صرف حسن اور عشق کی داستاں اور نہ فطرت کی مدح سرائی ہوتی ہے بلکہ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی و تعلیمی معلومات بھی محفوظ ہوتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی فنکار یا مصنف محض خدا کی پیداوار نہیں ہوتا ہے اور اس کی فنی کاوشوں کو میں صرف اس کے خیالات اور احساسات نہیں ہوتے بلکہ ہم کو اس کے ذریعہ اس عہد سے متعلق رکھنے والے لوگوں کی فکر، طرز رہائش، معاشی حالات، معاشرتی معاملات یہ تمام چیزیں مبہم اور غیر شعوری طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''کوئی بھی ادبی کارنامہ کتنا ہی اندی، آفاقی اور عالمگیر کیوں نہ ہو اپنے زمانے اور مقام تصنیف سے رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ ہر ادبی کارنامے میں اپنے

عہد کی آواز گونجتی ہے۔ اور یہی آواز ادبی محقق اور نقاد کے لیے اہم ہے کیونکہ نہ صرف اس میں روح عنصر ہے بلکہ اس میں ماقبل کی آوازیں بھی شامل ہیں اور مابعد کی آوازوں میں اس کو پہچانا جاسکتا ہے''۔[۱۶]

ڈاکٹر خلیق انجم آگے لکھتے ہیں:

''ایک مہذب سماج خود کو جاننے اور سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اپنی اس کوشش میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس کے پاس نوع انسانی اور خاص طور پر اپنے آباؤاجداد کے فکری جذبات اور ذہنی کارناموں کی مکمل تاریخ نہ ہو۔ اس تاریخ کے مرتب کرنے میں ادبی کارناموں کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ادبی تاریخ لکھنے میں حقائق کی کھوج اور ان کی تشریح وتعبیر کا کام نقاد کا ہوتا ہے۔ اس تقسیم کے کچھ بندھے ٹکے اصول وقواعد نہیں ہیں کیونکہ ہر محقق کے لیے اچھا خاصا نقاد اور ہر نقاد کے لیے اچھا خاصا محقق ہونا ضروری ہے''۔[۱۷]

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ تحقیق کا کام بے کار ہے اور اسے گورکنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ میر کی جائے ولادت کیا ہے اور وفات کیا ہے۔ غالب کا تعلق کہاں سے تھا، وہ دہلی میں پیدا ہوئے یا اکبرآباد میں۔ میر کے والد صوفی منش ہونے کے بجائے آگرہ شاہی گوشہ خانے کے داروغہ ہوتے تو اس سے میر کی شاعری پر کچھ اثر نہ پڑتا۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے والد ان کی نوجوانی میں فوت ہو گئے تھے تو اس تحقیق سے سودا کی شاعری اور ان کے فن سے کیا واسطہ ہے۔ مگر یہ تمام چیزیں انسان کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ بہرحال اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ سوانحی اور تاریخی معلومات سے شعراء اور ادباء کی تخلیقات کی بہترین طریقہ پر سمجھنے کے راستے کھلتے ہیں اور ذہنوں میں پیدا ہونے والے شبہات دور ہوتے ہیں اور اس تحقیق کے ذریعہ وہ راہیں ہموار ہوتی ہیں جن سے شعراء وادباء کے زمانے اور اس وقت کی طرز رہائش اور معاشرت کا صحیح اندازا کر کے ان افکار کو پرکھا جاتا ہے۔ تحقیق کو حقیر اور کمزور شے تصور کرنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"تحقیق ایک قسم کی منشی گیری ہے۔اس کے لیے وہ خصوصیات کافی ہیں جو کسی معمولی ذہن کے انسان میں ہوں اسے جدت طبع ،قوت اختراع کی ضرورت نہیں محض ایک کام سے لگ جانا ہے اور بندھے ٹکے طریقے پر ایک لکیر پر چلتے رہنا ہے۔ پھر اس میں جس قسم کی محنت درکار ہوتی ہے۔اس کو اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ تخیل رکھنے والا انسان کبھی بھی نہ قبول کرے گا۔تحقیق کے لیے مغز سگاں کی ضرورت ہے۔ جب کہ تنقید کے لیے مغز شایاں درکار ہے۔تحقیق کرنے والے کی حیثیت ایک مزدور کی سی ہوتی ہے جو اینٹیں اٹھا کر لاتا ہے اور ان کو جوڑ کر دیوار بناتا ہے"۔۱۸

اس کا جواب دیتے ہوئے شارب رودولوی یوں لکھتے ہیں:

"یہ بات صحیح نہیں ہے۔اس لیے اگر تحقیق اس کی اہمیت کے احساس اور پورے لگن سے کی جائے تو اس کے بڑے معنیٰ خیز نتائج برآمد ہو سکتے ہیں گو کہ اکثر محققین پوری طرح نتائج کی طرف توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ان کی تحقیق صرف اعداد و شمار کا مجموعہ ہو کر رہ جاتی ہے مگر صرف اس بنا پر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی یہ منشی گیری اور مزدوری کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔اس قسم کی باتوں سے ادبی تحقیق کو کافی نقصان پہونچا اور اس کو تنقید کی ضد تصور کیا جانے لگا۔ان انتہا پسند رایوں کی بنا پر تنقید و تحقیق ایک دوسرے سے دور جا پڑیں ایک محقق نے تحقیق کو ہی سب کچھ سمجھ لیا اور ایک نقاد سے تنقید کو گار مغز شاباں سمجھ کر تحقیق کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے دامن چھڑا لیا۔دراصل تنقید و تحقیق کو ہم معنی ایک دوسرے کے مترادف سمجھنا یا ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق سمجھنا غلط ہے۔اس لیے بغیر تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کے تحقیق مکمل نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی تحقیق بغیر تنقیدی بصیرت کے ہے تو معاشیات اور مالیات کے اعداد و شمار میں ہوگی جن سے معنی خیز نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی"۔۱۹

تحقیق کسی قسم کی ہو،سماجی ،ادبی ،اس کی بنیادیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں،۔ کیونکہ کسی بھی واقعہ کو

پرکھنے لے لیے داخلی اور خارجی شہادتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز ان شہادتوں کی معروضی انداز میں تصدیق اور چھان پھٹک کے بعد ہی اس واقعہ کی قطعیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ یہ تحقیق اسی قسم کے پیمانے استعمال کرتی ہے۔

تحقیق جس طرح سماجی اور معاشرتی مسائل کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے اسی طرح ادب، آرٹ اور انسان کے داخلی زندگی کے مسائل پر بھی غور وفکر کرتی ہے اور اس صورت اور صداقت پر غور کرتی ہے اور تصدیق کرتی ہے۔

تحقیق کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ ہم ہر اس بیان اور فن پارے پر یقین نہیں کر سکتے جو صدیوں پہلے کا ہے اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ تحقیق عقائد ونظریات پر کاربند رہنے یا ان کو ترک کر دینے کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ ادیب یا شاعر اور نقاد کے کارناموں پر فیصلہ صادر کرتی ہے۔ ان کا ادبی میدان میں قد اور حیثیت کا تعین کرنے میں مدد کرتی ہے اور ادب کے اندر وقت کے مطابق تبدیلیاں تحقیق کی بدولت رونما ہوتی ہیں۔ ہر عہد کی شاعری اور ادب کے رجحاناتِ رفتہ کی قدر و قیمت کا اندازہ تحقیق ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

ابتداء میں محققین کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن جب معاشرتی علوم وجود میں آئے تو یہ محسوس کیا جانے لگا کہ سائنسی طریقے کے استعمال سے اس شعبے میں بھی نتائج کا حصول ممکن ہے۔ لہٰذا ادب کو بھی تحقیق کے دائرے میں جگہ ملی۔ المیہ بہت بعد تک اس پر اعتراض ہوتے رہے، معترضین کے خیالات کا لب لباب یہ ہے جیسا کہ میں نے ابتداء میں ذکر کیا ہے، کہ ادیب وشاعر کی زندگی کی تفاصیل، اس کے مسودات کی چھان بین، نقطے اور شوشے کتنی غیر ضروری باتیں ہیں۔ کونکہ اس قسم کی تحقیق کوئی قانونی دستاویز نہیں ہوتے۔ اس کام کا معلومات یا سائنٹفک اطلاعات کی بے کم وکاش ترسیل ہیں۔ محض تاثر اور کیفیت کی بار آفرینی ہے اسی لیے ان لوگوں کے نزدیک تحقیق کا علم غیر ضروری تفاصیل کی تلاش قرار پایا ہے۔

لیکن بہت جلد معترضین کے اعتراض کم ہوئے اور اس قسم کی روش کو ترک کیا گیا اور اب تحقیق ادب کے حوالے سے ایک جز ولاینفک کا درجہ رکھتی ہے۔ تحقیق ہی ادب کی اہمیت، صداقت واضح کرنے

کے ساتھ ساتھ بنیادی کام بھی کرتی ہے اور معیار متعین کرتی ہے۔اور تحقیق ہی ادبی عقائد و نظریات کے ماٰخذ تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہے۔اور ادب کی معیار بندی اور ترقی میں اپنا بھرپور کردار نبھاتی ہے۔یہی ادب میں گمشدہ سرمایہ دریافت کرتی ہے۔تاریخی تسلسل کی بحالی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اور اس طرح ادب کو اس کے ارتقاء کی صورت میں مربوط کرتی ہے۔

اسلامی طرز تحقیق

اسلام میں تحقیق کے اصول

اسلامی اصول تحقیق کا اطلاق ان قواعد وضوابط پر مبنی ہے جنہیں دراصل مسلمانوں نے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانچ پرکھ کے لیے وضع کیا اور ان کے ذریعہ احادیث کو غیر احادیث سے الگ کر کے رکھ دیا۔ یہ اصول دو قسم کے ہیں۔ ایک روایتی دوسرے درایتی اس سے قبل کہ ان اسلامی اصولوں اور طرز تحقیق کو بیان کیا جائے مناسب ہوگا کہ تمہیداً بالاختصار حدیث نبوی ﷺ کی اہمیت کو بھی بیان کیا جائے کیوں کہ ایک پہلو ہے جس کے پیش نظر امت اسلامیہ کے علماء نے روایتی ودرایتی اصول وضع کیے ہیں اور انہیں ہر طرح کے علم سے متعلق مواد کی جانچ پرکھ کے لیے استعمال کیا ہے۔

احادیث کی اہمیت کے حوالے سے اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اسلام کے اعتقادی وعلمی احکام کا پہلا اساسی سرچشمہ قرآن اور دوسرا سنت نبویؐ ہے۔ اول الذکر احکام کا اجمال ہے جبکہ دوسرا ان کی تفصیل بلکہ تشریح وتوضیح ہے۔ گویا دونوں لازم ملزوم ہیں۔ ان دونوں کے اس آپسی ربط وتعلق کو علامہ سید سلیمان ندوی نے یوں بیان کیا ہے:

> (ا) علم القران اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتی رہتی ہے۔ آیات کا شان نزول اور ان کی تفسیر، احکام القران کی تشریح وتعین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔

(۲) اس طرح حامل قرآن کی سیرت، حیات طیبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات مبارکہ، اقوال واعمال، سنن مستحبات اوراحکام و ارشادات اسی علم کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔

(۳) اسی طرح خود اسلام کی تاریخ، صحابہ کرامؓ کے احوال اوران کے اعمال واقوال اوراجتہادات واستنباطات کا خزانہ بھی اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔[۲۰]

احادیث نبوی ﷺ کی ضرورت، اہمیت وافادیت اور عظمت ورفقت کے پیش نظر ابتداء اسلام سے ہی مسلمانوں نے انہیں پوری کاوش واخلاص اور عقیدت مندی سے سمجھنے اور انہیں زندگیوں میں علمی جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ محفوظ کرنے کا اہتمام بھی کیا اور ایسی خدمات سرانجام دیں جن کی نظیر دنیا کے تمام مذہب پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مولانا محمد علی صدیقی نے حافظ ابن جزم کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''اقوام عالم میں کسی کو بھی اسلام سے پہلے یہ توفیق میسر نہیں ہوئی کہ وہ اپنے پیغمبر کی باتیں صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے۔ یہ شرف صرف ملت اسلامیہ کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کے ایک ایک کلمہ کو صحت و اتصال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ آج روئے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے۔ اس کے برعکس اسلام نے اپنے رسولؐ کی سیرت کے ایک ایک گوشے کو پوری صحت و اتصال کے ساتھ محفوظ کیا ہے''۔[۲۱]

مسلمانوں کا یہ بے مثال کارنامہ فقط تحفظ وتدوین تک ہی محدود نہ تھا بلکہ احادیث رسولؐ کو اسلام کے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ کرنا، صحیح اور سقیم حدیثوں میں امتیاز رکھتے ہوئے پوری صحت واتصال کے ساتھ نسل درنسل انہیں منتقل کرنا بھی تھا تاکہ تدوین کردہ ذخیرۂ احادیث، شکوک وشبہات سے اس قدر بلند وبالا ہو کر ہر فرد، خواہ اپنا ہو یا غیر دیکھتے ہی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے کہ ذخیرہ ہر قسم کے ملاوٹوں سے مبرّا ہے اور حفاظت ودیانت کے اس بندوبست سے بڑھ کر کچھ اور ممکن نہیں۔

ان بلند وبالا مقاصد کی خاطر مسلمانوں نے ابتدائی طور پر روایت ودرایت کی صورت میں بے

مثال تحقیقی اصول وضع کیئے اور استعمال بھی کیا اور آئندہ آنے والوں کے لیے انتہائی مظبوط بنیادیں فراہم کیں جن پر قائم ہونے والی عالیشان عمارات آج دنیا کے سامنے بڑی بڑی ضخیم تدوین شدہ احادیث کی شکل میں موجود ہیں، انہیں اصولوں کے متعلق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان لکھتے ہیں:

''قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے علم حدیث کے بارے میں روایت اور درایت کے جو اصول منضبط کیے ہیں ان پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ روایت کے بارے میں ان کے حزم واحتیاط کا یہ عالم تھا کہ سیر مغازی تو بہت بڑی چیز ہے۔ وہ عام خلفاء اور سلاطین کے حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے تھے جب تک کہ ان کے پاس آخری راوی سے لیکر چشم گواہ تک تسلسل کے ساتھ روایت موجود نہ ہو، یعنی جو واقعہ لیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک واقعہ رہا ہو اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہیں تھا تو اس واقعہ تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ ان کے منشا کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس تھے؟ عالم تھے یا جاہل؟ یہ تمام جزئی باتوں کا پتہ لگانا بے حد دشوار تھا لیکن ہزاروں محدثین نے اس کام کے لیے اپنی عمریں وقف کر دیں اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا جس کی بدولت کم از کم ایک لاکھ شخصیتوں کے صحیح حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، غفلت، ثقات کی مخالفت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام ہے تو محدثین نے بلا تکلف اس کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود قرار دیا۔ مرفوع، موقوف، قولی وفعلی وتقریری نیز آحاد ومتواتر مشہور دعزیز وغریب اسی طرح صحیح حسن اور مقبول ومردود وغیرہ کتنی اقسام احادیث ہیں۔ جن کی تقسیم خود اپنی جگہ اس امر کی شاہد ہیں کہ علمائے اسلام کی نظر کس قدر گہری تھی اور ان کا معیار تحقیق کس قدر بلند تھا''۔

روایت کے بعد درایت کا نمبر آتا ہے۔ یعنی حدیث کے تمام راوی ابتداء سے آخر تک ثقہ اور

مستند تو ضرور ہیں لیکن ہوسکتا ہے عقلاً اس روایت میں کچھ خامی موجود ہو چنانچہ ایسی روایت بھی غیر معتبر قرار دی جاتی ہے۔ درایت یعنی عقلی حیثیت سے واقعات کو جانچنے کے اصول اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ راویوں کی صداقت اور دیانت کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی منافقین کے کذب و افترا کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔ لہٰذا محدثین نے بے خوف ہو کر بڑے سے بڑے راوی اور روایت کو پرکھا اور احتیاط کے معاملہ میں کسی رو رعایت کو جگہ نہیں دی۔ مثال کے طور پر امام وکیع ایک بڑے محدث گزرے ہیں ان کے والد سرکاری خزانچی تھے۔ اس بناء پر وہ خود ان سے روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملاتے یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہ کرتے۔ یہ ہے احتیاط اور حق پسندی کی حد۔ مسعودی بھی ایک محدث گزرے ہیں ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انہوں نے ان کے حافظہ سے فوراً بے اعتباری ظاہر کی۔ یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار کا معاوضہ صرف اس لیے دینا چاہا کہ وہ ایک شخص کو معتبر اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں۔ یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں۔ انہوں نے ان دینار کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ اس حق کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ ان محتاط اور حیرت انگیز دیانتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور دیانت کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ اس سے بڑھ کر حیرت میں ڈالنے والا واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کچا پکا، صحیح اور غلط، قوی اور ضعیف، قابل قبول اور نا قابل قبول کا انبار آج بھی دنیا میں موجود ہے اور آج بھی ان ہی اصولوں کے مطابق ہر واقعہ کی چھان پھٹک کی جانی چاہیے اور کھرے کھوٹے کو الگ الگ کر کے دنیا کے سامنے رکھا جانا چاہیے۔ سورہ حجرات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یایھاالذین آمنو اِن جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالة فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین﴾ ۲۲؎

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (بدکردار، غیر ذمہ دار شخص) کوئی اہم خبر لیکر آئے تو اس کی خوب تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بے عملی میں ضرر پہنچاؤ پھر تم اپنے کئے پر پچھتانے لگو''۔

اس آیت میں تحقیق کرنا، بات کھولنا، سچائی تک پہنچنا، پرکھنا جانچنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہالت اور نادانی سے بچنے کے لیے حقیقت کی تلاش فرض ہے تا کہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے اور مضرات بھی سامنے نہ آئیں یعنی اگر کوئی غیر ذمہ دار غیر معتبر شخص کسی اہم بات کی خبر دے تو اس پر فوراً یقین نہیں کرنا چاہیے بلکہ قبولیت سے پہلے تحمل مزاجی کے ساتھ اس بات کی اچھی طرح سے تحقیق کرنا چاہیے یہاں تک اس بات کی سچائی اور صحیح ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تحقیق کے ذریعہ حقیقت کی تلاش ضروری ہے۔ اگر تحقیق کا اہتمام نہ ہوگا اور صرف زبانی باتوں پر یقین کیا جائیگا تو ظاہر ہے کہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑیگا۔ دوسری جگہ سورہ توبہ میں ارشاد باری ہے:

﴿وقالت اليهود عزيزابن الله وقالت النصارىٰ المسيح ابن الـلـه ذالك قولهم با فواههم يضا هئون قول الذين كفرو من قبل﴾۲۳؎

''اور یہودی کہتے ہیں عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور نصرانی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ باتیں وہ اپنے منہ سے کہتے ہیں یعنی یہ ایسی باتیں ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں مل سکتی اور وہ لوگ خواہ مخواہ باطل صریح کے معتقد ہیں۔ اپنی قسم کی زبانی باتیں جو بعد میں تاریخی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اللہ کے نزدیک ایسی باتیں ناپسندیدہ ہیں''۔

سورۃ الصّف میں یوں ارشاد ہوا ہے:

﴿ كبر مقتاً عندالله ان تقولوا مالا تفعلون﴾؎۲٤

''کیسی سخت ناپسندیدہ ہے اللہ کو وہ بات کہو جو نہ کرو''۔

یعنی صرف زبانی باتیں کرو گے تو عمل سے دور ہو جاؤ گے اور ایسی باتیں اللہ کو بالکل پسند نہیں یعنی زبانی باتیں جو بلا دلیل ہوتی ہیں وہ گمراہی بھی ہیں اور باطل صریح بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سخت ناگوار بھی ہیں اسی لیے ہمارے اسلاف نے جو کچھ سنا اس کے لیے پوری پوری تحقیق کی اور حدیث کے معاملے میں تو ایک ایک حرف اور لفظ کی صحت کے لیے سخت دشواریوں کو بھی گوارا کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ ہستیاں ہیں جن کے سر تحقیق کے اصول روایت کی طرح ڈالنے اور عملی

طور سے انہیں استعمال کرنے کا سہرا ہے۔ ان حضرات کو رسول اللہ ﷺ سے نہایت عقیدت ومحبت اور والہانہ عشق وابستگی کے ساتھ ساتھ آپؐ کی بے حجاب اور پاکیزہ زندگی کے معمولات سے بخوبی واقف تھے لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو قبول کرنے اور روایت کرنے کے عمل میں انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں عہد صحابہ سے چند مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو قبول روایت کے سلسلے میں احتیاط کی روش کو اولیت حاصل ہے۔ حافظ ذھبی لکھتے ہیں:

"كان اول من احتاط فی قبول الاخبار"۲۵؎

''وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے احادیث قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیا''۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے طرز عمل سے تحقیق حدیث کے لیے ''اصول شہادت'' کی طرح ڈالی اور اس میں اول بانی قرار دیے جاتے ہیں۔ آپؓ کی قائم کی ہوئی اس بنیاد پر بعد میں دیگر تحقیقی و تنقیدی علوم کی عظیم الشان اور بے نظیر عمارت تعمیر ہوئی۔ مولانا فہیم عثمانی کے مطابق:

''بعد کے زمانوں میں احادیث کے لیے چھان بین، تحقیق وتلاش اور تنقید وتمحیص کے جیسے علوم وجود میں آئے ان سب کا منبع حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جاری کردہ اسی چشمے سے پھوٹتا نظر آتا ہے، اسی طرح بعد کے زمانوں میں روایتوں میں قوت پیدا کرنے کے لیے محدثین کے درمیان توابع وشواہد کو جمع کرنے کا جو عظیم الشان سلسلہ شروع ہوا ہے اس کی ابتداء گویا اسی دن سے ہو گئی تھی جس دن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے ''ھل معک احد'' کے الفاظ نکلے تھے اور حضرت محمد بن مسلمہؓ کھڑے ہو کر حضرت مغیرہؓ کی بیان کردہ روایت کیلیے اولین تابع وشہادت مہیا کر دی تھی''۔۲۶؎

قبول روایت میں حضرت عمرؓ کا محتاط رویہ یہ تھا کہ امام ذھبیؒ ان کے احوال میں لکھتے ہیں:

"ھوالذی من اجری للمحدثين التثبت فی النقل وربما بتوقف فی خبر الواحد اذا ارتاب"۲۷؎

''حضرت عمرؓ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے محدثین کے لیے روایت (حدیث) کے بارے میں تحقیق وتثبیت کا طریقہ جاری فرمایا اور جب انہیں تردد ہوتا تو خبر واحد کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیتے''۔

ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ انہوں نے بہت سے علماء سے سنا کہ ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمر کے مکان کی جانب آئے اور تین بار آنے کی اجازت طلب کی، جب تینوں بار کوئی جواب نہ ملا تو واپس چلے گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجا جب وہ آئے تو ان سے کہا کہ آپ اندر کیوں نہیں آئے؟ ابوموسیٰ اشعریؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اجازت تین بار لینی چاہیے۔ اگر اجازت مل جائے تو اندر داخل ہوجاؤ ورنہ واپس چلے جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: آپ کے علاوہ اور کس نے یہ حدیث سنی ہے؟ اس کو (گواہی دینے کے لیے) لے کر آؤ اگر نہ لاؤ گے تو میں تم کو سزا دونگا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ باہر نکلے اور مسجد میں بہت سے لوگوں کو ایک مجلس میں بیٹھے دیکھا جسے ''مجلسِ انصار'' کہتے ہیں اور کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اجازت تین بار لینی چاہیے اگر مل جائے تو داخل ہوجاؤ نہیں تو واپس چلے جاؤ۔ میں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ سے بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ کسی اور نے یہ حدیث سنی ہو تو میرے ساتھ چلے۔ لوگوں نے ابوسعید حذریؓ سے کہا کہ آپ جائیں وہ ہم لوگوں میں سب سے کمسن تھے۔ ابوسعید خدریؓ ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ آئے اور یہ حدیث حضرت عمرؓ سے بیان کی۔ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن میں ڈرا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ نبی اکرمؐ پر باتیں گھڑ لیا کریں۔

علامہ ذھبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں حضرت امیر معاویہؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ:

"علیکم من الحدیث بماکان فی عهد عمررضی الله عنه فانه کان قد اخاف الناس فی الحدیث عن رسول الله ﷺ" ۲۸؎

''حضرت عمرؓ کے عہد میں جو حدیثیں رائج تھیں ان کو لازم پکڑو کیوں کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی روایت میں محتاط بنادیا تھا''۔

اسی طرح حضرت ابوایوبؓ کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک حدیث حضورؐ سے براہ راست خود سنی تھی لیکن حدیث کے کسی لفظ پر شک پیدا ہوا تو آپؓ اس شک کو مٹانے کے لیے مدینہ منورہ سے حضرت عقبہ بن عامر کے پاس مصر تشریف لے گئے۔ حدیث یہ تھی کہ ''**من ستر مسلماً جزیة ستره الله یوم القیامة**'' اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس حدیث کو سنتے ہی (اپنا شک دور کرتے ہی) آپ اپنی سواری کی طرف پلٹے سوار ہوئے اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آپ نے مصر میں اپنا کجاوہ بھی نہیں کھولا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے حدیث کے ایک حرف کے لیے کوچ کیا۔ حضرت مسروقؒ کا بھی یہی واقعہ ہے۔ صحابہ کرامؓ کی یہ محتاط روش کسی عدم اعتماد اور عدم اطمنان کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس میں انتہائی احترام اور تقوی کارفرما تھا کہ سننے اور سمجھنے کی غلطی کی وجہ سے حضور مقبول صلعم کی جانب کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ اکثر صحابہ کرامؓ کے پیش نظر نقل روایت کے عمل میں آپ صلعم کا یہ قول پیش نظر تھا کہ ''**من کذب علیَ متعمداًفلیتبوا مقعده من النار**'' جو شخص قصداً میری جانب جھوٹی بات منسوب کرے تو اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے۔ یہ تھا صحابہ کرامؓ کے دور میں احادیث وروایت میں غیر معمولی احتیاط کا مختصر سا تعارف اس کے بعد ہم ائمہ مجتہدین کے اصول روایت پر بھی طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ مجتہدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرعی نصوص (یعنی قرآن وحدیث) سے احکام اور مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور تائید میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ان کی قائم کی ہوئی شرطوں پر پوری اترتی ہیں۔ یہی وجہ ہے بعض ائمہ مجتہدین نے کثرت سے احادیث کو روایت نہیں کیا ہے۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:

''اور ائمہ میں سے جس نے بھی بہت کم روایت کی ہے اس کے ایسا کرنے کی وجہ (ان کا حدیث میں کم سرمایہ ہونا نہیں) بلکہ طعن کا اندیشہ ہے جو روایت حدیث کے سلسلے میں اسے لاحق تھا نیز وہ علل (کمزوریاں) ہیں جو طریق احادیث میں پیش آتی ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ اکثر لوگوں کے

نزدیک جرح (نہ کہ تعدیل) مقدم ہوتی ہے اس لیے امام کا اجتہاد اسے ایسی احادیث اور طریق اسانید اخذ کرنے سے روکنا ہے جن میں یہ (کمزوریاں) اور (نقائص) آسکتے ہیں۔ ایسی احادیث اورطرق اسانید بکثرت ہیں۔ اس لیے ضعیف طرق کی وجہ سے وہ بہت کم روایت کرتے ہیں''۔۲۹؎

امام ابوحنیفہؒ یہ علم حدیث کے بہت بڑے مجتہد تھے۔ یہ احادیث بیان کرنے میں احتیاط کرتے ہیں جہاں تک احادیث کی قبولیت وعدم قبولیت کے لیے شرائط وقواعد مرتب کرنے کا تعلق ہے تو اس کی بنیاد امام ابوحنیفہؒ نے ڈالی اور بلحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق کی۔ ان کے اصول تنقید بہت سخت تھے۔ اس لیے ''متشدد فی الراوایہ کان'' کا لقب دیا گیا۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کسی آدمی کو اس وقت تک حدیث بیان نہیں کرنی چاہیے جب تک کہ سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک یاد نہ ہو۔ امامؒ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول صلعم کی سنت اور آپ صلعم کی ان صحیح حدیثوں سے ثقات کے ہاتھوں ثقات ہی کے ذریعہ شائع ہوتی ہوں پھر اگر یہاں نہ مل سکے تو آپ صلعم کے صحابہ کرامؓ میں جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کرتا ہوں لیکن جب بات ابراہیم نخعی، شعبی، حسن اور عطا تک پہنچ جاتی ہے تو پھر میں اجتہاد سے کام لیتا ہوں جیسا کہ ان حضرات نے اجتہاد کیا ہے۔

بہرکیف حاصل کلام یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فقہی مسائل واحکام کی تائید میں صرف ان احادیث کو روایت کرتے ہیں جو متصل اور صحیح السند ہوں۔ مولانا تقی الدین ندوی لکھتے ہیں:

''(۱) وہ (یعنی امام ابوحنیفہؒ) صرف ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو صحیح ہیں اور جن کی اشاعت ثقات کے ذریعہ ہوئی ہو۔

(۲) امام صاحب کا دستور تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری احادیث اور قرآن سے ملا کر دیکھتے تھے۔ اگر اس کا مضمون اس مطابقت کھاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث سمجھتے ہیں۔

(۳) امام صاحب کے ان شرائط اور احتیاط کی وجہ سے جن روایات سے وہ

استدلال کرتے ہیں وہ صحت کے لحاظ سے اعلیٰ مقام پر ہوتی ہے"۔[۳۰]

امام مالکؒ کے متعلق مولانا بدرالدین رقمطراز ہیں:

"آپؒ تبع تابعین کے طبقہ سے ہیں۔۔۔۔سفیانؒ فرماتے ہیں رجال کی چھان بین کرنے والا مالکؒ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مالک کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے پر شک پڑ جاتا ہے تو پوری پوری حدیث ترک کر دیتے تھے"۔[۳۱]

حضرت شاہ ولی اللہ آپؒ کی کتاب "الموطا" کے متعلق فرماتے ہیں:

"اہل حدیث (محدثین) اس پر متفق ہیں کہ امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے کے مطابق موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں اور دیگر محدثین کی رائے کے مطابق اس میں کوئی مرسل اور یا منقطع حدیث ایسی نہیں ہے کہ دیگر طریق سے اس کی سند متصل نہ ہو"۔[۳۲]

امام شافعیؒ کے احتیاط کے بارے میں ڈاکٹر خالد محمود کی رائے یہ ہے کہ:

"شروع شروع میں تحقیق اسناد پر آپ کی توجہ زیادہ نہ تھی۔ ان کے ہاں حدیث کی قبولیت کا معیار اس کی صحت سند تھی۔ استقاضہ عمل کچھ نہ سمجھتے تھے لیکن آخری دور میں آپ بھی اسطرف پلٹے جو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا نظریہ تھا کہ تواتر کے ہوتے ہوئے اسناد کی ضرورت نہیں"۔[۳۳]

مولانا بدر عالم کے مطابق:

"فقہ میں آپؒ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؒ صحیح احادیث کو لیتے اور ضعیف کو ترک کر دیتے تھے۔ کسی اور مذہب میں فقہ کی تعمیر اس معیار پر نہیں کی گئی۔[۳۴]

مختصر یہ کہ امام شافعیؒ نے جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت اور امتیاز مراتب کے قواعد مرتب کئے انہوں نے اپنی کتاب "الام" اور "الرسالہ" وغیرہ میں بکثرت روایات سے استدلال کیا ہے۔

جہاں تک امام احمد بن حنبل کا تعلق ہے تو انہوں نے فقہ کے پانچ زریں اصول بنائے جن سے احادیث کے متعلق آپ کا نظریہ عیاں ہو جاتا ہے:

"(۱) جب کسی مسئلہ کے متعلق صریح نص (یعنی صحیح حدیث) موجود ہو تو پھر

کسی کے اختلاف کی پرواہ نہ کی جائے۔

(۲) جس کسی مسئلہ میں کسی صحابی کا فتویٰ معلوم ہوجائے اوراس کے خلاف کسی دوسرے صحابیؓ کا معلوم نہ ہوسکے تو پھر وہی مختار ہونا چاہیے۔۔۔آپ کے نزدیک فتاوی صحابہؓ کی اہمیت حدیث مرسل سے بھی زیادہ ہے۔

(۳) جب کسی مسئلہ میں صحابہؓ کا اختلاف ہو تو اس میں جس کا قول کتاب وسنت کے قریب نظر آئے اس کو اختیار کرلینا چاہیے۔اگر یہ ترجیح ثابت نہ ہوسکے تو پھر صحابہؓ کے اقوال کو نقل کردینا چاہیے اور کسی قول پر خبر کو مقدم نہیں کرنا چاہیے۔

(۴) اگر کسی مسئلے میں ضعف یا مرسل حدیث موجود ہو تو اس کو بھی قیاس پر مقدم رکھا جائے۔بشرطیکہ کہ اس مسئلے کے متعلق کوئی اور حدیث یا قول صحابی یا اجماع مخالف نہ ہو۔

(۵) قیاس اس وقت جائز ہوسکتا ہے جب کسی کے متعلق منقول ساماں نہ مل سکے اور وہ بھی بقدر ضرورت''۔۳۵؎

اس طرح حضرات محدثین نے راویوں کا نام معلوم کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس میں اتصال کی بے مثل صفت کو لازم قرار دیا۔یعنی جب کوئی راوی روایت بیان کرتا ہے تو اس کو بتانا ضروری ہوتا کہ اس نے روایت کسی سے سنی ہے اور پھر اس نے کس سے سنی تھی یہاں تک کہ وہ سلسلہ صحابی تک پہنچ جاتا تھا۔ بڑے بڑے ائمہ احادیث اس کا التزام کرتے تھے۔محدثین کے اسی اہتمام اور التزام کو علامہ شبلی نعمانی نے روایت کا اولین اصول قرار دیا ہے۔سیرۃ النبی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے فن سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ بہت ہی بلند تھا اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کے نام بہ ترتیب بتا تا جائے''۔۳۶؎

اسی طرح محدثین حضرات نے اتصال سند کو ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ ساتھ ساتھ صحیح سند کے التزام کی شرط لگائی۔صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس میں پائے جانے والے راوی اعلی صفات اور

خصوصیات کے مالک ہوں جن کی بنیاد پر ان کی روایت کردہ احادیث کو قبول کرنے میں کسی طرح کا کوئی تردد نہ ہو۔محدثین حضرات نے اس جانب بھر پور توجہ دی ہے اور تحقیقات کے ذریعہ راویوں کے مثبت اور منفی دونوں اوصاف دنیا کے سامنے رکھ دیئے ہیں، علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اس (اتصال سند) کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے ہیں وہ لوگ کون تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشغلہ تھا؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاراوں محدثین نے اپنی عمریں اسی میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے اور راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائی، جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے''۔[۳۷]

محدثین کی جانب سے حدیث کی تحقیق وتنقید کے لیے اسناد بیان کرنے کے نتیجے میں ''علم اسناد الحدیث'' وجود میں آیا پھر علم اسناد الحدیث کا تقاضا اور مطالبہ رہا کہ راوۃ حدیث کے حالات وسوانح کی چھان بین کی جائے ورنہ پھر سند حدیث کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔لہٰذا رواۃ کے اخلاق وکردار کے ایک ایک گوشے کی انتہائی احتیاط ودیدہ وری کے ساتھ تحقیق وتفتیش کی گئی جس کو (جرح وتعدیل) کے نام سے موسوم کیا گیا پھر اس سے ایک اور فن وجود میں آیا جو اسماء الرجال کے نام سے جانا گیا۔یہ وہ عظیم الشان فن ہے جن کی نظیر دنیا میں کسی قوم کے پاس نہیں مل سکتی۔اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی نے ڈاکٹر اسپرنگر کا قول نقل کیا ہے:

''کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری ہے نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔[۳۸]

اسماء الرجال کے فن کی محدثین حضرات نے اس حد تک خدمات انجام دیں کہ راویوں کے اوصاف وخصائص کے لحاظ سے کتب مدوں کی گئیں جیسے

ثقات کے لیے الگ ضغفاء کے لیے الگ''۔۳۹

دراصل نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سچائی اور حقیقت کی تلاش و جستجو میں ان حضرات نے کس کس طرح مصائب اور مشکلات کو برداشت کر کے اپنے اخلاف کے لیے پاک صاف اصول تحقیق مرتب کیے اور ان اصولوں کو برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے کسی قسم کے رعب و دبدبے اور مرتبے کا خیال بھی نہ کیا۔ جس کی وجہ سے آج ان کا فن حدیث اپنے اندر ایسی نزاکتیں رکھتا ہے کہ تاریخ کے ناقدین کا ذہن بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اور ان حضرات کا تقویٰ ایسا تھا کہ وہ معمولی بدعات اور منکرات صغری تک سے اجتناب کرتے تھے اور چھوٹی چھوٹی برائیوں سے بھی پرہیز تھا۔ جیسے بازار میں کھانا پینا یا راستے کے کنارے پیشاب کرنا وغیرہ۔ ضبط کا یہ حال کہ سہو کا شائبہ بھی گوارا نہ تھا۔ گویا اس قسم کے تھے ہمارے اسلاف کی تحقیق کے لوازمات۔

جدید سائنٹفک تحقیق

سائنس کی موجودہ برق رفتاری دراصل ان اصولوں کی بنیاد پر ہے جو طویل غور وخوص اور محنت ولگن کے بعد منظر عام پر آتے ہیں۔ سائنسی تحقیق میں غور وخوص کا یہ عنصر سب سے پہلے اہل یونان نے داخل کیا۔ خیال یہ تھا کہ کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہ کی جائے جب تک اس کا ثبوت یا اس کی صداقت کی دلیل موجود نہ ہو۔ اس طریق کار نے اہل یونان کے فکر ونظر میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ہر شخص حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔ خاص طور پر یونانی مفکر ارسطو کو اس سلسلے میں شہرت حاصل ہے۔ تاہم سائنسی تحقیقات میں اہل یونان کا کردار بڑی حد تک تصوراتی ہے۔ ان کا کام مفروضوں، دلائل، مشاہدات اور معلومات تک ہی ہے۔ سائنسی تحقیقات کی ترقی میں جن قوموں نے ٹھوس کردار ادا کیا ہے ان میں اس زمانے کے مسلمانوں کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

> ’’۔۔۔سائنس میں تحقیق کا عنصر بہت حد تک مسلمانوں کا مرہون منت ہے، کیوں کہ علم کے لیے تجربات، مشاہدات، باریک بینی اور تلاش وجستجوئے حقائق میں مسلمان یونانیوں سے بھی آگے بڑھ گئے تھے۔ اگرچہ یونانی محققین، بیشتر حقائق کی فراہمی کے ذمہ دار تھے۔ تاہم اس ضمن میں عربوں کی بالادستی ان کی عمیق نظری کا باعث تھی۔ الفارابی، الغزالی، ابنِ خلدون، ابنِ سینا اور ابن رشد جیسے سائنس دانوں اور ماہرین علم نے جدید طریقۂ تحقیق کی بنیاد ڈالی اور ان ہی کی تحقیقات سے اہل یورپ نے استفادہ کیا‘‘[۴۰]

سولھویں صدی کے آخر میں دلیل اور مشاہدے کے اشتراک سے جدید سائنسی طرزِ تحقیق کی ابتداء ہوئی۔ جس کے تحت پہلے مسئلے یا موضوع کا احساس کیا جاتا ہے، پھر اس کی حقیقت معلوم کرنے کی جستجو ہوتی ہے۔ اس موضوع کے متعلق مشاہدات اور تجربات کے ذریعے ابتدائی معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور یوں ایک نظریہ قائم ہوجاتا ہے۔ یہ نظریہ پہلے مشاہدات کے نتیجے میں مرتب ہوتا ہے اور ان مشاہدات کو لے کر مزید تحقیقات یا ان کی تصدیق، دوبارہ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اگر دوبارہ کی جانے والی تحقیق پہلے نظریے کے مطابق ہوتو وہ نظریہ سائنس کا ایک اصول یا ایک دریافت ہے، وگرنہ اسے ترک کردیا جاتا ہے۔ اس طرزِ تحقیق کو پروان چڑھانے میں فرانسس بیکن اور نیوٹن جیسے سائنس دانوں نے کردار کیا ہے۔

سائنسی اندازِ فکر پر مبنی یہ طریقہ گو زیادہ تر طبعی علوم تک محدود رہا مگر اب معاشرتی علوم نے بھی اس طریقۂ تحقیق کو اپنے دائرۂ عمل کا حصہ بنالیا ہے۔ چنانچہ ادبیات میں بھی اب تحقیق وتنقید کے طریقۂ کار کو سماجی علوم کی روشنی میں سائنٹفک بنانے کی ضرورت ہے۔

سائنسی اندازِ تحقیق کی بیشمار خصوصیات ہیں جن کے باعث یہ طرزِ تحقیق زیادہ قابل اعتبار نتائج فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سائنس کے حوالے سے درجہ ذیل تین عمومی سات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، اور جو مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں:

۱۔ دنیا کی ہر چیز کو سمجھا جاسکتا ہے۔
۲۔ اسے دہرایا اور تبدیل کیا جاسکتا ہے۔
۳۔ نتائج کی بنا پر انہی حالات میں اس عمل کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

سائنسی طریق تحقیق کے پانچ بڑے حصے یوں شمار کیے گئے ہیں:

۱۔ قابلِ تحقیق مسئلے کی نشاندہی
۲۔ مسئلے سے متعلق ضروری حقائق کی جمع آوری
۳۔ مسئلے کے حل کے لیے ایک یا زیادہ آزمائش، ممکنہ حل کا انتخاب
۴۔ متبادل حل کی پڑتال، تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ کون سا حل تمام حقائق کے مطابق ہے

۵۔ممکنہ حد تک مسئلے کے حل کا آخری انتخاب

سائنسی انداز تحقیق کی چند نمایاں خصوصیات درجہ ذیل ہیں:

☆ سائنسی تحقیق با مقصد ہوتی ہے جس میں کوئی مسئلہ ضرور زیر بحث ہوتا ہے

☆ سائنسی تحقیق منطق ہوتی ہے۔اس میں استدلال کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔

☆ اس کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہوتی ہے یعنی وہ عمل ہمارے حواس کی مدد سے قابل مشاہدہ ہو اور اس کی حد سے ماورا نہ ہو۔

☆ سائنسی تحقیق قابل دہرائی ہوتی ہے۔ایک سائنسدان کے بعد دوسرا یا تیسرا اس عمل کو دوہرا سکتا ہے۔

☆ سائنسی تحقیق زیادہ عمومی نوعیت کی ہوتی ہے۔اس خصوصیت کی وجہ سے ہی حقائق کی بنیاد پر نکالے ہوئے نتائج وسیع پیمانے پر قابل اطلاق ہوتے ہیں۔

☆ سائنسی تحقیق میں ہر ایک نکتہ خواہ وہ کتنا ہی آزمودہ اور مستحکم کیوں نہ ہو بہر حال عارضی اور تبدیلی کے لیے کھلا تصور کیا جاتا ہے، اور اس کی یہ نوعیت اس وقت تک رہتی ہے جب تک نئے تحقیقی کام کی روشنی میں کوئی اور نکتہ اس کی جگہ نہ لے لے۔

☆ سائنسی تحقیق کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس سے اکثر اوقات صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اور پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ نتیجہ کی نوعیت کیا ہوگی۔تاہم اس کے لیے صحیح اور مکمل معمولات کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ سائنسی تحقیق اچھے برے کی تمیز سے بالاتر ہوتی ہے۔اس سے اچھے برے نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔یا اس اسے مثبت اور منفی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔لیکن بذاتِ خود سائنسی طریق کار اس سے سروکار نہیں رکھتی۔

مراحل کے اعتبار سے بھی سائنسی طریق تحقیق کچھ پابندیوں کی حامل ہے۔ڈاکٹر اسلم ادیب نے سائنسی طریق تحقیق کے درج ذیل ''۱۲'' مراحل بیان کیے ہیں:

۱۔مسئلے کا انتخاب

۲۔مسئلے یا موضوع کی اہمیت

۳۔مفروضہ یا مقاصد تحقیق کا تعین

۴۔تحقیق منصوبہ

۵۔متعلقہ مواد کا جائزہ

۶۔مواد جمع کرنے کے ذرائع کی اعتباریت

۷۔مواد جمع کرنا

۸۔مواد کی ترتیب

۹۔مواد کا تجزیہ

۱۰۔نتائج اخذ کرنا

۱۱۔سفارشات

۱۲۔تحقیقی رپورٹ

ان میں سے چار مراحل تحقیق شروع کرنے سے قبل، چھے مراحل تحقیق کے دوران، جبکہ دو مراحل تحقیق مکمل کرنے کے بعد طے کرنا پڑتے ہیں۔

سائنسی طریقۂ تحقیق کی بحث میں مندرجہ بالا بیشتر نکات طبعی علوم کے ضمن میں متعین کیے گئے ہیں اور زیادہ تر انھی تک محدود رہے ہیں۔لیکن اب معاشرتی علوم نے بھی ان کو اپنے دائرۂ عمل کا حصہ بنالیا ہے۔اس جدید دور میں ادبیات میں بھی تحقیق وتنقید کو سماجی علوم کی روشنی میں سائنٹفک بنانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ڈاکٹر عطش درانی نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے اور اپنی کتاب ''جدید رسمیات تحقیق'' میں تحقیق اقسام میں سائنسی طریق کے ساتھ مشترکہ حیثیت رکھنے والے درجہ ذیل آٹھ عمومی مراحل شمار کیے جاتے ہیں جو زیادہ متوازن ہیں اور ادبی تحقیق کے حوالے سے قابل استعمال ہو سکتے ہیں:

۱۔تحقیق کا پہلا مرحلہ اس کی ضرورت اور مسئلے کی نشاندہی ہے ضرورت کے بغیر مسئلہ اور مسئلے کے بغیر تحقیق بے معنیٰ ہے۔

۲۔تحقیق کا دوسرا مرحلہ سابقہ تحقیقات کا نچوڑ حاصل کرنا ہے۔اس مرحلے پر تمام استخراجی آراؑ اور

تحقیقی مطالعے شریک کئے جاتے ہیں۔

۳۔تیسرا مرحلہ تحقیقی ڈیزائن کی تیاری یعنی لائحہ عمل اور تحقیقی قسم اور طریق کار کا انتخاب ہے۔

۴۔چوتھا مرحلہ مسلمات یا مفروضے طے کرنا ہے،اور مفروضے یا تحقیقی سوالات تشکیل دینا ہے جو عام طور پر سابقہ تحقیقات کے مطالعے کے بعد آسان ہو جاتے ہیں۔فرضیات کو مسئلے کا ممکنہ حل بھی کہا جاتا ہے۔

۵۔پانچویں مرحلے پر فرضیوں کی تصدیق یا تکذیب کے لیے کوائف اور مواد جمع کیا جاتا ہے۔

۶۔چھٹے مرحلے پر مطلوبہ ترتیب سے پڑتال اور تجزیہ کر کے کوائف سے نتائج برآمد کیے جاتے ہیں۔جسے ساتواں مرحلہ بھی کہا جاتا ہے۔

۷۔آخر میں نتائج اور سفارشات کو رپورٹ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

۸۔حسب اسلوب مقالہ لکھنا اس کی آخری منزل ہے۔

عصرِ حاضر میں تمام تر علوم میں تحقیق کے میدان میں سائنسی نقطۂ نظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ غیر سائنسی انداز میں کئے گئے تحقیقی کام کو موجودہ عہد میں زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔جدید ادبی تحقیق کا تاریخ لسانیات اور بشریات سے گہرا تعلق ہے۔اس لیے روایتی طرزِ تحقیق جو انیسویں صدی سے موجودہ دور تک رائج چلا آ رہا ہے اب بے معنی ہو گی۔اب سماجی علوم کی طرح ادب کو بھی جدید سائنسی اصولوں کی روشنی میں پرکھنے پر اصرار کرنا چاہیے۔دوسرے لفظوں میں اب ادب کی تحقیق میں بھی جدید سائنسی طریق کار سے بھرپور استفادہ کرنا ضروری ہے۔اگرچہ بظاہر ادبی اور سائنسی تحقیق میں ایک بعد نظر آتا ہے اور کافی حد تک فرق موجود بھی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سائنسی طریقۂ کار کا استعمال ادبی تحقیق کو زیادہ سے زیادہ معروضی اور معتبر بنا سکتا ہے اور یہی دراصل تحقیق کا مقصد بھی ہے۔

حواشی

۱۔ لسان العرب ابن منظور مکرم الافریقی المصری (جلد۱۰) ص ۴۹

۲۔ تاج العروس من جواہر القاموس (جلد۱۳) ص ۸۹

۳۔ مصباح اللغات، عبدالحفیظ بلیاوی، ص۱۶۶، مکتبہ دیو بند ۲۰۰۶

۴۔ انٹرنیٹ پر موجود فارسی لغت نامہ ''دھنجدا''

۵۔ تحقیق وتنقید، مشمولہ ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، ص:۱۱۱، مرتب ڈاکٹر عبدالستار

۶۔ اصول تحقیق، مشمولہ ادبی ولسانی تحقیق، ص:۷۷، مرتب ڈاکٹر عبدالستار

۷۔ اردو میں تحقیق، مشمولہ رہبر تحقیق اردو سوسائٹی لکھنؤ ۱۹۷۴۔ ص:۵۵

۸۔ تحقیق کا فن، گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اتر پردیش ۲۰۰۸۔ ص:۳۲۔۲۲

۹۔ دیکھئے گوگل پر البحث العربی

۱۰۔ ادبی ولسانی تحقیق، عبدالستار ردولوی، شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی ۱۹۸۴ص:۱۳

۱۱۔ تحقیق کا فن، گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اتر پردیش ۲۰۰۸۔ ص:۲۲

۱۲۔ تحقیقات کی چند تعریفات، مترجم ڈاکٹر نجم الاسلام مشمولہ تحقیق شناسی، مرتب رفاقت علی شاہد۔ ص:۲۷۔۲۶ القمر انٹر پرایز غزنی اسٹریٹ لاہور۔

۱۳۔ اردو میں اصول تحقیق جلد اول۔ ص:۷،۶۔ انتخابات ومقالات ڈاکٹر سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (۱۹۸۶)

۱۴۔ تحقیق کا فن، گیان چند جین، ص:۱۰

۱۵۔ جدید اردو تنقید اصول ونظریات، ڈاکٹر شارب رودولوی۔ ص:۴۳۰۔۔۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۰۲

۱۶۔ جدید اردو تنقید اصول ونظریات، ڈاکٹر شارب رودولوی۔ ص:۴۳۰۔۔۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۰۲

۱۷۔ ادبی تحقیق اور حقائق ۔ڈاکٹر خلیق انجم مشمولہ تحقیق و تدوین، مرتب پروفیسر ابن کنول ۔ص:۳۰
۱۸۔ ادبی تحقیق اور حقائق ۔ڈاکٹر خلیق انجم مشمولہ تحقیق و تدوین، مرتب پروفیسر ابن کنول ۔ص:۳۶
۱۹۔ اردو میں تنقید، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۔ص:۱۲۵
۲۰۔ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، شارب ردولوی ۔ص:۳۲،۳۱
۲۱۔ تدوین حدیث ۔مناظر احسن گیلانی، مقدمہ از سید سلیمان ندوی ۔ص:۸۷۔اسحاقیہ کراچی ۱۹۹۸
۲۲۔ امام اعظم اور علم حدیث، محمد علی صدیقی، ص:۵۴۶۔انجمن دار العلوم الشہانیہ سیالکوٹ ۱۹۸۱
۲۳۔ قرآن کریم ۔سورۃ حجرات آیت نمبر ۴۹
۲۴۔ قرآن کریم ۔سورۃ توبہ آیت نمبر ۳۰
۲۵۔ قرآن کریم ۔سورۃ الصّف آیت نمبر ۳
۲۶۔ تذکرۃ الفاظ، امام ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی جلد اول ۔ص:۲۔حیدر آباد دکن، ۱۹۰۰
۲۷۔ حفاظت اور صحت حدیث، مولانا محمد محترم فہیم عثمانی ۔ص:۲۳۸، ۲۳۹۔طبع دوم دار الکتب لاہور ۱۹۸۹
۲۸۔ تذکرۃ الفاظ، امام ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی جلد اول ۔ص:۶
۲۹۔ تذکرۃ الفاظ، امام ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی جلد اول ۔ص:۷
۳۰۔ مقدمہ ابن خلدون عبدالرحمٰن بن محمد۔
۳۱۔ محدثین عظام، مولانا تقی الدین ندوی مظاہری ۔ص:۸۱،۸۰،۷۹۔مجلس نشریات کراچی ۱۹۹۷
۳۲۔ ترجمان السنہ از مولانا بدر الدین ۔ص:۲۴۱۔سعید کمپنی کراچی
۳۳۔ حج اللہ البالغیہ مترجم عبدالحق حقانی ۔ص:۲۵۰۔حامد کمپنی لاہور
۳۴۔ آثار الحدیث از ڈاکٹر حامد محمود، ص:۲۸۹۔دار المعارف لاہور
۳۵۔ ترجمان السنہ از مولانا بدر الدین ۔ص:۲۴۱۔سعید کمپنی کراچی
۳۶۔ ترجمان السنہ از مولانا بدر الدین ۔ص:۲۴۸۔سعید کمپنی کراچی
۳۷۔ سیرۃ النبیؐ از علامہ شبلی نعمانی ۔جلد اول ۔ص:۲۷۔دار المصفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۱

۳۸۔ سیرۃ النبیؐ از علامہ شبلی نعمانی۔ جلد اول۔ ص: ۲۷۔ دار المصفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۱
۳۹۔ سیرۃ النبیؐ از علامہ شبلی نعمانی۔ جلد اول۔ ص: ۳۷۔ دار المصفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۱
۴۰۔ علم رجال الحدیث ڈاکٹر تقی الدین ندوی۔ ص: ۴۰۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ ۱۹۸۵
۴۱۔ اردو میں اصول تحقیق (جلد اول) مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۴/۵، ۱۹۸۶

باب دوم

اردو میں تحقیق کی روایت

(الف) اردو میں تحقیق کا آغاز وارتقاء

(ب) جدید اردو تحقیق اور اصولِ تحقیق

اردو میں تحقیق کا آغاز وارتقاء

تحقیق کا اصل کام ماضی کے گمشدہ دفینوں کو دریافت کرنا اور ماضی کی تاریکیوں کو دور کر کے اسے روشنی عطا کرنا بھی ہے اور روشنی میں رکھنا بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ تاریخی تسلسل کا فریضہ بھی انجام دینا ہے اور ادب کے ارتقائی صورت میں مربوط کرنا ہے۔ تحقیق ماضی کی گمشدہ کڑیاں دریافت کرتی ہے، موجودہ مواد کو مرتب کرتی ہے اس کا تجزیہ کرتی ہے اور اس پر تنقید کرتی ہے پھر اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے آگاہ کرتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ادب کو تحقیق کے باب میں قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کا تعلق صرف تنقید اور تبصرہ کے عمل کے لیے خاص تھا لیکن جب معاشرتی علوم وجود میں آئے تو یہ محسوس کیا جانے لگا کہ سائنسی طریقہ کار استعمال کر کے اس شعبہ میں بھی صحیح نتائج کا حصول ممکن ہے۔ لہٰذا ادب کو بھی تحقیق کے دائرہ میں شامل کیا گیا۔

تحقیق کے موجودہ معیار تک پہنچنے کے لیے اردو ادبی ولسانی تحقیق نے طویل سفر طے کیا ہے۔ اردو تحقیق اٹھارویں صدی سے تسلیم کیا جاتا ہے جب اس زمانے میں شعراء کے تذکرے لکھے گئے۔ یہ تذکرے جو ابتداء میں فارسی اور پھر اردو میں لکھے گئے، معیاری اعتبار سے انتہائی کمزور ہیں۔ ان کی بنیاد جدید تحقیقی اصولوں پر استوار نہیں ہے اور نہ ہی ان کی حقیقت معاصرین کی سوانحی حالات سے زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش انہیں تذکروں کے اندر تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے کہ:

''ناقدین اور محققین کا ایک بڑا طبقہ تذکروں کو اردو تحقیق کا نقش اول قرار دیتا ہے'' ۔[1]

دراصل تذکروں کی ابتدا بیاضوں سے ہوتی ہے بقول ڈاکٹر شمیم انہونوی:

''تذکرہ نگاری کی ابتداء بیاض نویسی سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد انہیں بیاضوں میں رفتہ رفتہ شعراء کے مختلف حالات بھی دیے جانے لگے'' ۔[2]

بیاضوں میں عام طور پر شعراء حضرات اپنی ضروریات اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریروں اور تقریروں کے اقتباس جمع کرتے تھے۔ پس اگر دیکھا جائے تو تذکروں کے ماخذ بیاضیں تھیں جیسا کہ لفظ تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تحریر یا تقریر جس میں کسی شخصیت کا ذکر کیا گیا ہو۔ اسی بنیاد پر تذکروں میں شعراء کے حالات مختصر اور ان کے کلام پر تبصرہ مختصر ہی ہوتا ہے۔ کبھی تذکرہ نگاری اپنے ذاتی تعلقات کی رعایت بھی کرتا ہے۔

اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت فارسی کے اثر سے داخل ہوتی۔ اس لحاظ سے شعرائے اردو کو تذکرے بھی فارسی تذکروں کی طرز پر فارسی میں لکھے گئے۔ ہندوستان میں فارسی تذکروں کے ابتدائی نقوش ۱۵۵ھ سے ہی ملتے ہیں۔ شعرائے اردو کے تذکروں کا باضابطہ آغاز میر تقی میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' سے ہوتا ہے جس کا سن تصنیف ۱۱۴۰ بمطابق ۱۷۵۱ ہے۔ میر کے اس تذکرے کے بعد اردو شعراء کے بے شمار تذکرے لکھے گئے جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

اگرچہ ان تذکروں میں تحقیق کے نقوش برائے نام ہیں لیکن اردو تحقیق میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھنے میں تذکروں کی تاریخی اہمیت مسلم ہے اور یہ تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تحقیقی خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔ محمد رضا انصاری نے تذکروں کی انہیں خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا ہے:

''تحقیق اور تنقید کے معیار کی بلندی کے لیے بنیادی ماخذوں کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شعرائے اردو کے قدیم تذکرے اہم بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں'' ۔[3]

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے تذکروں سے ہی تحقیق کی ابتداء ہوتی ہے انہوں نے بڑی تفصیل

سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے تائید میں حنیف نقوی کا قول پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ نگاری کو زیادہ سے زیادہ تعارف نامہ کہا جاسکتا ہے جو تحقیق نگاری ایک ایک جز و اور اس کی صورت ہے۔ اس معنیٰ میں یہ شعراء کے مطالعہ کے ضمن میں بعض بنیادی امور کی واقفیت بہم پہنچا کر اسے آگے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔ تذکروں میں شعراء کے ادھورے اور ناقص مطالعہ کے باوجود ایک اصولی موقف ضرور لیا گیا۔ جو شعر و ادب کی معروضی انداز میں جانچ پرکھ کی بنیاد ہے اور اسی سے تحقیق کی ابتداء ہوتی ہے۔ جسے حقائق کی بازیافت اور صداقت تک رسائی کا نام دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تذکرے کچھ اصول کے تحت مرتب کئے گئے ہیں جن میں شعراء کے احوال کے بیان میں خواہ وہ پیدائش اور وفات کی تاریخوں میں تعین مولد و مسکن کی نشاندہی اور سیرت و شخصیت کے نقوش کی مبہم اور سرسری نمائندگی تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ تحقیق کے فن کی ابھرتی ہوئی شکل دیکھی جاسکتی ہے''۔

بقول حنیف نقوی:

''تذکرے تاریخ ادب کا ایک جزء بھی ہیں اور اس کی بنیاد بھی۔ انہوں نے بلا استثناء تمام مورخین ادب کے لیے تحقیق و تلاش کی ظلمتوں میں چراغ راہ کا کام دیا ہے۔ ان متفق علیہ بیانات سے حقائق اور واقعات کی تعبیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی بحث نے ارباب نظر کے ذوق تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو نما کے مواقع فراہم کئے ہیں''۔[۲]

اس طرح یہ حقیقت عیاں ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اردو تحقیق کی بنیاد مضبوط کرنے میں تذکروں نے اہم رول ادا کیا ہے اور ہم اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش انہیں تذکروں میں ملتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تذکروں نے ادبی تاریخ کے مطالعہ کے لیے نئی راہیں فراہم کیں ہیں اور انہیں تذکروں کی بدولت تحقیق کی رفتار بتدریج تیز ہوتی نظر آتی ہے۔

شعرائے اردو کے تذکروں کے علاوہ اور بھی تحریریں اور تصانیف ایسی ہیں جن میں تحقیقی نقوش

موجود ہیں۔فورٹ ولیم کالج جو کہ ۱۸۰۰ میں قائم ہوا اس کے زیر اہتمام جو تصانیف اور تالیف منظر عام پر آئیں ان میں بھی تحقیقی کاوشیں بدرجہ اتم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے قیام کے بعد تحقیق میں روانی پیدا ہوئی۔

اردو تحقیق مستشرقین کی محققانہ مساعی کا بھی رہین منت ہے۔۱۸۱۵ میں الواس اسپرنگر کو شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست مرتب کرنے پر مامور کیا گیا جس کی اشاعت ۱۸۵۰ میں عمل میں آئی تھی۔گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کی پہلی جلد ۱۸۳۵،اور دوسری جلد ۱۸۴۲ میں طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ کام فرانسیسی زبان میں ہے،مگر اردو میں ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوا اور منظر عام پر آیا۔اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ انہیں مستشرقین کی مساعی ہی سے اردو زبان میں لسانی ادبی اور تاریخی تحقیق کی بنیاد پڑی اور یہ عمل بتدریج آگے بڑھا۔

تذکروں کے بعد مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات تحقیق کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔آب حیات تذکرہ نویسی اور باقاعدہ تاریخ نویسی کے درمیان ایک کڑی ہے۔اگرچہ اس کے بہت سے بیانات پر اعتراضات کیے گئے ہیں اور اس کے بعض معلومات کو غیر مستند قرار دیا گیا ہے، تاہم آب حیات کی بنیادی حیثیت کے بارے میں کلام نہیں۔آب حیات کی طرز پر مسعود حسن خان لکھتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مرد آزاد ہیں۔جنہوں نے سب سے پہلے آب حیات میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے''۔۵

سر سید احمد خان اردو کے ابتدائی محققین میں آتے ہیں۔ان کی تحریک کے زیر اثر جو نیا عملی اور سائنسی رجحان پیدا ہوا اس سے تحقیق کو بڑی تقویت ملی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مغربی اثرات کے زیر اثر زندگی کا پہلو تبدیل ہوا جاتا تھا۔ان حالات کی تبدیلی کے نئے اثرات اردو ادب و تحقیق پر بھی نمایاں طور پر مرتب ہوئے۔ بہت سی نئی تحریکات نمودار ہوئی جن کے ذریعہ نئے ذہنی وفکری رجحانات پیدا ہوئے۔خاص طور پر مذہبی عقائد کے مابین تصادم کی صورت پیدا ہوئی اور متضاد ذہنی اور فکری رویے سامنے آئے جس کے نتیجہ میں دلائل وشواہد اور سند کی ضرورت عام ہوئی اور حقائق کی بازیافت کا عمل تیز

ہوا۔ یہی وہ وقت تھا جب سرسید کی تحریک پروان چڑھی۔ جس کا ایک مضبوط حوالہ اردو زبان وادب کی حفاظت، ترقی اور احیاء بھی تھا۔

آثارالصنادید، آئین اکبری، تاریخ فیروز شاہی اور تزک جہانگیری سرسید احمد خان کے تحقیقی نقطہ نظر کو مترشح کرنے والی کتابیں ہیں۔ خاص طور سے آثارالصنادید کا دوسرا ایڈیشن سرسید کو ایک محتاط مدون کی صورت میں سامنے لاتا ہے۔ اس کے علاوہ آئین اکبری کی تدوین میں تدوین متن کے جدید اصولوں کا سراغ ملتا ہے۔

جہاں تک آثارالصنادید کا تعلق ہے تو اس سے اردو تحقیق کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ آثارالصنادید میں دہلی اور مضافات دہلی کی عمارتوں کا مفصل ذکر ہے۔ سرسید نے آثارالصنادید میں دہلی شہر کی باہر کی عمارتوں کا بیان دلی کے خاص مقام شاہجہاں آباد کا ذکر اور دہلی کی معاشرت کی ترجمانی بڑے موثر انداز اور فن کارانہ انداز میں کی ہے۔ سرسید نے بڑی جانفشانی سے یہ تحقیق کی ہے اور موثر مواد جمع کر کے یہ عظیم شاہکار انجام دیا ہے۔ سرسید کو اس کتاب کے لکھنے میں جن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، ڈاکٹر سید عبداللہ بزبان حالی یوں بیان کرتے ہیں:

> ''مولانا حالی کا بیان ہے کہ سرسید نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور بڑی مشقتوں سے اس کے لیے مواد جمع کیا۔ انہوں نے قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبوں کو پڑھنے کے لیے ایک چھینکا بنوا رکھا تھا جس میں بیٹھ کر ہر ہر کتبہ کا چربا اتارا کرتے تھے۔ یہ کام کس قدر وقت طلب اور صبر آزما تھا، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا''۔[۶]

سرسید کی ''آثارالصنادید'' کے علاوہ تاریخ سرکشی بجنور ۱۸۵۸ رسالہ اسباب بغاوت ہند، تحقیق لفظ نصاریٰ، تبیین الکلام اور رسالہ احکام طعام اہل کتاب وغیرہ تخلیقی کاوشوں کو بھی تحقیق کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ سرکشی بجنور میں سرسید نے غدر کے واقعات کو اکٹھا کر کے شائع کیا ہے۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۷ میں ہندوستان کی بغاوت کے وجوہات کے بارے میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ تحقیق لفظ نصاریٰ میں قرآن وحدیث اور لغت کی روشنی میں نصاری لفظ کی تشریح کر کے یہ ثابت کر دیا

ہے کہ اس لفظ کا استعمال درست ہے۔تبین الکلام میں انجیل اور قرآن مجید کا موازنہ کر کے مماثلت کا ثبوت دیا۔ جبکہ احکام طعام اہل کتاب میں مسلمانوں اور انگریزوں کے باہمی تعلقات پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں۔

سرسید نے تحقیق کا جو بیج بویا تھا اس کی آبیاری کرنے والوں میں حالی، شبلی اور آزاد کا نام صف اول میں آتا ہے۔ حالی، شبلی اور آزاد کا شمار اردو کے ابتدائی محققین میں ہوتا ہے۔ انہیں محققین کی قائم کردہ بنیادوں پر تحقیق کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ آزاد کو ان کے مایہ ناز کارنامہ آب حیات کے تعلق سے سابقہ سطور میں مختصراً متعارف کرادیا ہے۔

حالی نے سوانح نگاری کے میدان میں تحقیق کی مثال پیش کرنے کی سعی کی۔ وہ سوانح کی ترتیب، واقعات وحقائق کی تلاش وجستجو اور صحت بیان پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ باضابطہ مآخذ کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ حالی کا قول ہے کہ روایتی اور سنی سنائی باتوں اور رسمی معلومات پر انحصار کافی نہیں ہے ان کے اعلیٰ ذوق تحقیق پر دلالت کرتا ہے۔ حالی کو بحیثیت محقق ان کی شہرت یافتہ تصانیف کے ذریعہ جانا جاتا ہے جبکہ دراصل وہ تصانیف تحقیق سے متعلق نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان میں تحقیق کا پرتو صاف نظر آتا ہے اسی لیے ان کی خدمات تحقیق کے میدان میں بھی ان کا مرتبہ متعین کرتی ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی حیات سعدی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''۱۸۸۶ میں حیات سعدی کی لکھی گئی یہ ایک مکمل ومسبوط سوانح عمری شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی ہے۔ اردو میں اس سے پہلے سعدی پر کوئی بلند پایہ عمدہ اور محققانہ سوانح عمری شائع نہیں ہوئی۔ تذکرہ نگاری میں یہ پہلی ادبی کوشش ہے سعدی کا تذکرہ جو حالی نے پیش کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے''۔ ے

مزید حالی کی تحقیقی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام نے لکھا ہے:

> ''گزشتہ تقریباً ایک سو سے زیادہ عرصہ ہوا غالب پر تحقیقی کام ہوتا رہا ہے اور تقریباً غالب کی زندگی کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا.......حالی نے پہلے حصہ میں جو حالات اختصار سے لکھے تھے اس کے بعد ہمارے محققین نے ان

کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور انہیں زیادہ معتبر بنانے کی کوشش کی
ہے باوجود اس کے کہ حالی کے لکھے ہوئے حالات کے بعد اضافہ ہوا ہے
لیکن ''یادگار غالب'' ہی غالب کی شہرت کا باعث بنی ہے''۔ ۸ے

مولانا شبلی کا انداز استقرائی تحقیق کے قریب ہے۔ ان کی تحقیق کی مثالیں ان کی لکھی گئی سوانح عمریاں ہیں۔ المامون، سیرۃ النبیؐ، الفاروقؓ، الغزالی وغیرہ میں واقعات کی تحقیق ان کی ترتیب، اخذ نتائج وغیرہ شبلی کے تحقیقی شعور کو نمایاں کرتی ہیں۔ فارسی ادبیات کی کتاب ''شعر العجم'' میں انہوں نے عربی فارسی شعراء ادباء، تذکرہ نگاروں اور انگریزی مورخین سے استفادہ کیا ہے۔ شبلی کے بعض مضامین بھی ان کی تحقیقی قدر و منزلت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سیرۃ النبیؐ کے مقدمہ میں مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی اصول تحقیق پر سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کو ایک ستھرا راستہ دکھایا ہے۔ شبلی کی ہر تصنیف کی پشت پر تحقیق کا راز پوشیدہ ہے جب شبلی الفاروقؓ لکھ رہے تھے کہ اچانک انہوں نے اس کو چھوڑ کر النعمان کی تصنیف شروع کر دی، ایسا انہوں نے کیوں کیا، اس سلسلے میں ڈاکٹر منیر جہاں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ میں آنے سے پہلے وہ کٹر حنفی تھے۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کے قلب میں کشادگی اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور مزاج میں اعتدال پیدا ہوا لیکن امام صاحب سے ان کی عقیدت و محبت ماند نہیں پڑی اور جیسے ہی خلافت سلطنت سے ان کی نگاہ ہٹی امام ابوحنیفہؒ پر ان کی نظر جا پڑی۔ دوسرا سبب یہی تھا کہ اس وقت تک اردو میں امام صاحب پر کوئی باقاعدہ اور مبسوط سوانح عمری سامنے نہ آئی تھی لہٰذا اردو کو اس محرومی سے نجات دلانے کے لیے قلم اٹھانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس طرح اردو اور شبلی دونوں کا حق ادا ہو گیا۔ تیسرا سبب یہ ہے، جو کہ سب سے اہم تھا امام صاحب کے گرد من گھڑت اور بعید از قیاس اور مضحکہ خیز روایات کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ شبلی اپنے حقیقی اور حقیقت پسند قلم سے اس پردے کو چاک کر کے ایک ایسی شخصیت کو سامنے لانا چاہتے تھے جو حقیقی، صاف ستھری، پاکیزہ اور فہم و ادراک کے

دائرے میں ہو''۔۹

اس زمانے میں سرسید، حالی، شبلی کے علاوہ ان کے دیگر رفقا اور معاصرین چراغ علی، محسن الملک، مولوی ذکا اللہ، وحیدالدین سلیم مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی وغیرہ کے کارنامے بھی اردو کی تحقیقی روایت میں گرانقدر اضافہ کرتے ہیں۔

یہاں تک اردو تحقیق کی روایت کے چند ابتدائی رجحانات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ رجحانات بڑی حد تک منتشر ہیں ان کو خالص ادبی نہیں کہا جا سکتا۔ اردو میں خالص ادبی تحقیق بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں مولوی عبدلحق، حافظ شیرانی اور قاضی عبدالودود وغیرہ بزرگوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اردو زبان وادب کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور اردو تحقیق کے معیار کو بلند کیا ہے۔

بیسویں صدی میں تحقیق روایت میں توسیع کرنے والے ایک اہم بزرگ مولوی عبدالحق ہیں۔ مولوی صاحب کو اردو کی ادبی تحقیق کے میدان کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے تحقیق ادب کو ایک قومی نصب العین کی طرح قبول کیا اور اسے عمر بھر جاری رکھا۔ قدیم دکنی مخطوطوں کی تلاش وصحت ان کے بنیادی کاموں میں سے ہی ہیں۔ بقول انور سعید:

''دکن کے غیر دریافت ادب کو منظر عام پر لا کر انہوں نے معلوم ادبی تاریخ کی دنیا کی کایا پلٹ دی''۔۱۰

نو دریافت کتابوں میں ان کے مسبوط مقدمے، حاشیے اور صحت متن سے مستقبل میں تنقید کی راہ ہموار ہوئی۔ ''معراج العاشقین''، ''سب رس''، ''قطب مشتری''، ''علی نامہ'' اور ''گلشن عشق'' وغیرہ اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔ ان کا مختصر مگر وقیع مقالہ ''اردو کی نشونما میں علمائے کرام کا کام'' بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حافظ محمود شیرانی وہ پہلے محقق ہیں جنہوں نے تحقیق کے اصول پائیدار بنیادوں پر قائم کئے اور جدید مغربی اصول تحقیق کو رواج دیا انہوں نے حوالے درج کرنے میں ذمہ داری سے کام لیا اور مختلف ماخذ وذرائع سے اخذ ہونے والی معلومات پر جرح وتعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی ساتھ ہی منطقی اصولوں پر مبنی استدلا اور مغالطوں سے گریز تحقیق کار کے لیے ضروری ٹھہرایا۔ ''پنجاب میں اردو''،

''تنقید آب حیات'' تنقید شعرالعجم '' پرتھوی راج راسو'' جیسی کتابوں کے علاوہ بے شمار مقالات میں ان کی تحقیقی ظرف نگاہی اور بصیرت کی اعلیٰ ترین مثالیں موجود ہیں۔ رشید حسن خان کے مطابق:

''داخلی اور خارجی شہادتوں کو یکساں اہمیت دینے والے اس اہم محقق کو بجا طور پر تحقیق وتدوین کا معلم اول شمار کیا گیا ہے''۔۱۱

یہی نہیں بلکہ ان مضامین ریسرچ کے اصول مغرب سے لیے گیے اور اردو نے بھی مغربی تحقیق کار سے استفادہ کیا۔ گزشتہ ساٹھ ستر سالوں میں ہماری درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اردو تحقیق میں صحیح طور پر مصروف عمل ہیں۔ اگر چہ درسگاہوں اور یونیورسٹیوں سے باہر بھی بہت سے عظیم اور قدآور محققین ذاتی طور پر بھی سرگرم عمل ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تحقیقی عمل کا یہ سفر آزادی کے اس پار پروان چڑھا اور تیزی سے پھیل گیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد ہند و پاک میں اردو کی اعلیٰ تعلیم جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس دور میں ادبی تحقیق کو اتنا فروغ ملا کہ اسے اردو تحقیق کا زریں دور کہہ سکتے ہیں''۔۱۲

تقسیم ہند کے بعد اب تک کے عرصہ میں اردو تحقیق کی روایت کو ثروت مند بنانے میں جن حضرات نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، مالک رام، مختارالدین احمد آزاد، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر مسعود حسن خان، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر معین الرحمٰن، داکٹر معین الدین عقیل یہ وہ حضرات ہیں جو اردو تحقیق کی عمارت میں اہم ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔

اردو زبان وادب میں تحقیق کی یہ روایت انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس وقت شروع ہوتی ہے جب تذکروں میں اس کے ابتدائی نقوش تلاش کئے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کی پہلی تین چار دہائیوں میں یہ ارتقاء کی اہم منزلوں سے ہوکر گزرتی ہے اور اس کو مضبوط بنیادیں مل جاتی ہیں۔ اس کے بعد جامعات اور دیگر تحقیقی اداروں میں یہ زریں دور پروان چڑھتا ہے جو اب تک جاری ہے۔

جدید اردو تحقیق اور اصول تحقیق

اردو میں فنِ تحقیق کی روایت ہماری تحقیق کے ابتدائی نمونوں میں بھی تلاش کی جا سکتی ہے، جب اردو زبان وادب کی تحقیق شروع ہو کر ارتقاء پزیر ہوئی۔ خاص طور پر سر سید، حالی، شبلی اور مولوی عبدالحق نے جو کارنامے سرانجام دیے ہیں وہ بڑی حد تک تحقیقی اصولوں کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم تحقیق کے اصولوں سے بحث کرنے والی باقاعدہ تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی کے ایک مضمون ''شہادت کلام'' کو اس روایت کا نقطۂ آغاز تسلیم کرتے ہیں، جس کی اشاعت اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔

حافظ محمود شیرانی کا یہ مضمون دراصل ان کے ایک طویل مقالے ''یوسف وذلیخائے فردوسی'' کا ذیلی حصہ ہے، جس میں تحقیق کے اصولوں سے پہلی مرتبہ مختصر بحث ملتی ہے۔ انہوں نے اس تحریر میں تحقیق کے اندر داخلی شہادت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور ادیب کی انفرادیت پر بھی زور دیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی کے اس مختصر تحریر کے ساتھ اگر چہ اردو اصولِ تحقیق کی ہلکی سی داغ بیل پڑ جاتی ہے لیکن اس کے بعد کچھ اوپر تین دہائیوں تک ہمیں اس سلسلے میں کوئی اور تحریر دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کی بنیادی وجہ ہندوستان میں آزادی کی تحریکوں اور اس دوران ہندوستان بھر میں برپا رہنے والے انتشار کو قرار دیا جا سکتا ہے جو آزادی ملک کے بعد جا کے ختم ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد جب حالات سازگار ہوئے اور جامعات کے اندر اعلیٰ تعلیم کو فروغ ملنے لگا تو اردو تحقیق کی اس اہم ضرورت کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ چنانچہ تحقیق اور اصول تحقیق کے حوالے سے مضامین کا سلسلہ نئے سرے سے دوبارہ شروع ہوا، جس کے نتیجے میں اس روایت کی نہ صرف

مضبوط بنیادوں پر تشکیل ہوئی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تیزی بھی آنے لگی۔ ذیل میں ہم اس روایت کا مختصر لیکن اجمالی جائزہ پیش کر رہے ہیں تا کہ اردو تحقیق اور اصول تحقیق پر موجود اب تک کے کل سرمایے کا نہ صرف ارتقائی جائزہ لیا جا سکے بلکہ اس کے معیار و مقدار کا ہلکا سا تعارف بھی ہو۔

جیسا اوپر ذکر ہو ہے کہ انتشار اور شورش کے عبوری دور کے بعد فنِ تحقیق کی روایت کی صحیح معنوں میں تشکیل آزادی کے بعد ہوئی۔ اس زمانے میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ نے تنقید کے فروغ کے زمانے میں تحقیق کی اہمیت محسوس کی اور ایک مضمون ''تحقیق و تنقید'' لکھ کر پہلی مرتبہ تحقیق کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ مضمون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا جس کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھا اور اکا دکا مضامین اس حوالے سے دستیاب ہونے لگے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مضمون ''جدید علمی تحقیق کا طریقِ کار'' (۱۹۵۸) ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مضمون ''ادبی تحقیق کے بنیادی اصول'' (۱۹۵۸) آل احمد سرور کا مضمون ''اردو میں تحقیق'' (۱۹۵۸) ڈاکٹر نظیر احمد کا مضمون ''تاریخی تحقیق کے بعض بنیادی مسائل/اصول'' (۱۹۵۹) قاضی عبدالودود کا مضمون ''اردو ادب اور تحقیق'' (۱۹۵۹) اور مظفر علی سید کا مضمون ''اردو ادب اور تحقیق'' (۱۹۶۰) چند ایسے مضامین ہیں جو اردو تحقیق اور اصول تحقیق کی اہمیت کے حوالے سے اسی عرصے میں دستیاب ہوئے۔ ۱۹۶۰ تک ملنے والے ان مضامین سے نہ صرف اس روایت کی تشکیل ہوئی، بلکہ بعد میں جب اس حوالے سے باقاعدہ کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا تو فنِ تحقیق کی یہ روایت صحیح معنوں میں ارتقاء پزیر ہوئی، اور جس کے نتیجے میں اردو تحقیق کا عمومی معیار بھی بہتر ہونے لگا۔

چھٹی دہائی میں ان چند مضامین کی اشاعت کے ساتھ ہی ہمارے علمائے تحقیق و تنقید کی بھرپور توجہ تحقیق اور اصولِ تحقیق کی طرف ہونے لگی۔ چنانچہ اس موضوع پر مضامین و مقالات کی اشاعت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو ابھی تک جاری ہے۔ یہ مضامین زبان و ادب سے متعلق تحقیقی مجلّات اور رسائل وغیرہ میں شائع ہوتے رہے اور اب تک سیکڑوں کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ مضامین کی اشاعت کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار اور معیار دونوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تک ان مضامین کی ایک بڑی تعداد مجموعوں کی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ بلاشبہ اردو تحقیق اور اصولِ تحقیق کی روایت کو پروان چڑھانے اور مستحکم کرنے میں ان مضامین کا کردار سب سے

نمایاں رہا ہے۔ تاہم فنِ تحقیق کی اعلیٰ روایات اس وقت قائم ہوتی ہے جب اس سلسلے میں باقاعدہ کتابوں کا آغاز ہوا۔

مضامین کے ابتدائی نمونوں کے بعد اردو فن کا پہلا سنگ میل اس وقت قائم ہوتا ہے جب ۱۹۶۶ میں انجمن اساتذہ اردو جامعاتِ ہند کے زیر اہتمام دہلی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس اردو کے تعلیمی مسائل سے متعلق تھی لیکن اس کے تیسرے اجلاس میں اردو تحقیق کے مسائل کو بھی اہمیت دی گئی اور ہندوستان بھر کے نامی گرامی علمائے تحقیق نے اردو تحقیق کے مسائل پر آٹھ مقالات پیش کر کے اس روایت کو پہلی مرتبہ اعتبار بخشا۔ یہ مقالات بعد میں شائع کیے گئے۔

دہلی کانفرنس کے یہ مقالات زیادہ تر تحقیق کے مسائل سے متعلق تھے۔ لیکن اسی زمانے کی ایک اور اجتماعی کوشش ایسی ہے جس میں تحقیق کے مسائل کی بجائے تحقیق کے اصولوں کو اہمیت دی گئی۔ میری مراد رسالہ آج کل کے ''اردو نمبر'' سے ہے جو اگست ۱۹۶۷ میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس تحقیق نمبر میں شامل بیشتر مضامین ایسے ہیں جو تحقیقی اصولوں، تدوینِ متن، تحقیق کے معیار، تحقیق کی رفتار اور تحقیق ہی کے بعض دیگر نکات کو موضوع بناتے ہیں۔ اور جن سے پہلی مرتبہ تحقیق کے مسائل کے ساتھ اصول تحقیق یا فنِ تحقیق کی اہمیت اجاگر ہوئی۔

دہلی کانفرنس کا دائرہ نسبتاً محدود تھا۔ اردو تحقیق نمبر کی اشاعت نے وسیع پیمانے پر محققین کی توجہ اصول تحقیق کی جانب مبذول کرائی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد نہ صرف مضامین کی اشاعت کا سلسلہ زور پکڑتا گیا بلکہ اس موضوع پر باقاعدہ تصانیف کی اشاعت بھی شروع ہوگئی اور بہت تھوڑے عرصے میں اصولِ تحقیق سے متعلق کتب کافی تعداد میں دستیاب ہوگئیں۔

اردو اصولِ تحقیق کے ابتدائی دور میں تحقیق کے مسائل اور تدوین متن بنیادی موضوعات نظر آتے ہیں۔ خاص کر تدوین متن اور اس کے مسائل نے اس دور کے محققین کو زیادہ متاثر کر رکھا ہے۔ چنانچہ اردو فن تحقیق کی پہلی باقاعدہ کتاب بھی تدوین متن ہی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''متنی تنقید'' کو نہ صرف یہ انفرادیت حاصل ہے کہ یہ تدوین متن کے مسائل اور تمام اہم اصول پہلی بار پیش کرتی ہے بلکہ یہ اس روایت کی پہلی باقاعدہ تصنیف بھی قرار پائی ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلے میں جتنا سرمایہ موجود تھا وہ

مختلف اہل قلم کے مضامین کے صورت میں ہے۔

اصول تحقیق کی روایت میں متنی تنقید کے بعد اگلے ہی سال ڈاکٹر عبدالرزاق قریشی کی کتاب ''مبادیاتِ تحقیق'' شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس روایت میں اس حوالے سے انفرادیت کی حامل ہے کہ براہ راست سندی مقالہ نگاری سے بحث کرتی ہے۔اس کتاب میں ایک باب تدوینِ متن سے متعلق ہے موجود ہے۔ یہ کتاب مختصر ہے جس میں تحقیق کے تمام اصول سمیٹنا اگر چہ ممکن نہیں تھا لیکن مضامین سے قطع نظر کتابی صورت میں یہ پہلی کوشش ہے جو عام تحقیقی اصولوں سے بحث کرتی ہے۔

''رہبر تحقیق'' اصول تحقیق کے سلسلے کی کتاب ہے جس کی اشاعت ۱۹۷۶ میں ہوئی۔ یہ کتاب مقالات کا مجموعہ ہے اور متنوع تحقیقی مسائل اور اصولوں کے متعلق مضامین اور بعض اقتباسات پر مشتمل ہے۔ یہ اس وقت تک شائع ہونے والے مضامین و مقالات کی روشنی میں مرتبہ ایک بہترین اور متوازن انتخاب ہے جسے اردو سوسائٹی لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع کیا گیا۔

اس دور تک اردو تحقیق اور اصولِ تحقیق کی روایت میں چونکہ جامعات کے اندر تحقیق کی اعلیٰ روایات قائم ہو گئی تھیں۔ لہٰذا یونی ورسٹی تحقیقات پر مشتمل جائزوں پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ یہ جائزے مضامین کی صورت میں بھی مرتب ہونے لگے، لیکن سید فرحت حسین کی مرتبہ مختصر کتاب ''ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق'' اس سلسلے کی پہلی کتابی کاوِش ہے جو ہندوستان کی مختلف جامعات میں اس زمانے تک ہونے والی سندی تحقیق کی فہرست مہیا کرتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب بھی ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی۔

'متنی تنقید' کی بنیاد پر تدوینِ متن سے متعلق ایک اور کتاب ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی ''اصول تحقیق و ترتیب متن'' ۱۹۷۷ میں شائع ہوئی اور جس سے گویا اس موضوع کی تکمیل ہوئی۔ یہ کتاب دراصل مضامین کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر تنویر علوی نے اس موضوع سے دلچسپی لیتے ہوئے وقتاً فوقتاً تحریر کیے تھے۔

۱۹۷۸ میں اصولِ تحقیق کے حوالے سے دو کتابیں شائع ہوئیں۔ مولانا کلب عابد کی کتاب ''عماد التحقیق'' اس سال شائع ہونے والی ایسی کتاب ہے جو خالص سندی تحقیقی مقالے کو موضوع بناتی ہے۔ اس کتاب کی بنیاد دراصل عربی تحقیقی کتاب پر رکھی گئی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے تالیف کی گئی ہے۔ دوسری

کتاب سید محمد ہاشم کی مرتبہ ''تحقیق وتدوین'' ہے جو اسی سال شائع ہوئی۔ یہ بھی مقالات کا مجموعہ ہے اور تحقیق کے عام اصولوں کی بہ نسبت تدوینِ متن کی زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

اس روایت کو مستحکم کرنے والی اگلی کتاب رشید حسن خان کی ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۸ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں تحقیق کے نظری مباحث جبکہ دوسرے حصے میں عملی تحقیق کے چار مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔ اردو اصولِ تحقیق کی روایت میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔

کتابوں کے دوش بدوش اس زمانے میں مضامین ومقالات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ابتداء سے ۱۹۸۰ تک کے عرصے میں اردو اصول تحقیق متعلق پچاس کے قریب مضامین بھی دستیاب ہوتے ہیں جو اس روایت کے استحکام میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ کتابوں کی طرح یہ مضامین بھی تحقیق اور اصولِ تحقیق کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لاتے ہیں اور زیادہ تر تدوین متن اور تحقیق کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تاہم سندی تحقیق کے اصولوں اور دیگر ضروری مباحث کو بھی ان مضامین میں جگہ دی گئی ہے۔

۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۹۸۰ کو حافظ محمود شیرانی کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں بہار اردو اکیڈمی اور ادارۂ تحقیقات اردو کے زیر اہتمام ایک مشترکہ سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ بعد میں اس سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات ''حافظ محمود شیرانی، سیمینار کے مقالات'' کے عنوان سے شائع کیے گئے۔ یہ کتاب جو اردو اصول تحقیق کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہے، ۱۹۸۲ میں اس روایت کا حصہ بنی۔

اسی سال خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے اربابِ اختیار نے بھی ''تدوین متن کے مسائل'' کے عنوان سے چند مقالات شائع کیے۔ یہ مقالات بھی ایک سیمینار میں پڑھے گئے تھے جو دسمبر ۱۹۸۱ میں اسی موضوع پر منعقد کیا گیا تھا۔ تدوین متن ہی سے متعلق ایک اور کتاب ''فن خطاطی ومخطوطہ شناسی'' اس سال شائع ہونے والی تیسری کتاب ہے جو دو طویل مقالات پر مشتمل ہے۔ اپنی افادیت اور بہترین اسلوب کے باعث یہ کتاب محققین کے ساتھ ساتھ عام قاری کے لیے بھی دلچسپی کا سامان رکھتی

ہے۔

''ادبی اور لسانی تحقیق، اصول اور طریق کار''۱۹۸۴ میں شائع ہوئی۔ڈاکٹر گیان چند کے مطابق یہ کتاب ۱۹۵۸ میں شائع ہوئی۔ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی مرتبہ یہ کتاب ۱۷ مقالات پر مشتمل ہے اور اس وقت تک شائع ہونے والے مضامین سے انتخاب کی گئی ہے۔کتاب کے آغاز میں مرتب کا ایک طویل مقالہ اہمیت کا حامل ہے جو بذات خود ایک چھوٹی سی تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔تدوین متن سے متعلق تین مسلسل کتابوں کے بعد یہ اس دور کی اہم کتاب ہے جو عام تحقیقی اصولوں سے تعلق رکھتی ہے۔

''تحقیق کے طریقۂ کار'' ڈاکٹر ش۔اختر کی کتاب ہے جو اسی زمانے میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب پر سنہ تصنیف درج نہیں۔ڈاکٹر گیان چند نے قیاس کیا ہے کہ یہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں شائع ہو گئی ہو گی۔انگریزی کتابوں کی روشنی میں تیار کی گئی یہ بڑی حد تک سائنسی تحقیقی اصطلاحات سے مزین ہے اور خالص ادبی تحقیق سے متعلق نہیں۔تاہم ادبی تحقیق میں بھی اعتبار رکھتی ہے اور نئے محققین کے لیے قابلِ استفادہ ہے۔

فنِ تحقیق کی روایت میں ۱۹۸۶ کا سال اس حوالے سے اہم ہے کہ اس سال متعدد کتابیں اردو اصول تحقیق کی روایت کا حصہ بنیں۔اس سال ڈاکٹر اعجاز راہی کی مرتبہ دو کتابیں مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔پہلی کتاب اصولِ تحقیق سے متعلق ایک سیمینار کی روداد پر مشتمل ہے جو مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۶ کو منعقد کیا تھا۔جبکہ دوسری کتاب اسی سیمینار کے مقالات پر مشتمل ہے۔اصولِ تحقیق کی اہمیت وضرورت پر ان دو کتابوں کے مطالعے سے بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ڈاکٹر سلطانہ بخش کی دو جلدوں پر مشتمل اہم انتخاب مقالات ''اردو میں اصولِ تحقیق'' کی اشاعت بھی اسی سال ہوئی۔انہوں نے ۱۹۸۶ تک منظر عام پر آنے والے سرمائے کے ایک بڑے حصے کی روشنی میں یہ انتخاب کیا ہے اور الگ الگ مقدموں کے ساتھ کوئی پینتیس مستند مقالات ومضامین کو یکجا کیا ہے۔پہلی جلد میں تحقیق کے آساسی اصولوں سے متعلق مقالات کو اہمیت دی گئی ہے جبکہ دوسری جلد میں اردو کے ادبی تحقیق کے مقالات کو جگہ دی گئی ہے۔

بیسویں صدی کی نویں دہائی کے بقیہ چار سالوں میں ہمیں تحقیق اور اصول تحقیق سے متعلق مزید

چھ کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ''پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار'' کے نام سے ڈاکٹر معین الدین عقیل کی کتاب ۱۹۸۷ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آزادی کے بعد پاکستان میں ہونے والی ادبی تحقیقات کے پینتیس سالوں کے منظر ناموں کو سمیٹنے کی قابل قدر کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے تین لکچروں پر مشتمل کتاب ''تصحیح و تحقیق متن'' بھی اسی دوران میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب تدوین کے حوالے سے بعض نئے اور جدید پہلوؤں کو سر کرتی ہے اور اپنی اہمیت ثابت کرتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی ڈاکٹر معین الدین عقیل کی طرح پاکستان میں تحقیق کے منظر نامے پر قلم اٹھایا ہے۔ ''اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں'' کے عنوان سے ان کی کتاب ۱۹۸۹ میں اشاعت پزیر ہوئی۔ انہوں نے اس کتاب میں جامعات میں ہونے والی عام تحقیقات کے علاوہ اقبالیاتی تحقیق کو بھی زیر بحث لا کر کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر معین الدین عقیل اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے تقریباً ایک ہی موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن دونوں کا انداز قطعی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

۱۹۹۰ میں ایک ہی سال اردو فنِ تحقیق کی روایت میں تین کتابوں کا اضافہ ہوا، جن میں ڈاکٹر گیان چند کی اہم تصنیف ''تحقیق کا فن'' بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اردو فنِ تحقیق کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے جو نہ صرف تحقیق کے نوجوان طلبہ کے لیے ایک تحفہ ہے بلکہ کہنہ مشق محققین کے ذوقِ تحقیق کی آبیاری بھی یہ پوری طرح کرتی ہے۔ خالص ادبی تحقیق کو مدنظر رکھ کر تالیف کی گئی یہ کتاب فنِ تحقیق کے جملہ پہلوؤں پر محیط ہے۔

''ریسرچ کیسے کریں'' بھی اسی سال شائع ہوئی۔ ڈاکٹر نور الاسلام صدیقی کی یہ تصنیف دراصل اس کے دور طالب علمی کی یادگار ہے۔ جس میں تدوینِ متن سمیت عمومی تحقیقی طریقۂ کار کے دیگر پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دہلی اردو تحقیق کا اہم مرکز رہا ہے۔ آزادی کے بعد بھی دہلی کا یہ تشخص برقرار رہا۔ تقسیم ہند کے بعد تحقیق و فنِ تحقیق کے باب میں یہاں کے محققین نے جو اضافے کیے ان کا ایک انتخاب ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق'' کے نام سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مرتب کر کے اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتما شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت بھی اسی سال یعنی ۱۹۹۰ء میں ہوئی۔ یہ کتاب تحقیق کے حوالے سے دہلی

کی اہمیت کو موثر انداز میں نمایاں کرتی ہے۔اس کتاب کے بیشتر مضامین اصولِ تحقیق سے متعلق ہیں۔

۱۹۸۰ سے ۱۹۹۰ کے درمیانی عرصے کو اردو فنِ تحقیق کی روایت کے حوالے سے کامیاب دور کہا جا سکتا ہے کہ ان دس سالوں میں اصولِ تحقیق سے متعلق تقریباً ۱۵ کتابیں شائع ہوئیں جس کا تذکرہ درجہ بالا سطور میں ہوا۔مضامین کی ایک بڑی تعداد ان کے علاوہ ہے۔اس دور میں منظر عام پر آنے والا مواد اس حوالے سے منفرد ہے کہ اس میں جدید یونیورسٹی تحقیقات کے حوالے سے نہ صرف مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے بلکہ جدید اصولوں کی روشنی میں ان کا حل پیش کرنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔اردو اصولِ تحقیق کی روایت چند ممتاز کتابیں اسی دور کی یادگار ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اردو فنِ تحقیق کی روایت میں بعض منفرد اور قابلِ قدر اضافے ہوئے۔۱۹۹۰ سے ۲۰۰۰ تک کے درمیانی عرصے میں ''اردو میں فنی تدوین''، ''ادبی تحقیق کے اصول''، ''اصولِ تحقیق''، ''تصنیف و تحقیق کے اصول''، ''اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں''، ''تعین زمانہ''، ''تحقیق اقبالیات کے مآخذ''، ''تحقیق کے اصول وضوابط (احادیثِ نبویہ کی روشنی میں)''، ''اصول اور جائزے''، ''تدوین، تحقیق، روایت'' اور تحقیقی مقالہ نگاری (طریق کار)'' جیسی کتابیں اردو اصول تحقیق کی زیر بحث روایت کو ثروت مند بناتی ہیں۔

'اردو میں فنی تدوین' دراصل اس موضوع پر ہونے والے ایک ورکشاپ کے مقالات ہیں جو زیادہ تر تدوین/ایڈیٹنگ سے متعلق ہیں۔تاہم ان میں سے بیشتر مضامین چونکہ اردو تحقیق سے وابستہ افراد نے تحریر کیے ہیں، لہٰذا ادبی تحقیق سے وابستہ محققین حوالہ جات، اقتباسات، اشاریہ سازی، ابواب بندی اور دیگر طباعتی اور فنی امور میں ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

'ادبی تحقیق کے اصول' ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ۸۱-۱۹۸۰ میں لکھے گئے اور رسائل کی زینت بنتے رہے۔تبسم کاشمیری کے یہ مضامین اس حوالے سے منفرد ہیں کہ ان میں قدیم وجدید تحقیقی طریقۂ کار کے ڈانڈے ملتے نظر آتے ہیں۔'اصول تحقیق' ڈاکٹر سعید اللہ قاضی کی تالیف ہے جو ۱۹۹۲ میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب اسلامیات کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہے۔سندی مقالہ نگاری کی وضاحت کرنے والی یہ کتاب کسی حد تک ادبی محققین کی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دے سکتی ہے۔

صرف ۹۲ صفحات پر مشتمل قاضی عبدالقادر کی تصنیف 'تصنیف و تحقیق کے اصول' اختصار اور جامعیت کی خوبی سے متصف کتاب ہے۔ یہ کتاب بڑے تحقیقی مقالوں کے برعکس صرف ''مضمون نویسی'' کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتی ہے۔لیکن اسی ذیل میں نوجوان ادبی محققین کو تحقیق کے اہم نکات بھی سمجھاتی ہے۔

قاضی عبدالودود اردو تحقیق کی دنیا میں منفرد محقق ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی شہرت یا پذیرائی کی خواہش کے اہم تحقیقی کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ان کی تحقیقات عموماً طویل مقالات کی صورت میں سامنے آتی رہی ہیں۔ ۱۹۹۵ میں ان کی ایسے ہی مقالات پر مبنی دو کتابیں 'اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں' اور 'تعین زمانہ' خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی طرف سے شائع ہوئیں جو ان کے تحقیقی قد کو اور نمایاں کرتی ہیں۔ نوجوان محققین کی تربیت کے لیے ان کے مضامین یقیناً ایک تربیتی کورس کا درجہ رکھتے ہیں۔

پاکستان میں اقبالیات کا شعبہ محققین کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ''تحقیقِ اقبال کے مآخذ'' لکھ کر اقبالیاتی محققین کی سہولت کا اہم فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اقبالیاتی تحقیق میں اولین و ثانوی مآخذ کی مکمل نشاندہی کرنے والی یہ کتاب دراصل ان کے ایک لیکچر کی کتابی صورت ہے جس کی اشاعت ۱۹۹۶ میں ہوئی۔ 'تحقیق کے اصول وضوابط (احادیث کی روشنی میں)' کرنل (ر) ڈاکٹر عمر فاروق غازی کی کتاب ہے جو اسم بامسمٰی ہے۔ ادبی تحقیق کے سلسلے میں بھی اس کی قدر و قیمت موجود ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ 'اصول اور جائزے' مقصود حسنی کی کتاب ہے۔ مضامین پر مبنی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کے مضامین ادبی تحقیق کے اصولوں سے متعلق ہیں جبکہ دوسرے حصے میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ مقصود حسنی نے اپنے مضامین میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور اصولِ تحقیق کے بعض اہم گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔

۱۹۹۹ میں دو کتابیں شائع ہوئیں۔ رشید حسن خان کے مقالات کا مجموعہ 'تدوین، تحقیق، روایت' اور پروفیسر محمد عارف کی 'تحقیقی مقالہ نگاری (طریق کار)' اس سال شائع ہونے والی دو اہم مطبوعات ہیں۔ رشید حسن خان کے بعض مضامین تدوین کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالتے ہیں جبکہ بعض عملی تحقیقی نمونوں

پر مشتمل ہیں۔محمد عارف نے اپنے کاوش کی بنیاد انگریزی کتاب پر رکھی ہے۔ یہ کتاب سندی مقالہ نگاری کے تمام مراحل کا احاطہ کرتی ہے اور عملی نوعیت کی مثالوں سے مزیّن ہے۔ یہ کتاب جزیات نگاری کی بھی خوبصورت مثال ہے۔

بیسویں صدی کے یہ آخری دس سال بھی ایک قابلِ وقعت سرمایہ اردو فنِ تحقیق کی جھولی میں ڈال کر رخصت ہوئے۔ اس دوران منظر عام پر آنے والی کتابیں متفرق نوعیت کی ہیں۔ ایک کتاب تدوین حدیث کے اصولوں کو متعارف کرتی ہے تو ایک کتاب تحقیق اقبال میں مآخذ کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایک اور کتاب اصولِ تحقیق کے حوالے سے مغربی طرز کی جزیات نگاری اور عملی نوعیت کی مثالیں پیش کرتی ہے تو ایک کتاب ایڈیٹنگ کے طریقوں کی وضاحت کرتی ہے۔ مستقل کتابیں اور مضامین کے مجموعے ان سے الگ ہیں۔اس کے علاوہ اس دہائی میں لاتعداد مضامین بھی شائع ہوئے۔ یہ تمام مضامین بھی کہنہ مشق ادیبوں کے رشحات قلم میں سے ہیں اور اصول تحقیق کی بحث میں نئے اور قابل لحاظ گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔غرض یہ دہائی بھی اس روایت میں الگ اور منفرد نوعیت کے اضافے کرتی ہے، اور اصول تحقیق کی روایت میں ایک گراں قدر اضافہ کر کے وسعت کا باعث بنتی ہے۔

اصولِ تحقیق کی روایت اکیسویں صدی میں داخل ہو کے بھی اسی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے، جس رفتار سے اس سے پہلے کے آخری چند برسوں میں نظر آتا ہے۔ بلکہ بعض غیر معیاری اور گائیڈ و رہنما کتابوں کو شمار کیا جائے تو اس میں خاصا اضافہ ہی ہوا ہے۔ یہ عرصہ مضامین کے حوالے سے بھی زیادہ زرخیز ہے۔

۲۰۰۰ کے بعد 'اردو تحقیق مسائل ومعیار' ادبی تحقیق سے متعلق پہلی کتاب ہے جو اس روایت کو اکیسویں صدی میں کتابی صورت میں آگے بڑھاتی ہے۔ یہ کتاب جامعاتی تحقیقی مقالات پر مبنی ایک فہرست ہے جس کی اشاعت ۲۰۰۱ میں ہوئی۔اسد فیض کی مرتبہ اس کتاب میں تحقیق وفنِ تحقیق کے حوالے سے چار مطالعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

۲۰۰۱ ہی میں شائع ہونے والی ایک اور کتاب ''مقالہ نگاری کے اصول، مع رہنمائے مطالعہ'' بھی موجود ہے جو اسلامی علوم کی تحقیق سے متعلق ہے۔ مفتی عقیل الرحمن کی یہ کتاب دراصل عربی سے ماخوذ

ہے،لیکن اپنے مباحث میں ادبی تحقیق سے وابستہ افراد کے لیے بھی افادیت کے پہلو رکھتی ہے۔ ''تحقیقی مقالہ نگاری'' ایس ایم شاہد کی تالیف ہے جو اس سال شائع ہونے والی اس موضوع پر تیسری کتاب ہے۔ یہ کتاب تعلیمی تحقیق سے سروکار رکھتی ہے۔

۲۰۰۲ کو چھوڑ کر ۲۰۰۳ میں تین اہم کتابیں اردو اصولِ تحقیق کی روایت کا حصہ بنیں۔ رفاقت علی شاہد کی مرتبہ کتاب ''تحقیق شناسی'' مقالات کا مجموعہ ہے، جس میں چھوٹی بڑی ۳۶؍اہم تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس انتخاب میں ضروری حواشی وتعلیمات کا التزام بھی رکھا ہے۔ ان کی مرتبہ اس کتاب کی ایک اور خوبی کتاب کے آخر میں موجودہ فہرست بھی ہے جو اصول تحقیق پر مبنی کتب ومقالات کے ایک قابل ذکر سرمائے کی نشاندہی کرتا ہے۔

۲۰۰۳ میں شائع ہونے والی ایک اور کتاب ''اردو تحقیق (منتخب مقالات)'' بھی ہے جسے ڈاکٹر عطش درانی نے مرتب کر کے مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیر اہتمام شائع کی ہے۔ اس مجموعے میں ۲۸؍ان تحریروں کو جگہ دی گئی ہے جو نئے دور کے بالغ نظر محققین کی نگارشات ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے اردو تحقیق کے جدید ترین مسائل کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم ادیب نے بھی تحقیق کے ضمن میں کتاب پیش کی ہے۔ ان کی کتاب ''تحقیق کی بنیادیں'' ۲۰۰۴ میں شائع ہونے والی ایسی کتاب ہے جو تعلیمی تحقیق کے ذیل میں آتی ہے لیکن ادبی محقق کے لیے بھی کارآمد پہلو رکھتی ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں جدید انگریزی کتب سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے، جس کا اندازہ اس کی 'کتابیات' پر ایک نظر دوڑانے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

اردو اصولِ تحقیق میں جدید سائنسی طریقۂ کار کی طرف وکالت کرنے والی ایک اہم تصنیف ڈاکٹر عطش درانی کی ''جدید رسمیاتِ تحقیق'' بھی ہے جو ۲۰۰۵ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ضخیم ہے اور ادبی اور لسانی تحقیق کے ضمن میں بعض نئے پہلوؤں پر زور دیتی ہے۔ تحقیقی ڈیزائن، فرضیات، تکنیک، مسئلہ، مفروضے، وثوق، جواز اور تحدید وغیرہ جیسے جدید سائنس تحقیق میں معاون نکات کو اس کتاب میں اردو تحقیق کے حوالے سے اہمیت دی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق وہی معتبر ہے جو جدید سائنسی طریقۂ کار کے تحت انجام دی گئی ہو۔

فنِ تحقیق کی روایت میں ۲۰۰۶ کا سال بھی مفید رہا۔اس سال بھی چند کتابیں ''مبادیاتِ تحقیق''، ''تحقیق وتدوین''، 'اردو تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں'' اور ''جامعاتی تحقیق'' اس روایت کا حصہ بن چکی ہیں۔'مبادیات تحقیق' ڈاکٹر خوشحال زیدی کی تصنیف ہے جواس سال شائع ہوئی اور دراصل ان کے دور طالب علمی کی یادگار ہے۔طالب علمانہ کوشش ہونے کے باوجود نوجوان محققین کے لیے تو مفید ہے۔دہلی ہی سے اسی سال شائع ہونے والی ایک اور کتاب پروفیسر ابنِ کنول کی مرتبہ ''تحقیق وتدوین'' بھی ہے جو مقالات کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں ۲۵/مقالوں کو جگہ دی گئی ہے جن میں زیادہ تر مقالات اردو تحقیق سے متعلق منعقدہ ایک سیمینار کے ہیں۔خالص تحقیقی اصولوں سے بحث کرنے والے مضامین اس کتاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

'اردو پنجاب یونیورسٹی میں' ڈاکٹر سلیم ملک نے مرتب کی ہے اور ادارۂ تالیف وترجمہ پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی میں ابتداء (۱۹۴۸) سے اب تک سند کے حصول کے لیے کی گئی تحقیقات کی فہرست پر مبنی ہے۔نئے محققین کے لیے موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں اس کتاب کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

جیسا کہ ابتداء میں ذکر ہوا ردو فنِ تحقیق کی اس روایت کو مستقل کتابوں اور دیگر اجتماعی نوعیت کی کوششوں کے دوش بدوش مضامین ومقالات کے ایک مستقل سلسلے نے بھی مدد دی ہے اور استحکام بخشا ہے۔اس پورے عرصے میں اردو زبان وادب سے متعلق رسائل وجرائد اور جامعات کے مجلّات میں اس موضوع پر بیشمار مضامین ومقالات شائع ہوتے رہے ہیں۔ان مضامین کو مجموعوں کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے لیکن ایک بڑی تعداد اب بھی ایسی ہے جن سے درجنوں مجموعے اور مرتب کیے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ کچھ مضامین بعض مصنفین کی ذاتی کتابوں میں بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

موضوعات کے حوالے سے دیکھئے تو ان مضامین میں بھی کم وبیش وہی نکات بیان ہوئے ہیں جو اس سلسلے کی مستقل یا مرتب کتابوں میں عام طور پر ملتے ہیں۔تحقیق کے اصول، تحقیق کی اہمیت، تحقیق کے مسائل، تدوین وتدوین متن، مخطوطات، ادبی تحقیق میں جدید اصولوں پر زور، قدیم اور فرسودہ اصولوں کی مذمت، تحقیق کے موجودہ معیار سے عدم اطمنان، تحقیقات کی رفتار، جامعاتی تحقیق کے مسائل، تحقیق میں

جدید آلات اور طریق کار کی وکالت، تحقیقی ادارے وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ کتابوں کے برعکس ان مضامین میں تنوع اور ہمہ رنگی نسبتاً زیادہ ہے۔ نوعیت کے لحاظ سے بھی ان میں مختلف قسم کی تحریریں مل جاتی ہیں۔ کچھ مضامین ایک آدھ صفحے پر مشتمل ہیں جبکہ اس کے برعکس سو سے زائد صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین بھی مل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض مضامین ایسے ہیں جو مضمون ہوتے ہوئے بھی کسی کتاب سے بھی زیادہ مفید ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مضامین کی ایک بڑی تعداد فرومایہ ہے۔ بیشتر مضامین ایسے ہیں جو بذات خود تحقیقی اصولوں پر پورا نہیں اترتے۔

اردو فن تحقیق کے آغاز اور روایت کے سلسلے میں درج بالا اجمالی لیکن ارتقائی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ روایت بیسویں صدی کے نصف آخر یا آزادی کے بعد سے اب تک کے عرصے میں تشکیل و ارتقاء پزیر ہوئی، اس کی ہلکی سی داغ بیل اگرچہ اس سے پہلے پڑ چکی تھی۔ اس پورے عرصے میں اس موضوع سے متعلق نہ صرف بیسوں کتابیں تصنیف کی گئیں بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں مضامین بھی لکھے گئے۔ اردو محققین کے علاوہ دیگر علوم مثلاً اسلامیات، سماجی علوم، البلاغیات، تعلیم اور لائبریری سائنس سے وابستہ محققین نے بھی اصول تحقیق کے حوالے سے اردو زبان میں کتب و مضامین پیش کر کے اس روایت کو بالواسطہ فائدہ پہنچایا اور وسعت دی ہے۔

حواشی

۱۔ آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ۔مشمولہ تحقیق وتدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول۔ص:۲۶۷۔۔کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی۔

۲۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (سعادت خان ناصر) ص:۱۱۔نسیم بک ڈپو لکھنو ۔۱۹۷۱

۳۔ یادگار شعراء۔محمد رضا انصاری (پیش لفظ) ص:۳۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۔۱۹۸۵

۴۔ آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ۔مشمولہ تحقیق وتدوین، مرتبہ پروفیسر ابن کنول۔ص:۲۶۸،۲۶۷

۵۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو (مسعود حسین خان) ص:۱۸۸۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۸

۶۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ص:۴۶... ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۴

۷۔ مطالعہ حالی...ڈاکٹر شجاعت علی ناصر۔ص:۴۷

۸۔ حالی ہندوستانی ادب کے معمار از مالک رام (ص:۴۷) ساہیتہ اکادمی ۱۹۹۵

۹۔ مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر منیر جہاں (ص:۱۵۵)

۱۰۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر انور سعید (ص:۳۸۵) عزیز بک ڈپو لاہور ۱۹۹۸

باب سوم

مختارالدین آرزو آئینۂ ایام میں

(الف) بہار کی سماجی اور معاشی حالت

(ایک مختصر جائزہ تاریخ کے آئینہ سے)

(ب) بہار کے علمی و ادبی خانوادے

(مختصر جائزہ)

(ج) بہار میں زبان و ادب کی خدمات

(ایک جائزہ)

(د) پروفیسر مختارالدین آرزو

(پیدائش، تعلیم و تربیت، ملازمت)

(ہ) پروفیسر مختارالدین آرزو کی خدمات کا اجمالی جائزہ

۱۔اردو تصنیفات و تالیفات

۲۔عربی تصنیفات و تالیفات

۳۔انگریزی تصنیفات و تالیفات

۴۔اشاریۂ مقالات

۵۔ہم عصروں پر مضامین

۶۔شخصیات مستشرقین

۷۔تذکرۂ علماء وصوفیاء

۸۔تذکرۂ ادباء وشعراء ومشاہیر (اردو و فارسی)

۹۔غالبیات

۱۰۔تذکرے (متن و تعارف)

۱۱۔عربی ادب

۱۲۔کتب خانے و تعارف مخطوطات

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کا عہد

بہار کی سماجی اور معاشی حالت

کا ایک عمومی جائزہ

(تاریخ کے آئینے میں)

صوبہ بہار تاریخی عظمت اور وقعت کے اعتبار سے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کم نہیں ہے اس کی قدامت ،شہرت ، زرخیزی ،قدیم حکومت اور اسکی تہذیب ومعاشرت کو ہندوستان کی تاریخ کا ایک ضروری اور دلچسپ حصہ قرار دیا جاتا ہے۔(۱) صوبہ بہار ۲۳/درجے، ۳۸/دقیقے اور ۲۷/درجے ۳۱/دقیقے عرض البلد شمالی اور ۸۳/درجے ۲۰/دقیقے اور ۸۸/درجے ۳۲/دقیقے طول البلد شرقی کے درمیان واقع ہے۔ ہندوا کثریت کی بولیاں بھوج پوری، میتھلی، اماکھی (بہاری) کے نام سے یاد کی جاتی ہیں (۲) اسکا مکمل رقبہ ۱۶۳،۵۴ کلومیٹر پر محیط ہے۔ یہاں سیکڑوں برس سے لوگ آباد ہیں اور مختلف ذات پات اور مذہب وملت کے لوگ اپنے اپنے رسوم کی ادائیگی میں مصروف عمل ہیں ہر ایک کے رہن سہن، لب ولہجہ بول چال، اور طور طریقے جداگانہ ہیں یوں تو پورے ہندوستان میں مختلف قومیں آباد تھیں جیسے ونڈ، کھانڈ، منڈا، کول، بھیل، سونتال وغیرہ۔

ان میں دو مشہور قومیں کھانڈ اور سونتال صوبہ بہار کے مشرقی اور جنوبی کوہستانی مقامات میں آباد ہیں۔ یہاں بڑے بڑے پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور اسی طرح گھنے جنگلات کا بھی ایک لامتناہی سلسلہ آباد ہے۔ یہ بڑی مہذب اور شائستہ قومیں تسلیم کی جاتی ہیں وہ خود قریب قریب اپنے گھر بناتے ہیں اور گاؤں کی صورت میں آباد ہوتے ہیں یہ قوم عام طور پر زراعت پیشہ ہے ہر قسم کے غلہ پیدا کرتے ہیں اور اپنے کاروبار بڑھانے میں برابر محنت کرتے رہتے ہیں۔

ان کے گاؤں یا گھر کا ایک شخص مکھیا ہوتا ہے اور اس کی ماتحتی میں اس کا ایک نائب اور محافظ ہوتا ہے اسی طرح گھر کا بھی ایک رئیس ہوتا ہے۔اسی طرح گاؤں یا گھر کے بچے تاوقتیکہ سن شعور کو نہ پہنچ جائیں اس شخص کی نگرانی اور حفاظت میں رہتے ہیں ان میں اتحاد واتفاق بڑے پیمانے پر پایا جاتا ہے ایک جگہ پوجا کرتے ہیں، ایک ساتھ مل کر کھاتے ہیں اور ایک جگہ مل کر شکار کرتے ہیں۔ سونتال ہندوؤں کی

طرح کم سنی میں شادی بیاہ نہیں کرتے تھے پندرہ سے سترہ برس کے سن میں ان کے یہاں شادی بیاہ کا معاملہ شروع ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ جانبین کو ایک دوسرے کے حالات اور کیفیت معلوم ہوجاتی ہے .شادی ہوجانے کے بعد جب لڑکی شوہر کے گھر جانے لگتی تو لڑکی کے عزیز ایک لکڑی کو جلا کر فوراپانی میں ٹھنڈا کرتے ہیں۔اوراس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ آج سے اس لڑکی سے ہمارے تمام تعلقات خاموش ہوگئے جیسے اس لکڑی کی آگ پانی سے خاموش ہوگئی . یہ لوگ اپنی عورتوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور دوسری شادی اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ پہلی عورت نا قابل تولید قرار نہ پالے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب اس طرح کے رسومات پر عمل کم ہوتا ہے۔

یہ لوگ تمام چھوٹے اور بڑے جرائم آپس کی پنچایت سے طے کرتے ہیں مجرم کوتاواں جرم میں برادری کے لوگوں کو ضیافت دینی ہوتی ہے .خدا کی نسبت ان کا عقیدہ ہے کہ تمام روئے زمین ہزار ہا اقسام کے بھوت اور دیو سے بھری ہے .جن کے عتاب کو وہ مختلف جانوروں کی قربانیاں چڑھا کر رفع کر سکتے ہیں ان میں اوہام کی اس درجہ کثرت ہے کہ ان کے آباء واجداد کی روحیں بھی بھوت ہوتی ہیں ۔دریا ، پہاڑ ،جنگل اور تمام مقامات بھوت سے بھرے ہیں اور انھیں ان تمام دیوتاؤں کو راضی رکھنا واجب ہے۔ ان دیوتاؤں کے مسکن بڑے بڑے درخت بتائے جاتے ہیں اور باعتبار عقیدت سال میں ایک بار یا کئی باران درختوں کے نیچے تمام قوم کا جمع ہوکر ناچنا گویا ان تمام دیوتاؤں کو راضی کرنا اور اپنے سروں سے ان کے عتاب اور عذاب کو دور کرنا ہے اس لیے سال میں علی الاقل ایک مرتبہ ایسا کرنا ان کے یہاں لازم و ملزوم ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت سے قبل یہ قومیں بالکل پوشیدہ تھیں اور ملکی یا قومی کاروبار میں کوئی خاص ترقی نہ کرسکیں .اسلامی حکومت کے زمانہ میں انہوں نے قزاّقی اور عام آزادی کے پیشے اختیار کئے۔ یہ حکومت برطانیہ کا کمال تھا جس نے پہلے ان کو اپنا مطیع بنایا اور رفتہ رفتہ انسانی تہذیب معاشرت سے انھیں آگاہ کیا پھر دھیر دھیرے وہ ہندوستان کی عام ملکی رعایا کی طرح وقت گزارنے لگے اور وہ سارا وحشیانہ کمال وخرافات اور غیر ضروری معاشرہ کی رسومات کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

کھانڈ لوگوں کے حالات: یہ لوگ جنگلوں اور اونچے اونچے پہاڑوں پر رہتے ہیں ان کے گھر کا

بزرگ (باپ) گھر کا مالک ہوتا ہے سب لوگ گھر کے پکائے ہوئے کھانے ایک ساتھ کھاتے ہیں باپ کے مرنے کے بعد بڑا بیٹا گھر کا مالک ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ سارے انتظامات ایک ساتھ جمع ہوکر اتفاق رائے سے کرلیتے ہیں یہ لوگ اپنے مقتول کا عوض قاتل کے تمام قبیلے اور گھر بھر سے لیتے ہیں اور مقتول کے ورثا پر قاتل کا مارنا واجب ہوجاتا ہے۔ چوری کی چیز یا تو بجنسہ مالک کو واپس دیدی جاتی یا تو پھر اس کی قیمت دی جاتی۔ چوری کے جرم میں دوبار ماخذ شدہ مجرم وہاں سے ہمیشہ کے لیے جلاوطن کردیا جاتا۔

روزمرہ یا آپس کے تمام معاملات وتنازعات یا تو جانبین میں مقابلہ اور مقاتلہ کرکے طے کرلیا جاتا یا پھر گرم کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر یا سرخ دہکتے ہوئے لوہے کو ہاتھ میں لے کر حلف دیا جاتا ہے۔ حلف اکثر دیمک کے پرانے تودے، شیر کے پنجے یا گرگٹ کے چمڑے پر بھی لیے جاتے تھے کیونکہ مذکورہ چیزوں کو وہ لوگ متبرک خیال کرتے تھے۔ کسی خاندان کا رئیس لاولد مرجاتا ہے تو اسکی جائداد رؤساء پر تقسیم کردی جاتی شادی کے وقت ضروری ہے کہ لڑکی لڑکے کے مقابلہ میں زیادہ سن والی ہو اور لڑکے سے زیادہ قوی بھی ہو، باپ کو کسی قدر لڑکی کی قیمت بھی دینی ضروری ہوتی ہے لڑکی کو اپنے سسرال میں اس وقت تک بالکل خادمہ کی طرح زندگی بسر کرنی ہوتی ہے جب تک کہ اس کا کم سن شوہر جوان ہوکر اسے اپنے پاس نہ رکھ سکے مرد بلا اجازت اپنی بیوی کے اس کی زندگی میں دوسری شادی کرنے کا مجاز نہیں ہوتا ہاں البتہ بیوی راضی ہو یا وہ اجازت دیدے تو دوسری بیوی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ ایک ایسا اصول تھا جس پر عمل کرنا سب کے لیے ایک حد تک ناگزیر تھا۔

سونتال کی طرح کھانڈ کے بھی بے شمار اور لاتعداد یوی دیوتا ہوتے ہیں قوم کا دیوتا قبیلہ کا دیوتا یہاں تک کہ ہر گھر کا دیوتا جدا ہوتا ہے مگر ان سب میں بڑا دیوتا وہ ہوتا ہے جو زمین کا دیوتا کہلاتا ہے۔ جس کے اختیار میں رؤے زمیں کی پیداوار اور عام کاروبار ہے اس دیوتا پر سال بھر میں دومرتبہ زندہ لوگوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ اس قربانی میں برہمن اور کھانڈ قوم کے لوگ مستثنیٰ ہوتے تھے غریب اور اجل ہمسایہ قوموں کے لوگوں پر چوری یا دغا سے کسی آدمی کو پکڑ کر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ انسان کی اس قربانی کا

گوشت اور خون گاؤں کے ہر حصہ میں پہچایا جاتا تھا اور لوگ اس کا انتظار بھی کرتے تھے اور یہ اس لیے بھی تھا تاکہ اس کے ڈر سے کوئی ایسا کام کرنے کی جرأت نہ کرے۔

۱۸۳۵ میں برٹش حکومت نے انسان کی قربانی کو ایک وحشیانہ جرم قرار دے کر موقوف کرادیا. برٹش گورنمنٹ کے زمانہ میں جس طرح ہندوستان کی تمام قوموں نے تہذیب ،تعلیم ،معاشرت اور تمام قومی اور ملکی امور میں ترقی کی ہے. اسی طرح ان وحشی قوموں نے بھی ترقی کی اور اپنے وحشیانہ عمل (انسانوں کی قربانی) سے دور ہو گئے. دراصل جب ان میں تعلیم وتعلم کا رواج ہوا. دوسری قوموں سے انضمام ہوا اور دوسری قوموں کے رسم ورواج ،تہذیب وثقافت نیز سماج ومعاشرہ سے راہ ورسم ہونے لگے تو رفتہ رفتہ ان میں سدھار ہونے لگا اور ماضی کے رسم و رواج کو ترک کر کے جدید سانچے میں اپنے کو ڈھالنے لگے اور پھر ایک اچھے کاشتکار ،ایک بہتر تاجر اور ایک اچھا شہری بنکر بہار کی ترویج وترقی میں اہم رول ادا کیا اور لوگوں کی طرح ہر معاملات میں شانہ بشانہ ہر صف میں کھڑے ہونے لگے اور شب و روز کے تمام معاملے پیش پیش رہنے لگے (۳)

لیکن اس کے برعکس کچھ علاقے ایسے بھی تھے جہاں ذات پات نہیں تھی چھوٹی ذات برادری کے لوگوں کو عبادت گاہوں میں بھی جانے کی اجازت نہ تھی اور اگر جاتے بھی تو اعلی برادری والوں کے بعد. لوگ مختلف دیوی دیوتاؤں کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق مختلف موسموں میں پوجا کرتے تھے. بڑی ذات برادری کے لوگ جیسے برہمن وغیرہ برمھا ،وشنو ،مَنیش ان کو زیادہ مانتے تھے غرضیکہ لوگ اپنے اپنے معاملات ،عبادات ،رسم ورواج میں آزاد تھے. اس وقت آمد ورفت کے ذرائع بہت محدود تھے. سڑکیں اور چلنے کے لیے راستے بہت خراب تھے. لوگ پیدل ،بیل گاڑی بگی وغیرہ سے آمد و رفت کیا کرتے تھے. گھاس بھوس ،چھپر اور کچی اینٹ کے مکانات ہوتے تھے اور اسی میں گزر بسر ہوتا تھا. اور زندگی ایک طرح سے بہت سادگی سے گزر رہی تھی۔

مغل دور میں کچھ ترقی ہوئی تہذیب و ثقافت میں فرق پڑا لوگوں کے رہن سہن ،کھان پان ، لباس ،وضع قطع وغیرہ میں بدلاؤ آیا عوام کے خیالات ،تصورات ،نظریات بدلنے لگے. درس وتدریس ، تعلیم وتعلم ،تہذیب وثقافت کی طرف لوگ مائل ہوئے اس سے قطع نظر کہ جنگ وجدال لڑائیوں سے کافی

نقصانات بھی ہوئے تاہم لوگوں کے پرانے خیالات میں تبدیلی بھی ہوئی یہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ مت، جین مذہب وغیرہ کے پیروکار نظر آتے ہیں. یہاں مذکورہ بالا، مذاہب وملت کے لوگ برسا برس سے اپنے اپنے عقیدے اور رسم و رواج کے مطابق عبادت و ریاضت، ذکر و اذکار اور تسبیح و تحلیل میں مشغول ہیں نیز اپنے اپنے روزمرہ کے مشاغل (تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، نوکری) میں شب و روز مصروف ہوکر اپنی زندگی کو ترقی کی طرف گامزن کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دن رات ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی زندگی آگے بڑھے۔

ملک کی آزادی کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی اور لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے، اپنے تجربے کو بروئے کار لانے اور علم و ہنر کو فروغ دینے میں کافی آسانی ہوئی۔ موڈرن ٹکنالوجی سے زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دیا لہذا رہائشی طریقہ بدلنے لگے، ذرائع آمد ورفت تبدیل ہوگئے. تہذیب وتمدن کو فروغ ملا جس کے نتیجے میں علمی، فکری، ثقافتی، تمدنی، تہذیبی اور تاریخی عروج و سربلندی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ چلنے کے لیے اچھی سڑکیں، رہنے کے لیے اچھے مکانات سفر کے لیے گاڑیاں، بسیں، ٹرینیں، جہاز اور تعلیم و تعلم کے لیے اچھے اچھے ادارے قائم ہوئے اور عروج وترقی کا یہ سلسلہ ہنوز تیزی سے آگے کی طرف رواں دواں ہے بلکہ ہر روز کی نئی ایجادات سے بھی معاشرہ کو خاطر خواہ فائدہ ہو رہا ہے۔ (۴)

یقیناً بہار کی سرزمین ہر دور میں سیاسی، معاشی، تہذیبی وتمدنی، علمی و ادبی اعتبار سے نمایاں رہی ہے۔ اور یہاں کے علم وعرفانی چشمہ نے ہر ایک کو سیراب کیا ہے اور دور دراز کے لوگوں کی تشنگی کو دور کیا ہے یہاں کے لوگ نسبتاً محنتی، جفاکش اور غریب پرور واقع ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح یہ صوبہ بھی معاشی اعتبار سے بہت نمایاں رہا ہے۔ ظاہر ہے جہاں بے شمار قدرتی وسائل (کوئلہ، لوہا وغیرہ) موجود ہو اس کی معاشی حالت بہتر ہی ہوگی۔ لیکن سیاسی لوگوں نے اس صوبہ کو محض اپنے مفاد اور اپنی کرسی کی بقا کے لیے اس صوبہ کو سیاست کا اکھاڑہ بنا دیا۔ اور عوام کی فلاح و بہبود کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجۃً اس کو ہندوستان کے پچھڑے ہوئے صوبوں میں شمار کیا جانے لگا۔ جس کا خمیازہ سیاسی اشخاص پر تو نہیں ہوا۔ ہاں البتہ غریب و بے بس عوام ضرور پس گئی اور ان کو طرح طرح کی پریشانیاں اور

مشقتیں برداشت کرنی پڑیں۔(۵)

ادھر پچھلے کچھ سالوں میں یہاں کی معاشی حالت میں سدھار ہوا ہے اور اب اسکی حالت ہندوستان کے اہم صوبوں میں شمار ہونے لگی ہے لوگوں کو بھی راحت ملی ہے اوران کے خواب شرمندۂ تعبیر ہورہے ہیں۔زراعت وکاشتکاری،صنعت وحرفت،تجارت اورسرکاری ملازمت وغیرہ یہاں کے لوگوں کے معاشی ذرائع ہیں۔ یہاں کی مٹی میں نمی اور قدرتی شادابی اور رطوبت کی وجہ سے یہاں کی زمین زرخیز ہے کثرت سے یہاں چاول پیدا ہوتا ہے چاولوں میں بعض قسم ایسے دھانوں کی بھی ہے جو موسم برسات میں کشتیوں پرسوار ہوکر کاٹے جاتے ہیں۔ایک قسم ایسے چاول کی بھی ہے کہ ایک دانہ سے دوتین سیر دھان پیدا ہوجاتا ہے(دراصل یہ قسم بنگال کی ہے)دھان کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں۔دھانوں کی کاشت دوتین مرتبہ ہوجاتی ہے اس کے علاوہ گیہوں،چنا،مٹر،مکی،باجرہ اورارہر وغیرہ کی بھی پیداوار خاصی ہوجاتی ہیں۔

گنا بھی اچھی مقدار میں پیدا کیا جاتا ہے۔مختلف قسم کی سبزیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔کسان خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے بھی مستفید ہوتے ہیں۔گنگا ندی سے جس طرح سیلاب سے کسانوں کو نقصان ہوتا ہے۔مکانات تباہ ہوجاتے ہیں۔تو دوسری طرف اس کے فوائد بھی ہیں۔گنگا کی وجہ سے زمین میں نمی ہوتی ہیں اور جب اس کا پانی کم ہوجاتا ہے تو کسان اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کے اطراف مختلف موسمی پھول پیدا کرتے ہیں جو انکی معاشی حالت کو سدھار کا سبب بنتے ہیں۔ یہ صوبہ کوئلہ اور لوہا بھی پیدا کرتا ہے جو پورے ہندوستان میں سپلائی کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس صوبہ کے لیے ذرائع آمدنی کا ایک بیش قیمت ذریعہ ہے۔اگر حکومت نیک نیتی سے کام لے اورعوام کا تھوڑا بھی خیال کرے تو صرف دونوں قدرتی ذرائع سے ہی یہاں کی معاشی حالت بہتر بنائی جاسکتی ہے۔پھر بھی ان دونوں معدنیات کا بہار کی معاشی حالت کو بہتر بنانے میں بہت اہم رول ہے کاش کہ اس کا بھرپور فائدہ عوام تک پہنچتا اوران کی معاشی حالت بہتر ہوتی۔

یہاں کے لوگوں کا چاول کے بغیر کھانے کا تصور نہیں ہے۔گوشت،مچھلی،سبزی،دال،روٹی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ناشتہ میں دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ چوڑا اور لٹی بھی کھائی جاتی ہے۔دراصل ہر

صوبہ میں کھان پان، رسم ورواج ،تہذیب وثقافت میں نمایاں فرق ہوتا ہے عام طور پر لنگی کا استعمال ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ دوسرے کپڑے بھی استعمال کیے جاتے ہیں، یہاں کچھ ایسے پھل ہیں جو ہندوستاں میں ۵۰ر سے زائد فیصد یہیں پیدا ہوتے ہیں جیسے آم، لیچی اور حاجی پور کا کیلا ،مظفر پور کی شاہی لیچی بہت مشہور ہے ہندوستان کے علاوہ دوسرے مما لک میں ایکسپورٹ ہوتی ہے اور مسلسل اس کی مانگ رہتی ہے۔اسی طرح حاجی پور کا کیلا جو حجم میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن اپنی شیرینی میں لا جواب ہوتا ہے۔کسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کے ان کی معاشی حالت بھی بہتر ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیاں کیا گیا یہاں فیکٹریوں کی کمی ہے۔یہاں بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار کرپشن اور لوٹ پاٹ کی وجہ سے آنا پسند نہیں کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے موجودہ حکومت کے پہلے کی حکومتوں میں لوگ روزگار کی تلاش مین دوسرے صوبوں کا رخ کرتے تھے اور انھیں کافی دشواریوں اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔دراصل سابقہ حکومتیں یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود اور ترقی وخوشحالی کے سلسلہ میں خود سنجیدہ نہیں تھی۔اور نہ ہی اس طرح کے اقدام پسند تھے۔موجودہ حکومت یہاں کے عوام کی خوشحالی ،روزگار،تعلیم وترقی کی طرف خاطرخواہ توجہ مبذول کر رہی ہے اور لوگوں کی آسانی اور خوشحالی ،روزگار بڑہانے کے ہر ممکن اقدامات کر رہی ہے بڑے بڑے صنعت کاروں کو بلایا جارہا ہے فکٹریاں قائم ہورہی ہیں اور کام جنگی پیمانے پر جاری وساری ہے اور کوشش اس بات کی ہورہی ہے کہ عوام کو دوسری جگہوں پر جانے کے بجائے یہیں روزگار دیا جائے اور سہولیات فراہم کرائی جائے۔اس اسکیم کو اگر صحیح معنوں میں نافذ کر دیا جائے تو آسانیاں بڑھ جائینگی ،خوش حالی ہوگی امن وسکون ہوگا اور یہ صوبہ بھی تعمیر و ترقی کے اعتبار سے ہندوستان کے اہم صوبوں میں شمار کیا جائے گا۔

صوبۂ بہار کے علمی وادبی خانوادے

(مختصر جائزہ)

قصبہ منیر ۵۷۶ھ میں امام محمد تاج فقیہ کے زیر اقتدار آیا۔جنہوں نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور گم کردہ راہ لوگوں کو ہدایت کے لیے ایک ایسی خانقاہ کی بنیاد ڈالی جو مشرقی ہندوستان میں پہلی ایسی خانقاہ تھی جو نہ صرف روحانی قیادت کا مرکز تھی بلکہ بختیار خلجی کے حملہ تک سیاسی زمام اقتدار بھی سنبھالے رہی، محمد تاج فقیہ کی اولاد میں سے یقیناً ایسی تاریخ ساز ہستیاں پیدا ہوئیں جو ساتویں صدی ہجری میں پورے برصغیر میں برگزیدہ ہوئیں۔

ان میں سب سے زیادہ امتیاز شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کو حاصل ہوا۔آپ کے وعظ وتلقین کا اثر یہ ہوا تھا کہ دور دور سے لوگ آتے اور اپنے قلب وجگر کو روحانیت کی دولت لازوال سے معمور کرتے، ہزارہا افراد کو کفر وضلالت کے دلدل سے نکال کر اسلام کی روح پرور تعلیمات کے ذریعہ رشد وہدایت کی دولت عظمیٰ سے سرفراز کیا اور وہ دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ بنے اسی طرح پھلواری شریف بھی ایک ایسا مقام ہے جو علماء ومشائخ اور ادباء وشعراء سے ہر دور میں آباد رہا ہے، اپنی علمی اور روحانی خصوصیتوں کے لحاظ سے بہار کے اس قصبہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔معرفت وروحانیت کے نور سے اس خطہ کو منور کرنے والی متبرک شخصیت حضرت مخدوم جہان کے خلیفہ ومرید حضرت مخدوم سید منہاج الدین کی تھی۔جنکی تشریف آوری سے اس خطہ میں کفر وضلالت کی تاریکی چھٹی اور اسلام کی روشنی پھیلی اور اس سے عوام کو بے انتہا فائدہ بھی ہوا۔

اس کے بعد دوسرا خاندان حضرت امیر عطا اللہ کا ہے، اس خاندان میں بڑے بڑے اہل علم اور ولی اللہ پیدا ہوئے۔ حضرت تاج المعارف سید شاہ محمد مجیب اللہ قادری کو آپ ہی سے نسبی اور روحانی نسبتیں حاصل تھیں۔ آپ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عماد الدین قلندر سے تعلیم و تربیت پائی اور انہیں سے سلسلہ قادریہ میں بیت ہوئے۔ حضرت عماد الدین قلندر کے وصال کے بعد آپ نے رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور آگے بڑھایا۔

اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے بہت سے خانوادے تھے جو یہاں پر علم وادب کی اشاعت اور رشد وہدایت کے بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ وہ تمام صوفیاء جنہوں نے مسند علم وعرفان کو سنبھالا وہ بھی فارسی کے علاوہ عربی زبان وادب کے بھی رمز شناس اور ماہر تھے۔ گو کہ رسائل وکتابوں کی شکل میں ان کی کاوشیں بیشتر فارسی میں ملتی ہیں تاہم ان کی عربی تالیفات کی تعداد بھی کم نہیں، ان کی نگارشات مختلف موضوعات (تفسیر، حدیث، سیرت، ادب، فقہ اور تصوف وغیرہ) پر محیط ہیں، اس طرح علوم اسلامیہ اور زبان وادب کی خدمات کے حوالے سے اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قدیم خانقاہیں علوم وفنون کی نشر واشاعت کے لیے اہم مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ صوفیاء اور مشائخ صرف مجاہدہ نفس اور وظائف کو ہی عبادت نہ سمجھتے تھے بلکہ وہ شریعت وطریقت اور ظاہر وباطن دونوں کی تعلیم و تدریس کو اپنا حقیقی نصب العین تصور کرتے تھے ان کے ملفوظات، رسائل اور متنوع موضوعات کی تصنیفات اس کے واضح ثبوت ہیں جسے دیکھا اور پڑھا بھی جا سکتا ہے (۶)

یہ بہار کی عظمت اور یہاں کے علماء کے فضل وکمال کا چرچا ہی تھا۔ کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے قافلہ در قافلہ ملتان سے بہار آتا اور تعلیم دینے کے لیے بہار سے علماء کو دلی بلایا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مولانا شمس الحق ڈیانوی محدث کے تذکرہ میں آتا ہے کہ تحصیل حدیث کے لیے آپ کے یہاں مدینہ، یمن اور نجد کے طلباء کی جماعت ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ بہار کی علمی مرکزیت کے حوالے سے تاریخ کی اس شہادت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شیر شاہ کے جانشین اسلام شاہ کے زمانہ میں جب اہم مذہبی مسئلہ پیش آیا تو گوالیار کا بادشاہ ملا بدھ حقانی کو فتوی دینے کے لیے بہار سے طلب کیا۔ اسی طرح شاہ عالم گیر کے زمانہ میں علمائے دلی کا جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہوا تو بہار کے ایک طالب علم مولانا شہباز بھاگلپوری سے

مشورہ کیا گیا اور بقول مولانا گیلانی ,,بادشاہ کا قول تھا کہ ''مولانا شہباز ابوحنیفہ وقت''۔

علماء بہار کی زبان وادب اور اسلامی خدمات کا دائرہ اپنے صوبہ یا ملک تک محدود نہ تھا۔ بلکہ ان کے علمی کمال کی شہرت اور ان کی تصنیفات کی عظمت کا اعتراف عرب علماء نے بھی کیا، اسی طرح دیار غیر میں ہندوستانی علماء کو متعارف کرانے کا سہرا بھی علماء بہار کے سر جاتا ہے۔ ہندوستان کے باہر مجدد الف ثانی اور عبدالحق محدث دہلوی کو روشناس کرانے کا کام بھی مرزا رحیم اللہ بیگ مسمی بہ محمد درویش عظیم آبادی نے انجام دیا۔ مذکورہ باتوں سے یہاں کے علماء، فضلاء اور دانشوراں کی علمی کاوش اور خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔(۷)

علماء بہار کے فیوض سرحدی حد بندیوں کے پابند نہ تھے بلکہ وہاں کے اکثر فضلاء کے متعلق تاریخی شواہد موجود ہیں کہ وہ تحصیل علم وفضل کی غرض سے دلی یا اودھ گئے اور آخر میں وہیں اپنے اساتذہ کے مسند درس وتدریس کے جانشیں ہوگئے اودھ میں ملا محبّ اللہ اور دلی کے اس آخری زمانہ میں مولانا نذیر حسین محدث دہلوی اس کی آخری مثال کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں اس کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ تاریخ کے پردے میں ہمیں نظر آتے ہیں۔

علماء بہار نے علوم کی خدمت کے لیے جو صورتیں اختیار کیں۔ان میں اپنے کاشانوں میں بیٹھ کر درس وتدریس میں مصروف رہنے کا مزاج بھی عام واقعہ ہے وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہوکر صرف اپنے اپنے کاموں میں مشغول ومصروف رہے ان پاک باز لوگوں کو اس کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں تھا اپنا سب کچھ اسی کام کے لیے وقف کردیا اس سے ان امراء ورؤساء کی علم دوستی، علم سے وابستگی اور علم کے تئیں ان کے جذبات ولگاؤ کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اپنے زمانے میں تہذیب و ثقافت کے فروغ میں کس قدر سنجیدہ اور فکر مند بھی رہتے تھے ظاہر ہے اگر ان کی دلچسپی اس حد تک نہ ہوتی تو شاید علم کو وہ فروغ نہیں ملتا جو اس زمانہ میں ہمیں نظر آرہا ہے نیز علم وعرفاں سے اس قدر بہرہ مند نہ ہوتے جو ہمیں نظر آرہا ہے حقیقت میں یہ سب کا سب کمال انھیں بوریہ نشینوں کا ہے جنہوں نے دین اسلام، شریعت وطریقت دونوں کو زندہ رکھا اور ساتھ ساتھ زبان وادب اور علم وفن کی آبیاری بھی کرتے رہے۔

ہندوستان کے جید و مشہور عالم دین مولانا ابوالحسنات ندوی نے اپنی کتاب ,,ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں،، میں لکھا ہے۔

’’بہار میں عموماً یہ صورت رہی کہ اکثر رؤساء و امراء علم و فن کی دولت لازوال سے بھی مالا مال ہوتے تھے اور ضرورت دنیاوی سے بے نیاز ہو کر اپنے کاشانوں میں بیٹھے ہوئے تعلیم و تدریس ذریعہ علم و فن کی بہترین خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ان حضرات کی تصنیفات و تالیفات کا ایک بڑا اور اہم ذخیرہ بھی تھا جو یا تو ضائع ہو گیا یا دیمک کی نذر ہو گیا اور ہم اس کی بھی حفاظت و صیانت نہ کر سکے جو شاید ہمارے لیے ڈوب مرنے کر مترادف ہے اگر وہ حصہ بھی ہمارے درمیان موجود ہوتا تو آج علم و فن کے میدان میں کچھ اور ہی شان ہوتی اور طلبائے کرام علوم و فنون کی کئی خدمات اور ان گوشوں سے بھی روشناس ہوتے اور اس طرح علم و ادب کے خزانے میں مزید اضافہ ہوتا ‘‘۔ (۸)

صوبۂ بہار میں زبان وادب کی خدمات

(ایک جائزہ)

قدرت نے سرزمین بہار کے قصبات ودیہات کو علم وفن کی سرپرستی کے لیے منتخب کر کے انہیں وہ عزت وسربلندی بخشی ہے کہ وہاں کی خاک سے اٹھنے والے ذرات آسمان علم وعرفان کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے ان قصبات میں سے چند کا یہاں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔ان میں منیر شریف،سہسرام،ڈیانواں ،مجی الدین پور،نگرنہہ،نیمی کیہٹہ،گیلان، استھانواں، دیسنہ،رحیم آباد،صادق پور،عظیم آباد،طیوان،پھلواری شریف وغیرہ ایسے خطے ہیں جہاں صدیوں سے علوم ومعرفت کے سرچشمے آج تک جاری ہیں۔اور پوری دنیا اس کی زرخیزی سے مستفید ہورہی ہے۔

منیر شریف سے جاری ہونے والے علم وعرفان کے اسی فیضان اوراس سرزمین سے پیدا ہونے والے ان علماء ومشائخ صوفیاء و بزرگان دین کو خراج عقیدت کیونکر نہ پیش کیا جائے جہاں سے رشد و ہدایت کا پیغام اس طرح عام ہوا کہ صدیوں تشنہ لبان علوم ومعرفت کا مرجع بنا رہا۔ جہاں کی خانقاہ میں دماغوں کے بنانے کا اور دلوں کو سلجھانے کا کام کیا جاتا تھا۔اسی طرح کے قصبات میں ایک بہت ہی معروف ومشہور قصبہ پھلواری شریف کا بھی ہے،جس کا علم وفضل،رشد وہدایت اورعلوم وفنون کی ترویج میں وہی مقام حاصل ہے جو اودھ میں فرنگی محل کو ہے اور دونوں انجمنوں نے اپنے اپنے اعتبار سے تاریخ سازی کا کام کیا ہے۔

علم وادب کی حیثیت سے بہار کے اس مردم خیز قریہ کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔اس خطہ کی تعلیمی وعلمی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے فقہ اسلامی کی تدوین جدید کے لیے جو دفتر قائم کیا تھا اس دفتر کے تدوینی اراکین میں پھلواری شریف کے اہل علم بھی شامل تھے۔اسی طرح تاریخ ہند کے مختلف ادوار میں جو مشہور علمی وسیاسی ہستیاں گزری ہیں ان میں سے بڑے بڑے اکابر نے پھلواری شریف میں قدم رنجہ فرمایا۔مثلا مولانا عبدالعلی بحرالعلوم لکھنوی،شاہ عالم بادشاہ ،شجاع الدین،امیر قاسم وغیرہ اور بقول مولانا گیلانی,,اسی قصبہ میں آپ کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ،حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی،ملانورالحق،ملاجلال جیسے بزرگوں کے سند یافتہ یا شرف اجازت سے سرفراز ہونے والے لوگ بھی ملیں گے۔

قصبہ پھلواری میں وہ ذات گرامی بھی آسودہ خاک ہے جس کے سلسلۂ فیض نے نہ صرف پورب کے سارے اضلاع کو سرسبز وشاداب کیا۔بلکہ ظاہر و باطن کے برکات سے بھی بھر دیا،وہ حضرت تاج العارفین مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری قدس اللہ سرہ کی ذات بابرکات ہے اس خانوادے میں بڑے بڑے علماء وفضلاء ہوئے جیسے مولانا شاہ نورالحق ،مولانا ابوالحسن فرد،مولانا شاہ ظہورالحق محدث،شاہ نذیرالحق فائز،جناب تمنا عمادی اور شاہ سلیمان حسین جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں گزریں جنھوں نے اپنے اپنے عظیم کارناموں اور خدمات کی وجہ سے نہ صرف صوبہ بہار بلکہ پورے ملک میں معروف ومشہور ہیں اوران کی تصنیفات وتالیفات سے آج بھی لوگ مستفید ہورہے ہیں اوران کا سلسلۂ فیض زمانہ درزمانہ منتقل ہورہا ہے۔

تاریخ کا یہ کیسا المیہ ہے کہ صدیوں پہلے کسی ملک کی تمام تر علمی وفکری،تہذیبی وتمدنی عروج کی ابتدا جس صوبہ سے ہوئی آج اسکا نام اس اعتبار سے نہایت پسماندہ صوبوں کی فہرست میں دیکھا جاتا ہے حالات کے جبر کا شکار یہ صوبہ بہار جو عہد قدیم سے فضل وکمال،علم وعرفان،رشدوہدایت اورروحانیت کی دولت لازوال کا اہم ترین مرکز رہا ہے،معرفت وریاضت اورروحانیت نیز رشدوہدایت کے حوالہ سے

اسلام کی آمد سے قبل گوتم بدھ کی برسہا برس کی ریاضت کے نتیجے میں حاصل ہونے والا علم وعرفان کی روشنی سے نہ صرف ہندوستان بلکہ فراخنائے عالم کے تاریک گوشے روشن ہوئے اور اسی گوتم بدھ کی عبادت گاہوں اور تعلیمی مراکز سے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت عبارت تھی۔گوتم بدھ کے روحانی و تعلیمی مراکز ویہار (Vehar) کے نام سے جانے جاتے تھے گویا علم وعرفان کا وہ مرکز ویہار ہے اب بہار کہا جاتا ہے۔قدیم ہندوستان کی علمی وفکری اور تہذیبی وتمدنی شان وشوکت کا امین تھا۔اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو روئے زمین پر بہار وہ اہم خطہ ہے۔جسے محض علم وعرفان کی جولانگاہ ہونے کی وجہ سے اس نام سے منسوب کیا گیا۔نالندہ کی یونیورسٹی کے کھنڈرات آج بھی بہار کی علمی عظمت اور ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی مرکزیت کے بولتے ثبوت ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جہاں اسلامی علوم وثقافت نے ہندی تہذیب وتمدن کو ایک نیا رنگ دیا وہیں علم وعرفان اور معرفت وروحانیت کے بھی نئے نئے سوتے پھوٹے اور بہت جلد ہندوستان اسلامی علوم کے مرکز کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہوگیا۔اسلامی ہند کے اس تابندہ عہد میں صوبہ بہار کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ یہاں علوم عربیہ اسلامیہ کی سرپرستی اور اس کی ترویج واشاعت کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ چہاردانگ عالم کے تشنگان علوم اس کا قصد کرتے اور اپنے ذہن وفکر کو علم ومعرفت کے نور سے منور کرتے۔ابوالفضل کے آئین اکبری جلد دوم ص۔۶۷ر پر بہار کے شمالی حصہ ترہت کے متعلق لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ ہند کا بہار مدت تک مرکز رہا ہے۔بہار کی علمی فضیلت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عہد مغلیہ میں علمی اعتبار سے خود دلّی کے مرجع خلائق ہونے کے باوجود مغلیہ شہزادوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بہار کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں چنانچہ محی الدین اورنگ زیب کی تعلیم وتربیت کے لیے بہار کے ایک عالم ملا مومن کو مامور کیا جاتا ہے۔(۹)

مولانا بلگرامی نے مآثر الکرام میں ص۔۲۴۳ر پر لکھا ہے:

''ملا مومن بہاری قدس سرہ جنکا اصلی نام محی الدین ہے بہار میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑے۔نو سال کی عمر میں کلام اللہ حفظ کرلیا اور اپنے والد بزرگ وار ملا عبداللہ کی خدمت میں کسب علوم کیا۔۱۷رسال کی عمر میں

تحصیل علم سے فراغت ہوئی اور چند برسوں اپنے ہی وطن میں درس و تدریس میں مشغول رہے اس کے بعد شاہجہان بادشاہ کی ملازمت میں دلی تشریف لے گئے ،اور کچھ دن کے بعد محمد اورنگ زیب عالمگیر کی تعلیم وتربیت کے لیے مقرر ہوئے اسی طرح ان کے علاوہ بہار کے کئی اور علماء وفضلا نے شاہزادگان مغلیہ کے اتالیقی کے فرائض انجام دئے ہیں مثلا قاضی محبّ اللہ نے داراشکوہ کو تعلیم دی اور دربھنگہ کے ملاعبدالحسن عرف ملا جیون اورنگ زیب کی صاحبزادی اور مشہور ادیبہ وشاعرہ زیب النساء کے اتالیق مقرر کئے گئے ۔اسی طرح شاہزادہ معظم (شاہ عالم) کی تعلیم وتربیت کے لیے مولانا امان اللہ، ملا ضیاءالدین محدث اور ملا سراج الدین وغیرہ کو مقرر کیا گیا''۔ (۱۱)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جہاں اسلامی علم وثقافت نے ہندی تہذیب وتمدن کو ایک نیا رنگ دیا وہیں علم وعرفان اور معرفت وروحانیت کے بھی نئے نئے سوتے پھوٹے اور بہت جلد ہندوستان اسلامی علوم کے مرکز کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہوگیا۔اسلامی ہند کے اس تابندہ عہد میں صوبہ بہار کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ یہاں علوم عربیہ اسلامیہ کی سرپرستی اوراس کی ترویج کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ چہار دانگ عالم کے تشنگان علوم اس کا قصد کرتے اوراپنے ذہن وفکر کو علم ومعرفت کے نور سے منور کرتے ہیں۔

ان چند اہم مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہار عہد ماضی میں کتنا عظیم اوراہم رہا ہے اور یہاں ازمنہ قدیم سے ہی اپنے اپنے فن کے ماہرین دکھائی دیتے ہیں ۔جس سے یہاں تعلیم و تربیت،تہذیب وثقافت ،درس وتدریس سے لوگوں کے لگاؤ اوراس میں محبت ودلچسپی کا پتہ چلتا ہے اور علوم وفنون کی آبیاری اوراس کے فروغ کے لیے علماء بہار کے سرپرستانہ اقدام پر روشنی پڑتی ہے اوراس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے فن میں کتنی مہارت رکھتے تھے۔فکروفن اورعلم وادب کی نسبت سے ہندوستان میں پورب کے علاقے کو ہمیشہ سے امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔پورب کے علماء کے لیے مشہور ومعروف مصنف ومولف مولانا بلگرامی نے اپنی کتاب سبحۃ المرجان میں ان الفاظ کا

استعمال کیا ہے۔

''الفوار بہ،، کا لفظ استعمال کیا ہے لفظ فورب جو پورب سے بنایا گیا اور خود انہیں کا گھڑا ہوا ہے اسکی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''الفوار بہ'' الفوربی لفظ کا جمع ہے یعنی فورب کی طرف جو پورب کا معرب ہے یائے نسبتی ہے اور پورب دلی سے بجانب مشرق ایک وسیع ملک کا نام ہے دراصل پورب کا اطلاق تین صوبوں پر ہوتا ہے۔صوبہ اودھ ،صوبہ الہ آباد اور عظیم آباد یعنی اب عظیم آباد پٹنہ کے نام سے مشہور ہے اسی پورب کے متعلق شاہجہاں بادشاہ کا مشہور زمانہ شاہانہ فقرہ ,,پورب شیراز مملکت ما است،، یعنی پورب کے متعلق شاہجہاں کا کہنا ہے کہ پورب میری مملکت کا شیراز ہے۔ پورب علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور بلا شبہ جس میں صوبہ بہار بھی شامل ہے۔

مذکورہ معروضات کی روشنی میں بہار کی علمی فضا کے واضح نقوش سامنے آتے ہیں یہاں علوم وفنون کی آبیاری کے علماء بہار کے سرپرستانہ اقدام پر روشنی پڑتی ہے۔ جزیرہ عرب سے نکل کر اسلام جہاں پہنچا عربی زبان نے وہاں اپنے لیے ایک الگ مقام پیدا کیا اور بہت جلد وہاں کی زبانوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے علم وادب ،تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے لیے قائدانہ کردار ادا کیا۔اس کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ علوم اسلامیہ کا سارا سرمایہ عربی زبان کی آغوش میں ہی ترقی پزیر رہا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر علوم وفنون کو بھی یہاں مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہاں مغلیہ زمانہ میں فارسی زبان وادب کا بھی غلبہ رہا ہے۔اوراس میں بلا شبہ امراء وسلاطین کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔یہی وجہ ہے کہ عربی وفارسی اور اردو زبان کے علاوہ دوسری زبانیں کی بھی آبیاری اور انھیں ترقی دینے کی کوششیں بھی یہاں اس قدر ثمر آور ہوئیں کہ عرب ممالک کے علماء نے بھی ہندوستان کی اس کوشش اور پیش رفت کو رشک وتحسین کی نظروں سے دیکھا۔ زبان وادب کے حوالہ سے خصوصا صوبہ بہار کو کئی حیثیتوں سے امتیازی مقام حاصل ہے۔زبان وادب اور علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں بھی علماء بہار نے جس عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ تاریخ کا ایک قابل رشک باب ہے جس پر بجا طور پر ہمیں فخر ہے۔

بہار میں علوم عربیہ اسلامیہ کے عروج وارتقاء کا سلسلہ بھی یہاں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔اب حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ پہلی شخصیت کون تھی جس کو یہاں علوم اسلامیہ کو متعارف

کرانے کا سہرا بندھا۔البتہ سیاسی اعتبار سے بختیار خلجی کی آمد کو بھی یہاں مسلمانوں کے داخلہ کی ابتدا مانی جاتی ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بختیار خلجی کی آمد سے قبل ہی مسلمانوں کی آبادی یہاں قائم ہو چکی تھی اور صوفیا کی سرگرمیوں کے کئی مراکز بھی وجود میں آ چکے تھے جو اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں مصروف تھے اسی طرح بہار میں مسلمانوں اور علوم اسلامیہ کی باضابطہ تاریخ کی ابتدا خانقاہ اور صوفیا کی تاریخ سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔اس لیے جب کبھی بہار میں مسلمانوں اور علوم عربیہ کے وجود وارتقاء کی بات آئے گی تو خانقاہوں اور صوفیاء کرام کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جائیگا۔چنانچہ اگر بقول مولانا مناظر احسن گیلانی یہ کہا جائے کہ:

> ''بہار کی آب و ہوا میں اخلاقی تزکیہ یا دل و دماغ کو جہل و نادانی کی گندگی سے پاک وصاف کرنے کی قدرتی خاصیت قدرت کی طرف سے بخشی گئی ہے''۔ ۱۲

تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ دل و دماغ کے تزکیہ اور ہوس کے تصفیہ کے لیے ان صوفیاء نے جو وسیلہ اختیار کیا تھا وہ یقینی طور پر علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کا دوسرا نام اور اسی کے مظاہر و برکات سے عوام کے دلوں کو منور کرنے سے عبارت تھا۔

مذکورہ خدمات پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، معقولات اور تصوف میں علماء بہار نے ایسی وقیع تصنیفات پیش کی ہیں، جو نہ صرف ہندوستان کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافے ثابت ہوئے بلکہ ہندوستان سے باہر عرب علماء نے بھی ان کی وقعت کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر والہانہ داد و تحسین پیش کیا اور ان کی تصنیفات پر جا بجا فخر بھی محسوس کیا ہے۔

بہار میں علم حدیث کی ترویج واشاعت کے حوالے سے جن اہم محدثین کا نام لیا جاسکتا ہے ان میں تقریباً سبھی کا سلسلہ حدیث دو عظیم محدثین یعنی مولانا نذیر حسین اور فضل رحمان گنج مرادآبادی یا ان کے اساتذہ سے ملتا ہے۔محدثین کی فہرست میں بہار میں سب سے پہلا نام عظیم آباد کے شیخ ولایت علی ہاشمی صادقپوری (۱۲۶۹م) کا ملتا ہے ان کے بعد ابراہیم نگرنیسوی (م ۱۲۸۳) کا نام آتا ہے۔دونوں حضرات سید احمد شہید کے سلسلہ حدیث سے وابستہ تھے۔ان کے علاوہ نذیر حسین دہلوی اور ان کے تلامذہ میں

مولانا لطف علی راجگیری (م۱۲۹۶) حضرت مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی (۱۳۲۹) مولانا ابراہیم آروی (م۱۳۱۶) مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے سلسلہ سے منسلک محدیثین میں مولانا فضل اللہ رحمانی (م۱۳۸۴) کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

اس کے علاوہ اگر خاص شرح حدیث کے فن کی روشنی میں دیکھا جائے تو بہار میں فن حدیث کی دو کتابوں کی ایسی شرحیں لکھی گئیں جس کی نہ صرف بہار میں بلکہ پورے ہندوستان میں شہرت ہوئی اور عالم اسلام میں بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ان میں پہلی شمس الحق دیانوی کی سنن ابی داود کی شرح ,,غایۃ المقصود وعین المعبود،، ہے اور دوسری مولانا فضل اللہ رحمانی کی الادب المفرد کی شرح ,,فضل اللہ الصمد،، ہے یہی حال فقہ،تصوف اور معقولات وغیرہ کا بھی ہے۔امام بخاری کی ,,الادب المفرد،، حدیث پر ایسی کتاب ہے جو سب سے پہلے ہندوستان میں چھپی اور سب سے پہلی شرح بھی بہار میں لکھی گئی۔اسی طرح بے شمار معرکتہ الآرا کتابیں منظر عام پر آئیں اور خواص میں مقبول ومعروف ہوئیں اور طلباء واساتذہ نے ان کتابوں سے یکساں طور پر فائدہ اٹھایا اور ان کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ان میں سے بے شمار کتابیں مدارس اسلامیہ میں داخل نصاب ہیں۔(۱۳)

صوبہ بہار کی زرخیز مٹی آج بھی ایسے ایسے علماء وادبا پیدا کر رہی ہے، جو علوم عربیہ اور فنون اسلامیہ کے مختلف میدانوں میں اپنی گرانقدر تصنیفات کے ذریعہ علم وادب کی بھرپور خدمات انجام دے رہے ہیں اور اپنے متقدمین کے ذریعہ روشن کئے گئے علم وفن کے چراغ کی لو کو تیز سے تیز کرنے میں مصروف ہیں یہ ایک ایسا عمل ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے اس موجودہ وقت میں بھی ایسے لوگ پائے جارہے ہیں جو قابل صد ستائش ہے۔وہ علماء جو درس وتدریس کے ذریعہ زبان وادب کی خدمت کے لیے ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی شہرت رکھتے ہیں،ان کی تعداد شمار کرنا تو بہت مشکل ہے البتہ جنہوں نے اپنی تصنیفات وتألیفات کے ذریعہ تاریخ میں اپنے نقوش ثبت کئے ہیں ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔

چودہویں صدی ہجری تک کی بہار کی مذہبی، علمی،ادبی اور معاشرتی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مولانا عبدالحی حسنی کی کتاب ,,نزہتہ الخواطر،، بہت اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔اس

وقت جب کہ وسائل بالکل محدود تھے ایسے حالات میں اتنی اہم اور معلومات افزا کتاب تیار کرنا بہت عظیم کارنامہ انجام دینا ہے۔ یہ کتاب متحدہ ہندوستان کے ان علماء ومشائخ اور مشاہیر کا تذکرہ ہے جنہوں نے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں بیٹھ کر علوم عربیہ اسلامیہ کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔اس میں جابجا بہار کے صوفیوں، عالموں اور مشہور لوگوں کے احوال وکوائف ملتے ہیں جس سے یہاں کی علمی وادبی فضا پر بھر پور روشنی پڑتی ہے۔اس میں شامل بہت سے صاحب تراجم کی تصنیف کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ بہار عہد ماضی میں اور برٹش عہد میں بھی منبع علم وعرفان رہا ہے۔اور یہاں کے چشمئہ لازوال سے صدہا نفوس سیراب بھی ہوئے ہیں۔ان اہم اور قابل ذکر خطوں میں عظیم آباد، پھلواری شریف، دیسنہ،مونگیر، نالندہ وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کا تعلق بھی اسی بابرکت سرزمین اور علمی وابدی خانوادے سے ہے۔

ان کے جد امجد حضرت ملک عبدالرزاق اشرفی اپنی دینداری اور ریاضت ومجاہدے کی وجہ سے پورے علاقے میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔حضرت سلطان اشرف جہانگیر سمنانی کی اولاد میں ایک بزرگ غلام رسول گزرے ہیں ان کے خلیفہ بیتھو شریف (ضلع) گیا کے شاہ چاند صاحب تھے۔ یہی ملک الرزاق کے پیر ومرشد تھے۔ ملک صاحب اپنی بہت مختصر جاگیر اور کاشت پر، جو مغل بادشاہوں کے عہد میں فوجی خدمات کے صلے میں ان کے بزرگوں کو ملی تھی قانع رہے۔وہ فارسی کے دبیر تھے۔ان کی خوشنویسی کے کچھ نمونے اب بھی خاندان میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر مختار الدین آرزو کی پیدائش اسی خانوادے میں ہوئی ۔آپ کے والد ماجد ملک العلما مولانا ظفر الدین صاحب قادری (متوفی ۱۹۶۳) ہندوستان کے بڑے جید اور متبحر عالموں اور مقتدر مصنفوں میں گزرے ہیں۔ان کی پوری زندگی تعلیم و ہدایت اور تصنیف وتالیف میں گزری۔تصنیف وتالیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد بتائی جاتی ہے اوران کے تلامذہ ومسترشدین کی تعداد براعظم میں ہزاروں تک پہنچتی ہیں۔(۱۴)

حقیقت تو یہ ہے کہ شخصیت کی تعمیر وترقی میں گردو پیش کے حالات،گھر کا اچھا ماحول، صاف ستھری فضا، مہذب معاشرہ اور بہتر تعلیم وتربیت بہت اثر انداز ہوتی ہے اور جب قدرت کسی سے کوئی کام

لینا چاہتی ہے تو حالات بھی اس کے موافق ہو جاتے ہیں اور پھر سارے کام خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ۔ آپ نے ایک نہایت دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے علمی، ادبی اور دینی فضا میسر ہوئی جس نے آپ کی شخصیت کو چار چاند لگا دیا اور آپ ترقی کے اعلی منازل طے کرتے رہے ۔ آپ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں ۔

''میرے والد صاحب ہندوستان کے مشہور علماء میں شمار کئے جاتے ہیں جلیل القدر مصنف تھے ۔ تعداد تصانیف ۱۰۰ر سے زائد ہیں ۔ میرے پھوپھا مولوی کبیر احمد مسلک اعلی حضرت سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کی ایک کتاب انھوں نے اپنے پیسے سے شائع کروائی ۔ میرے حقیقی ماموں مولوی رئیس احمد استھانوی مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل تھے ۔ وہ مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد ضلع پٹنہ میں مدتوں حدیث و تفسیر کا درس دیتے رہے ۔ میرے برادر نسبتی مولانا سید ریاض الحق صاحب مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی کے تعلیم یافتہ تھے وہ مدرسہ حنفیہ کٹیہار ضلع پورنیہ میں مدت العمر درس دیتے رہے ۔''
(۱۵)

پروفیسر مختار الدین آرزو کا شمار یقینی طور پر دنیا کے ایک ممتاز اسکالر میں ہوتا ہے آپ کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع و عریض ہے اردو، عربی، فارسی زبانوں پر آپ کی خدمات محیط ہیں اور ہر طبقے کے اہل علم میں آپ کے کارناموں کو بڑی توجہ اور فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا گیا ہے ۔ بین الاقوامی شہرت کی حامل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جہاں ایک طرف عالم اسلام کے مایۂ ناز محقق و جید عالم علامہ عبد العزیز میمنی کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں وہیں دوسری طرف انگلستان میں آکسفورڈ یونیورسٹی جیسی عظیم درسگاہ کے اہم عالم پروفیسر گب کی رہنمائی میں انھوں نے اپنے علمی اور تحقیقی کاناموں کو جاری و ساری رکھا ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی، فل کی ڈگری لینے میں کامیاب ہوئے ۔ اس کے علاوہ مدرسہ شمس الہدی میں ان کے عہد کے معروف اساتذہ

وقت سے پوری طرح استفادہ کیا مثلاً مولانا سید دیانت حسین دربھنگوی، مولانا ظفر الدین قادری، مولانا سید شاہ عبید اللہ قادری، مولانا عبد الشکور مظفر پوری، مولانا عبد السبحان دیسنوی، حاجی معین الدین ندوی وغیرہ اہم اساتذۂ کرام قابل ذکر ہیں۔

ان کے اساتذہ میں متعدد مکاتب فکر اور مسالک کے علماء تھے مولانا محمد سہیل عثمانی، مولانا اصغر حسین، مولانا عبد الشکور دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور شیخ الہند کے خاص تلامذہ میں تھے۔ مولانا دیانت حسین مدرسہ عالیہ رام پور کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور مولانا محمد طیب عرب مکی اور مولانا فضل حق رام پوری جیسے یکتائے روزگار اساتذہ سے فیضیاب ہونے کی وجہ سے پروفیسر مختار الدین آرزو کو اپنی شخصیت کو سجانے سوارنے، صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کافی مدد ملی اور دنیا نے دیکھا کہ مستقبل میں ان کی نگارشات نے اس کو ثابت کر دیا۔

یورپی ممالک میں قیام کے دوران وہاں کی لائبریریوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور اس طرح اپنا ایک ایک لمحہ ضائع نہ کیا یورپ میں قیام کے دوران وہان کی لائبریریوں سے نادر مخطوطات کی تلاش و جستجو میں لگے رہے اور بالآخر کچھ ایسے اہم و نایاب مخطوطات کی تلاش کر گئے جو بہت اہمیت وافادیت کی حامل ہیں۔ انھیں میں ۱۹۵۵ میں فضلی کی کربل کتھا بھی شامل ہے بلا شبہ یہ ان کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے۔ اس کے تعلق سے انشاء اللہ آگے بحث کی جائے گی۔ اس کے علاوہ متعدد اہم مخطوطات کا یورپ سے پتہ چلایا اور بڑی عرق ریزی سے اس کو ایڈٹ کر کے شائع بھی کرایا اور اس پر اہم مقالہ لکھ کر اس کی اہمیت وافادیت سے لوگوں کو روشناس کرایا جس کا اوروں کو علم تک نہ تھا۔ اور یہ عمل اس وقت کیا جب مخطوطے کی تہذیب و تدوین کافی مشکل ہوا کرتی تھی۔ ہر ایک کے لیے اس میدان میں قدم رکھنا آسان نہ تھا کیونکہ اس وقت مواد ناپید تھے نیز مصادر و مراجع کی فراہمی آج کے مقابلے میں کافی دشوار تھی۔

اس ملک میں جو جید اور بلند پائے کے محققین ہوئے ہیں جیسے قاضی عبد الودود، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر عبد الستار صدیقی، امتیاز علی خان عرشی، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر نثار احمد

فاروقی، رشید حسن خان،، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، عبد القوی دسنوی، عبدالستار دلوی، شمس بدایونی وغیرہ ان سب کے کارنامے بہت وقیع اور قابل رشک ہیں۔ پروفیسر مختار الدین آرزو کا شمار بھی انہیں اہم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ اور جس طرح ان محققین کی بے حد اہم و وقیع نگارشات اپنے آپ میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اسی طرح پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے بھی علمی ادبی خدمات میں اپنی بیش بہا نگارشات سے مالا مال کیا ہے۔ جو صدیوں یاد کیا جاتا رہے گا اور جو یقیناً طلباء اساتذہ اور اسکالروں کے لیے یکساں استفادہ کا باعث ہوگا۔

ان کی تحقیق کا اعلیٰ معیار نہ صرف ان کی مرتب کردہ کتابوں میں ملتا ہے بلکہ ان کی مقالات میں بھی معیار بلند نظر آتا ہے ان کے مقالات کو پڑھ کر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اس قدر اطلاعات بہم پہنچا تے ہیں کے دوسرے اہم پہلو کی بھی معلومات ہو جاتی ہے۔ جس سے قاری کو اس موضوع پر خاصی معلومات فراہم ہوتی ہے، کچھ دوسرے اہم پہلو سے شناسائی ہو جاتی ہے اور مختار الدین آرزو کا یہی وہ وصف ہے جس سے وہ ممتاز نظر آتے ہے اور ان کے معاصرین (ہند و بیرون ہند) انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دراصل تحقیق و تدوین ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اس فن میں کام کرنے کے لیے وسیع مطالعہ، گہرا علم اور مختلف میدانوں اچھی معلومات درکار ہوتی ہے تب یہ کام انجام کو پہنچتا ہے آرزو صاحب میں یہ تمام خوبیاں بدر جہائے اتم موجود تھیں۔

خاص طور پر غالب کے حوالے سے جب بات کی جاتی ہے تو پروفیسر مختار الدین صاحب کا نام بڑے ادب واحترام سے لیا جاتا ہے کیونکہ غالب کے حالات اور خطوط کے سلسلے میں ان کی کاوشیں اور دلچسپیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان کا نام بجا طور پر ماہرین غالبیات کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کی غالب پر کام کرنے والا کوئی نقاد، ان پر تحقیق کرنے والا کوئی اسکالر پروفیسر مختار الدین آرزو کی مرتب کردہ احوال غالب اور نقد غالب اور ان کے مقالات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا بلکہ دوسرے الفاظ میں اس کی تحقیق بغیر ان کتابوں سے رجوع کئے مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ آج موجودہ عہد میں جب کہ تحقیق و تدین کا کام آسان ہو گیا ہے اور لوگوں کا رجحان بھی اس کی طرف زیادہ ہو رہا ہے اس کے باوجود پروفیسر مختار الدین آرزو کا کیا ہوا کام اہمیت وافادیت کا حامل ہے اور علمی دنیا اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

مختارالدین احمد حیات وخدمات

(پیدائش، تعلیم وتربیت، ملازمت)

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کے بزرگوں کا وطن نالندہ اورراجگیر کے درمیان ملک صحبان کا ایک گاؤں میجرا (رسول پور) ہے۔ان کے جدامجد حضرت ملک عبدالرزاق اشرفی اپنی دینداری اور ریاضت و مجاہدے کی وجہ سے پورے گاؤں میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔حضرت سلطان اشرف جہانگیر سمنانی کی اولاد میں ایک بزرگ غلام رسول گزرے ہیں ان کے خلیفہ بیتھو شریف (ضلع) گیا کے شاہ چاند صاحب تھے۔یہی ملک الرزاق کے پیر و مرشد تھے۔ملک صاحب اپنی بہت مختصر جاگیر اور کاشت پر، جو مغل بادشاہوں کے عہد میں فوجی خدمات کے سلسلے میں ان کے بزرگوں کو ملی تھی قانع وشاکر رہے۔وہ فارسی کے دبیر تھے ان کی خوشنویسی کے کچھ نمونے اب بھی خاندان میں مختلف جگہوں پر محفوظ و موجود ہیں۔پروفیسر مختارالدین احمد آرزو صاحب کی پیدائش اسی اہم ومشہور خانوادے میں ہوئی۔(۱)

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں لوگ یومیہ لقمۂ اجل بن رہے ہیں اور مادیت بھرے اس زمانے میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا بڑا سے بڑا غم اور سنگین قسم کی پریشانیوں کو بھی انسان بھلا دیتا ہے مگر کچھ لوگ اپنی اچھائیوں، کارناموں، بے لوث ومختلف النوع خدمات، خلوص ومحبت اور نیک نیتی کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے ہیں اوران کے کئے ہوئے کام بھی دوسروں کے لیے ایک اچھا نمونہ اور مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔اور یہ اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے مال ودولت اور زروجواہرات کے انبار چھوڑا ہے بلکہ وہ اپنی علمی وادبی سرگرمیوں، تصنیف وتالیف، تدوین وتحقیق، ترجمہ وتلخیص، نیز مختلف النوع علمی،

ادبی،تہذیبی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی ہمیشہ عزت واحترام سے یاد کئے جاتے ہیں کچھ ایسا ہی حال پروفیسر مختارالدین آرزو کا بھی تھا جو ہمیشہ دوسروں کی فلاح و بہبود، ترقی وخوش حالی اور کامیابی و کامرانی پر خوش ہوتے لوگوں کو اس بابت مہمیز کرتے اوراس سلسلے میں ان کی ہر طرح سے مدد کیا کرتے۔

مختارالدین احمد صاحب کی پیدائش ۱۴ر نومبر ۱۹۲۴ کو پٹنہ میں ہوئی آپ کے والد ملک العلماء مولانا ظفر آپ کے والد ماجد ملک العلما مولانا ظفر الدین صاحب قادری (متوفی ۱۹۶۳) ہندوستان کے بڑے جید اور متبحر عالموں اور مقتدر مصنفوں میں گزرے ہیں۔ان کی پوری زندگی تعلیم و ہدایت اور تصنیف وتالیف میں گزری۔تصنیف وتالیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ جہاں تک ان کے تلامذہ ومسترشدین کی تعداد کا معاملہ ہے تو براعظم میں ہزاروں تک پہنچتی ہیں۔

مختارالدین احمد صاحب کا بچپن ان کے نانیہال موضع استھنواں ضلع پٹنہ (اب نالندہ) میں گزرا۔ خاندانی روایت کے مطابق چار سال چار ماہ چار دن کی عمر میں ایک نیک سیرت اور دیندار بزرگ حضرت حافظ شرف الدین احمد کے ہاتھوں بسم اللہ کی رسم انجام پائی۔اردو کی ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ رابعہ خاتون سے حاصل کی۔قرآن مجید کے ابتدائی چند پارے اپنے نانا محمد واعظ الحق سے پڑھے۔استھانواں کے مکتب کے مدرسوں میں مولانا محمد عمر اور مولوی نعیم الدین تھے۔ابتدائی عمر میں ہی یہ اپنی والدہ کے ہمراہ پٹنہ چلے آئے جہاں ان کے والد ماجد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی میں ہیئت وحدیث کے استاذ تھے۔ یہاں رہ کر چھ سال کی عمر ہی میں قرآن مجید اور مولوی اسماعیل میرٹھی کی لکھی ہوئی اردو کی چوتھی کتاب ختم کر لی تھی۔تجوید وقرأت انہوں نے دو قاریوں سے (قاری بہاء الدین قاری عبدالرحیم) صاحبان سے سیکھی۔ پھر فارسی کی طرف مائل ہوئے اور کریما، گلستان اور فارسی کی دوسری ابتدائی کتابیں مولوی ظہورالدین احمد مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی، پٹنہ سے نجی طور پر پڑھیں۔ان کا ذکر انہوں نے اپنے ایک مضمون ''جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے'' میں کیا ہے۔(۲)

مدرسہ شمس الہدی میں ان کے عہد کے معروف اساتذہ وقت سے پوری طرح استفادہ کیا مثلا

مولانا محمد سہیل عثمانی، مولان محمد حسین بہاری، مولانا سید دیانت حسین در بھنگوی، مولانا ظفر الدین قادری، مولانا سید شاہ عبید اللہ قادری، مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری، مولانا عبدالسبحان دیسنوی، انگریزی انہوں نے ماسٹر سید صفیر الدین احمد سے پڑھی، صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولانا سید عبدالرشید صاحب، فاضل حدیث کے کورس میں بخاری شریف کا درس انہوں نے حاجی معین الدین ندوی سے لیا۔

ان کے استادوں میں متعدد مکاتب فکر اور مسالک فکر کے علماء تھے مولانا محمد سہیل عثمانی، مولانا اصغر حسین، مولانا عبدالشکور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور شیخ الہند کے خاص تلامذہ میں تھے۔ مولانا دیانت حسین مدرسہ عالیہ رام پور کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور مولانا محمد طیب عرب مکی اور مولانا فضل حق رام پوری کے شاگرد تھے اور شاہ بدرالدین پھلواروی کے مریدوں اور عقیدت مندوں میں تھے۔ مولانا شاہ عبید اللہ قادری اجھ شریف کے رہنے والے تھے اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولادوں میں تھے۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے بزرگوں میں قرابت قریبہ رکھتے تھے اس کے علاوہ سید عبدالسبحان دیسنوی، اور حاجی سید معین الدین ندوی دارالعلوم ندوہ العلماء لکھنؤ کے تعلیم یافتہ تھے انہیں مکاتب فکر اور مختلف مسالک کے حامل اساتذہ کرام کی صحبت کا اثر تھا آپ مذہبی رواداری اور مسلکی معمولات میں معتدل تھے اور کبھی بھی مسلکی معاملات میں شدت نہیں دکھائی دیتی تھی اور ہر مسئلہ کو بڑی آسانی سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مدرسے کی دینی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کے والد بزرگوار نے اپنی وسیع النظری اور وسیع المشربی کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کو عصری علوم وفنون کے حصول کی طرف راغب کیا۔ اس طریقۂ تعلیم میں بھی آپ نے اپنی ذہانت وفطانت سے پچھلے علوم دس سالہ انگریزی کورس کو بطور پرائیویٹ دو سال میں مکمل کر کے گیارہویں کی تعلیم کے لیے ۱۹۴۱ میں ہائی اسکول پٹنہ میں داخلہ لیا اور اگلے سال اچھے نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۳ میں وہ علی گڑھ میں داخلہ لیا یہاں سے ۱۹۴۵ میں انٹر اور ۱۹۴۷ میں بی، اے کیا۔ مولانا عبدالعزیز میمنی صاحب کے مشورہ پر انہوں نے ایم، اے عربی میں داخلہ

لیا۔ ۱۹۴۹ء میں ایم ،اے کیا اور امتحان میں اول آئے۔ اور ریسرچ کرنے کے لیے شعبہ کا وظیفہ انہوں نے حاصل کیا۔

حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ میں عربی فارسی کتبہ شناس کی ایک پوسٹ کے اعلان پر آپ نے درخواست دی۔ اس محکمے کے ناظم سید اشرف علی چاہتے تھے کہ پروفیسر مختار الدین آرزو ان کے محکمے میں چلے آئیں اور ابھی پروفیسر مختار الدین آرزو کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اسی دوران پروفیسر محمد زاہد صدیقی صدر شعبہ عربی و فارسی و ثقافت اسلامی، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے یونیورسٹی میں علمی تحقیقات کرنے اور ایشیاٹک سوسائٹی سے ۵۰ /روپیہ کی فیلوشپ کی بھی پیشکش آئی۔ اسی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تھے۔ وہ پروفیسر مختار الدین آرزو جیسے در بے بہا کو اپنے یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے عزیز الدین احمد بلگرامی، اس وقت کے ٹریژار مسلم یونیورسٹی سے مشورہ کرکے ایک نئی جگہ قائم کر کے لٹن لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کی سربراہی پروفیسر مختار الدین آرزو کے سپرد کر دی۔ اس کام کے لیے ۱۱۰ /روپیہ ماہانہ منظور ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ شعبۂ عربی کا ۵۰/ روپیہ ماہوار الگ سے۔ ان دنوں آپ صبح سے دوپہر تک شعبہ مخطوطات میں کام کرتے تھے اور سہ پہر اور شب کو اپنا ریسرچ کا کام کرتے اور اس طرح دونوں کام بحسن وخوبی انجام پاتے رہے۔

علامہ عبدالعزیز میمنی صاحب کی نگرانی میں آپ ساتویں صدی ہجری کے ایک عراقی مصنف کے ایک نادر مجموعۂ شعری کی تصحیح وتہذیب اور اس کے تحشیے میں مصروف ہو گئے۔ اور اس مخطوطے کے قدیم نسخے قاہرہ اور استنبول میں محفوظ تھے۔ اور ایک جدید العہد نسخہ علامہ میمن کے پاس بھی محفوظ وموجود تھا۔ کتاب خانے کی ذمہ داری اور دیگر علمی وادبی مصروفیتوں (علی گڑھ میگزین کی ادارت اور اس کے غالب نمبر کی ترتیب وغیرہ) کے باوجود انہوں نے دو سال سے کم کی مدت میں ڈاکٹریٹ کا کام مکمل کر لیا۔ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کے ممتحن مشہور جرمن مستشرق واسکالر پروفیسر فریٹس کرینکو (کیمبرج) تھے جو ان کی علمی وادبی کاموں سے بہت متأثر ہوئے اور خود انہوں نے پروفیسر ہیلمٹ رٹر فرینکفر کو لکھا کہ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کا یہ مقالہ جرمن اورینٹل سوسائٹی کی طرف سے شائع کیا جائے۔

۱۹۵۲ میں آپ ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ے گئے۔اب وہ ڈاکٹریٹ کے بعد اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے لائبریری میں کام کرنے لگے۔جنوری ۱۹۵۳ء میں ذاکر صاحب کے تعاون سے یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ڈاکٹر عبدالصمد صاحب نے ایک لکچرر کی جگہ قائم کرکے آپ کا تقرر کرایا ڈاکٹر عبدالستار (الہ آباد) سلکشن کمیٹی میں تشریف لائے ہوئے تھے۔محمد یوسف کوکن بھی جو بعد میں مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ بھی ہوئے جن کی کی کتابیں بہت معرکۃ الآرا ہیں اور اپنے وقت کے بڑے جید اور متبحر عالم میں اس کا شمار ہوتا ہے یہ بھی اس انٹرویو میں امیدوار کی حیثیت سے شریک تھے۔سب کی خواہش تھی کہ پروفیسر مختارالدین آرزو یہاں سے نہ جائیں۔

۱۹۵۳ کے وسط میں آپ کو ایک سال کے لیے امریکہ کی راکیفلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ تفویض ہوئی جس کے تحت آپ نے شرق اوسط اور انگلستان کا سفر کیا۔اس سے پہلے ڈاکٹر عابد حسین اور سید حسین کو ایک ایک سال کی یہ فیلوشپ مل چکی تھی۔پروفیسر ہملٹن گب کی نگرانی میں Social Criticism in Modern Arabic Literature کے موضوع پر ریسرچ کرنا طے ہوا۔یک سالہ کام کے اختتام پر پروفیسر گب نے انہیں دوتین سال یورپ میں مزید رہ کر علمی کام کرنے کی ہدایت دی اور اس کے لیے انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین اور صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالعلیم کو خط لکھ کر ان کی یک سالہ تعلیمی فرصت میں توسیع کی سفارش کی۔اس سفارش کی بنیاد پر ان کی تعلیمی چھٹی کی توسیع کردی گئی اور وہ یورپ میں رہ کر علمی و ادبی کام میں ہمہ تن مشغول ہو گئے اور اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور رات و دن مطالعہ، پڑھائی میں صرف کرنے لگے۔

پروفیسر گب کے مشرورے پر ساتویں صدی ہجری کے سوریا کے مصنف اور شاعر ''مسلم بن محمود الشیازی'' کی نہایت اہم اور نادر تصنیف ''جمہرۃ الاسلام ذات النش والنطام'' کی تنقیدی تحلیل اور چوتھی صدی ہجری تک کے شعرو مصنفین کی بیحد کمیاب تخلیقات کی ترتیب و تصحیح و تحشیہ ریسرچ کا موضوع قرار پایا۔اس کام کے لیے آپ نے بوڈلین لائبریری میوزیم، برٹش اور انڈیا آفس کے علاوہ انگلستان،

ہالینڈ، جرمنی اور فرانس کے کتب خانوں میں بھی بیٹھ کر کام کرنے کا موقع ملا اور پوری تندہی سے لگ کر فقط پندرہ مہینوں میں اپنا کام مکمل کر لیا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک اہم ریکارڈ ہے۔ قاضی عبدالودود پروفیسر مختارالدین آرزو کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس قدر کم مدت میں شاید ہی کسی شخص نے آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ہو۔ اور یقیناً آج جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام کتنا اہم اور مشکل تھا جسے پروفیسر مختارالدین آرزو نے کتنی آسانی سے کم مدت میں مکمل کر لیا۔

پروفیسر کرینو اگران کے پی، ایچ ڈی کے ممتحن تھے تو پروفیسر آربری صدر شعبہ عربی کیمبرج یونیورسٹی ان کے ممتحن تھے اور وہی ان کا زبانی امتحان لینے کیمبرج سے آکسفورڈ آئے۔ پروفیسر بیسٹن پروفیسر گب کے ہارورڈ چلے جانے کے بعد ان کے سپروائزر ہو گئے اور پروفیسر آر، بری اور اسلامی فلسفے کے ماہر ڈاکٹر رچرڈ والزر کی توجہ سے آکسفورڈ پریس اور پھر لوزک کمیٹی، لندن نے بھی مقالہ شائع کرنا منظور کیا اب یہ الگ بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بعض انتظامی پیچیدگی، خرابی، بے توجہی اور تساہلی کی وجہ سے یہ مقالہ اب تک وہاں سے زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اے کاش کہ یہ کام جلد منظر عام پر آسکے (۳)

مختارالدین آرزو کی خدمات کا اجمالی جائزہ

عربی کے ساتھ ساتھ پروفیسر مختارالدین آرزو کو اردو زبان وادب سے بھی کافی لگاؤ تھا۔عربی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کرنے کے باوجود اردو ادب سے دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہوئی ۔مسلم یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ کا ایک شاندار عام نمبر اور دوسرے سال غالب نمبر مرتب کر کے وہ اپنی علمی و تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے ایک علمی و تحقیقی ''رسالہ المجمع مجلۃ العلمی الہندی'' کے نام سے شائع کیا اور بہت اہم مقالات شائع کیے۔یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران فہرست نمائش مخطوطات ونوادرات کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۵۳ء) اور فہرست احسن مارہروی کلکشن (۱۹۵۵) مرتب کی دونوں فہرستوں پر پروفیسر محمد شفیع نے اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں شائع کیا یہ بہت اہم کام ہے۔اور یقیناً یہ آپ کو کافی دنوں تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

یورپ میں قیام کے دوران آپ نے برسوں مخطوطات کا مطالعہ کیا اور متعدد نادر کتابوں پر مضامین بھی لکھے اور تلاش کر کے نایاب قلمی نسخوں کو ایڈٹ کیا جن میں اول فضلی کی کربل کتھا، جو تقریبا ایک صدی سے مفقود تھی ، دوم حیدر بخش حیدری کا تذکرہ گلشن ہند اور سوم مفتی صدر الدین آرزو کا تذکرہائے اردو۔یہ تینوں کتابیں علی الترتیب ۱۹۶۵۔ ۱۹۶۷،اور ۱۹۷۰ میں شائع ہوئیں۔آپ نے

ہمیشہ اپنا دامن سیاست اور سیاست دانوں سے بچانے کی بہت کوشش کی ہے تاہم یہاں آپکی ملاقات بعض سیاست دانوں سے بھی ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ ادیب اور شاعر تو خود مختار الدین کی برادری کے لوگ ہیں۔اس لیے اس محفل میں ان کی سب سے زیادہ جلوہ نمائی یقیناً قدرتی بات ہے۔آپ کے تأثرات میں اپنے سے زیادہ عمر کے لوگ، ہم عمر، صحافی،مشرقی علوم کے ماہرین فن،سائنس داں ، علمائے کرام ودانشورانے عظام،انگریزی ادب کے استاد،شاگرد،ہم جماعت،اساتذہ،کالم نگار،مؤرخ وغیرہ ہر طرح تقریباً ہر جماعت وملت کے افراد شامل ہیں۔

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو نے جن بزرگوں پر قلم اٹھایا ہے ان میں سرضیاءالدین احمد،مولوی عبدالحق، پروفیسر عبدالعزیز میمن ،ڈاکٹر معظم حسین، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا احسن مارہروی، قاضی عبدالودود، پروفیسر آل احمد سرور،ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مالک رام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔علامۃ الدہر پروفیسر عبدالعزیز میمنی کی نگرانی میں صرف تین اسکالروں نے پی،ایچ ڈی کی تکمیل کی ہے۔ان میں پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کے علاوہ ڈاکٹر سید محمد یوسف اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق شامل ہیں۔ان دونوں پر تو پروفیسر مختارالدین احمد آرزو نے مضامین لکھے ہیں ان کے علاوہ میمنی صاحب کے ایک ممتاز شاگرد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے کارناموں پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے خصوصی احباب میں انہوں نے پروفیسر مسعود حسن، جناب احد فاطمی اور جناب قیوم قائد سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ان میں اگر مسعود صاحب عربی کے عالم تھے تو ثانی الذکر دونوں حضرات سیاست سے سروکار رکھتے تھے۔

ہم عصر ادیبوں،شاعروں،کالم نگاروں اور صحافیوں میں ہمیں جناب جمیل الدین عالی، پروفیسر مسعود حسین خان اور جناب محمد طفیل (مدیر نقوش) سے واقفیت ہوتی ہے سائنس دانوں میں ڈاکٹر ذکی الدین ، ڈاکٹر احمد شفیق،اور انگریزی کے استاد جناب محمد عثمانی کی طرف ہماری توجہ منذول کرتے ہیں۔غیر ملکی اسکالروں میں اگر ہم ایک طرف مصر کے نامور مصنف اور ادیب ڈاکٹر احمد امین سے شناسا

ہوتے ہیں تو دوسری طرف آکسفورڈ کے ممتاز مستشرق ڈاکٹر سیمویل اسٹرن، پروفیسر کابلے، اوران کے جوانمرگ بیٹے پال سے متعلق فاضل مضمون نگار کے تأثرات سے ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے اوراس سب پر مستزاد ہیں ہمارے ممدوح کی خود کلامی اپنے ماضی کی یادیں۔ یہاں ہم نے ان اشخاص کے بارے میں پروفیسر احمد کے تأثرات سے صرف نظر کیا ہے جن کا ذکر انہوں نے کسی اور مضمون میں ضمناً کیا ہے۔ مثلاً معصوم علی ترمذی، عرفان حبیب، متین الزماں زبیری، بکرما جیت حسرت، محمد یعقوب، سید عبدالعزیز ، برہان الدین وغیرہ۔

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے بعض حضرات کے خطوط شائع کیے ہیں اور خطوط سے قبل اپنے مزاج اور طریقۂ کار کے مطابق ان کے تفصیلی حالات درج کر دئے ہیں۔ ان حضرات میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر احتشام حسین، اختر میاں جوناگڑھی، مولانا امتیاز علی عرشی، انجم اعظمی، جناب حمید احمد خاں، ڈاکٹر ممتاز حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر شوکت سبزواری، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پروفیسر نظیر صدیقی، اور سید محمد حسین جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ استاد محمد کرد علی، ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس، ڈاکٹر میشیل الخوری، پروفیسر آصف علی اصغر فیضی، پروفیسر عبد العزیز میمن، ڈاکٹر عبدالمعید خان، شیخ محمد یوسف بنوری جیسے اہم ترین اساطین علم وادب کے حالات پر مشتمل ہیں۔

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کے ان مضامین کو ان معنی میں خاکے یا مرقعے نہیں کہا جاسکتا جن معنی میں مثلاً مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' یا پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ''گنجہائے گراں مایہ اور ''ہم نفسان رفتہ'' کو کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کے لیے زیادہ مناسب اصطلاح سوانحی مضامین ہی ہوگی۔ ان مضامین کی امتیازی خصوصیت معلومات کا وہ ذخیرہ ہے جو پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے اپنے ممدوحین کے بارے میں قارئین کو مہیا کر دیتے ہیں۔ تاہم ان مضامین میں ایک اچھے خاکے کی

خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ان کے ضمن میں قاضی عبد الودود، محمد طفیل صاحب، جمیل الدین عالی، احد فاطمی، قیوم قائد، سید محمد حسنین، اور نظیر صدیقی صاحب سے متعلق فاضل مضمون نگار کے رشحات قلم کا خصوصیت سے ذکر کر سکتے ہیں۔ ان کے قلم سے محمد طفیل کی ایک جھلک دیکھئے:

''ایک شب طفیل صاحب نے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا طفیل صاحب خود گفتگو نہ کر کے اپنی طاقت بچاتے رہے لیکن اپنی مسکراہٹ، دل نوازی اور مختصر فقروں سے ہماری تواضع کرتے رہے۔ رحیم گل کا ایک مضمون طفیل صاحب کے خلاف میں نے کہیں پڑھا تھا۔ انہیں اس بزم خاص میں دیکھ کر کچھ تعجب ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی طفیل صاحب کی دل نوازی کا ایک کرشمہ ہے'' [۴]

یا پھر عالی کے بارے میں یہ ملاحظہ فرمائیں:

''عالی بہت بڑے سیاح ہیں۔ یہ اپنے عہد کے مارکو پولو اور کولمبس ہیں بلکہ اس لحاظ سے ان سے بھی ممتاز کہ ان بندوں نے دنیا کے اتنے ممالک اور بعض ممالک اتنی بار نہیں دیکھے جتنے اور جتنی بار عالی نے دیکھے، پھر ان دونوں سیاحوں نے آئس لینڈ اور ہماری دلی کہاں دیکھی تھی۔ عالی نے نئی دلی بھی دیکھی اور پرانی دلی کی گلی کوچے کی سیر بھی کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے شہر دلی، جو عروس البلاد ہے، بڑی عجلت اور کچھ بے دلی سے دیکھی اور یہاں سے وہ سرسری طور پر گزر گئے''

''اس آئینہ میں محترم قیوم قائد کی شبیہ بھی کیا خوب عمدہ اور بہتر نظر آتی ہے اور وہ اس طرح ہمارے سامنے ہوتی ہے چھوٹے قد کے بڑے تن درست سے آدمی، سرخ رو اور سفید رنگ والے، آنکھیں عزم سے بھرپور، قد کھدر کا کرتا پائجامہ، موسم سرما میں جواہر صدری بھی زیب تن ہوتی ہے۔ سردی بھی زیب تن ہوتی ہے۔ سردی زیادہ ہوئی تو گاندھی کیپ اوڑھ لیں گے، کہیں عوام میں تقریر کرنی ہو تو سبھاش چادر کا اضافہ ہو جائے گا۔ پاؤں میں ہمیشہ پشاوری چپل، سیدھے ہاتھ میں پورٹ فولیو جس میں کاغزات کے

علاوہ کبھی کبھی ایک آدھ جوڑی کپڑے کے علاوہ برش ، پیسٹ ، کنگھا، وغیرہ
بھی شامل ہوجاتا ہے۔الٹے ہاتھ میں کیپسٹن کاٹن،لبوں کے ایک گوشے
پرخفیف سی مسکراہٹ ، دوسرے گوشے میں سگریٹ دبی ہوئی ۔ یہ یہیں پر
سلگتی ہےاور یہیں پر خاکستر بھی ہوجاتی ہے'' ۵

احد فاطمی کا بھی ساتھ ہی ساتھ جلوہ دیکھیں اور بھرپور لطف اٹھائین اور مختار کے اسلوب نگارش کی داد بھی دیں۔

''ان کا جسم کمزور تھا اور صحت غیر مستقیم لیکن ان کی ہمت و حوصلہ کافی بلند اور
عزم مضبوط ۔ وہ بار بار اسپتال جاتے اور چند دنوں یا ہفتوں میں تن درست
اور صحت یاب ہو کر چاق و چوبند ہو کر واپس آجاتے اور پھر اپنے روزمرہ
کے معمولات و مشاغل میں بدستور تندہی سے لگ جاتے ۔ میں مختلف مواقع
پر پٹنہ میڈیکل کالج ان کی عیادت کے لیے گیا انہیں کبھی تنہا نہیں پایا۔ یا تو
نرسوں سے چہلیں ہو رہی ہیں یا پھر مریضوں سے مزاج پرسی ۔کبھی دیکھا کہ
چوتھے گریڈ کے ملازموں سے ان کی شکایتیں اور مطالبات سن رہے ہیں اور
انہیں کارآمد مشوروں سے بھی نواز رہے ہیں'' ٦

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مضامین کی امتیازی خصوصیت مضمون کے تفصیلی حالات کا احاطہ ہے۔ان میں فاضل مضمون نگار کے بزرگ اور ہم عصر دونوں شامل ہیں ۔ہم عصر اہل علم وادب ، ڈاکٹر معظم حسین ، پروفیسر مسعود حسین ، ڈاکٹر سید محمد یوسف ، ڈاکٹر خورشید احمد فارق ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ، اور پروفیسر مسعود حسن کے حالات ، بالخصوص ان کے علمی و ادبی کارنامے ان سے متعلق مضامین میں مختار الدین آرزو نے نہایت شرح وبسط سے جمع کر دئے ہیں ۔ اگر چہ ان میں سے کسی کا کام ادھورا رہ گیا ہے۔تو اس کی بھی نشاندہی کر دی ہے اور جہاں تک ممکن ہوا خاندانی حالات بھی بیان کر دئے گئے ہیں ۔سید محمد یوسف صاحب اور فارق ان کے خواجہ تاش تو تھے ہی لیکن ان کے استاد بھی رہے ہیں اس لیے اپنے مضمونوں میں انہوں نے ان دونوں کا حفظ مراتب پوری طرح ملحوظ نظر رکھا

ہے۔اب ان مراتب کا خیال کم کیا جاتا ہے سید محمد یوسف صاحب میرے بھی استاد رہے ہیں اور فارق میرے دوست تھے اس لیے کئی جگہ فاضل مقالہ نگار نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کئی جگہ مجھے اپنا ذاتی تجربہ محسوس ہوتا ہے۔

یہ کسی مصنف کی خوبیٔ تحریر شمار ہوتی ہے کہ قاری کو اپنے مشاہدات و تجربات میں شامل کرے اور قاری کہہ اٹھے میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔سید محمد یوسف کے پڑھانے کا اندازو علمی انکسار اور ان کا ذوق علمی اس طرح بیان ہوا ہے کہ اپنے ہی دل کی آواز کا احساس ہوتا ہے۔فارق کا اور میرا ساتھ ایک سال قاہرہ میں رہا تھا،مختار الدین آرزو نے اپنے مضمون میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس دوران فارق صاحب کے بارے میں میرے جو تأثرات مرتب ہوئے تھے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کے مضمون میں کی جھلک بہت کم ہے۔شاید اس لیے کہ پروفیسر مختار الدین آرزو کے مضمون میں ان کی جھلک بہت کم ہے۔شاید اس لیے کہ پروفیسر مختار الدین آرزو انہیں استاد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور میں ایک دوست کی حیثیت سے تاہم اس مضمون میں فارق کی تصویر کشی خوب صورت انداز میں ہوئی ہے۔ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''فارق صاحب سے برسوں ملنا نہ ہو سکا۔وہ بہت کم آمیز تھے۔گفتگو میں خود پہل کرتے تھے۔کسی نے کچھ پوچھا تو آنکھیں بند کر کے دو ایک جملے میں جواب دیا اور پھر خاموش ہو گئے۔میں نے انہیں بتایا کہ علی گڑھ آنے سے پہلے پٹنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ زیاد بن ابیہ پر کام کر رہے ہیں۔ خاموش رہے۔نہ پوچھا کہ کس نے کہا اور نہ کسی قسم کی خوشی یا دلچسپی کا انہوں نے اظہار کیا۔'' ؎

بلوچ صاحب کسی وجہ سے میمن صاحب کی نگرانی میں اپنا پی،ایچ،ڈی کا کام مکمل نہیں کر سکے تھے۔مختار الدین آرزو نے اپنے مضمون میں اس کے اسباب تو بتائے ہیں لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے ان کے علاوہ اور اسباب بھی ضرور رہے ہوں گے ورنہ علامہ میمن جیسے فاضل روزگار کی نگرانی میں ریسرچ

کی تکمیل کے مقابلے میں کسی وزیر یا تدبیر کے مشورے اور اصرار پر کام چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لینا کم سے کم بلوچ صاحب جیسے باذوق، سنجیدہ، اور نسبتاً خوش حال طالب علم کے تناظر میں سمجھنے میں آنے والی بات نہیں ہے۔ بلوچ صاحب میمن صاحب کی زیر نگرانی تو اپنے کام کی تکمیل نہ کر سکے حال آں کہ اپنے علی گڑھ کے دوران قیام وہ میمن صاحب کے بہت قریب ترین لوگوں میں رہے، تاہم انہوں نے مختار الدین کی روایت کے مطابق بعد میں کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) سے تعلیمات میں ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی اور وہ پاکستان واپس آ کر اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے۔

پروفیسر مختار الدین آرزو نے جن بزرگوں اور اپنے ہم عصروں پر قلم اٹھایا ہے ہم ان کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جن کے وہ زیادہ قریب رہے ہیں، یا وہ جنہیں انہوں نے زیادہ قریب سے دیکھا ہے اور ان سے متأثر ہوئے ہیں۔ ان بزرگوں میں ہمیں قاضی عبدالودود اور مالک رام سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان حضرات میں تیسرا نام ان کے ایک سینئر معاصر شرف عالم آرزو جلیلی کا لیا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب سے پروفیسر مختار الدین آرزو کے جذباتی اور ذہنی رشتے ہیں۔ دونوں ہم وطن بھی ہیں اور ہم ذوق بھی البتہ تحقیق کے معاملے میں قاضی صاحب کی حیثیت راہ نما کی اور پروفیسر مختار الدین آرزو کی ایک متبع کی معلوم ہوتی ہے حال ہی میں ان دونوں کے طریقۂ کار اور اسلوب نگارش میں ہمیں بین فرق نظر آتا ہے۔ شاد عظیم آبادی کے ایک معروف شاگرد شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی نے ایک مضمون مطبوعہ نقوش لاہور میں پروفیسر مختار الدین آرزو کے متعلق یوں لکھا ہے:

"جہاں تک استاد کبیر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کے اسلوب تحریر میں
قاضی صاحب کا نہیں، دراصل مولوی عبدالحق صاحب کا اثر پڑا ہے۔" ۸

مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔ قاضی عبدالودود سے متعلق خاندانی حالات سے بحث کی ہے اور دوسرے میں جو زیادہ تفصیلی ہے، ان عادات و اطوار اور کردار، علمی و ادبی احوال، اور معیار تحقیق پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک بھرپور مضمون ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ قاضی صاحب کے ساتھ بڑی حد تک

انصاف کرتا ہے۔ اس میں قاضی صاحب کے متعلق بعض شبہات کے بھی رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مالک رام عمر میں پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب سے ضرور بڑے ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے کے تعاون سے بعض علمی کام بھی انجام دئے ہیں ۔لیکن ان دونوں کے باہمی روابط ہمیشہ دوستانہ رہے۔اسی لیے پیش نظر مضمون میں ان خوشگوار مراسم کا اثر پڑھنے والے کو صاف نظر آتا ہے۔

مالک رام سے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب کی پہلی ملاقات اسکندریہ (مصر) میں ہوئی تھی ۱۹۵۳ کا واقعہ ہے جب پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب اعلی تعلیم کے حصول کی غرض سے یوروپ جا رہے تھے۔لیکن غائبانہ ملاقات کئی سال قبل سے تھی۔ان ملاقاتوں اور روابط کا سلسلہ پچاس سال یعنی ۱۹۹۸ سے شروع ہوکر مالک رام کی وفات تک چلتا ہے۔ان کی اصلی نوعیت تو علمی وادبی تھی لیکن انہوں نے ذاتی اور خاندانی مراسم کا رنگ بھی اختیار کر لیا تھا۔علمی میدان میں ان دونوں کا سب سے بڑا مشترک کارنامہ فضلی کی ''کربل کتھا'' کی اشاعت ہے۔اس کی بازیابی، متن کی تیاری، تحشیہ نگاری کا سہرا پروفیسر مختار الدین آرزو کے سر جاتا ہے اور اس کی ترتیب وتہذیب اور مقدمہ نویسی میں دونوں کے دونوں برابر کے شریک ہیں۔اور اس میں دو رائے ہیں کہ ملک رام کی علمی وادبی خدمات خدمات جس سے ادبی دنیا واقف ہے جو ہمارے سامنے ہیں وہ بھی بہت وقیع ہیں اور ہم اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔تحقیق وتدوین میں خاص طور پر۔اور دلچسپ پہلو جو یہاں غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اگر دونوں میں کوئی کسی سے کم یا زیادہ تھا تو یہ راز فاش نہیں ہونے دیا۔ مالک رام صاحب کے بارے میں خود پروفیسر مختار الدین آرزو کے بعض تأثرات آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں پیش ہے۔

> '' آدمی بڑے وضع دار ہیں اور قدیم روایت کے دل دادہ بھی۔ بڑے مروت والے ہیں۔علمی کام ہوں یا دوسرے، جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے وہ دوسروں کو مدد دینے پر تیار رہتے ہیں۔جب بھی انہیں کسی کتاب یا مخطوطے کے عکس کے لیے لکھا ہمیشہ مستعد نظر آئے۔بعض مرتبہ عکس بھی بھجوائے اور قیمت بھی نہ لی۔'' [9]

مالک رام کی نرمی اور مروت کے حوالے سے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے یہ ضرور لکھا ہے ملاحظہ ہو:

''یہی نرمی اور مروت کہیں کہیں ان کے تحقیقی مضامین میں بھی جھلکتی ہے۔
کبھی کبھی ان کی تحقیق پر ان کی فطری نرمی اور دردمندی حاوی آجاتی ہے۔
گویا اس معاملے میں مالک رام صاحب قاضی عبدالودود کی ضد ہیں'' [10]

شرف عالم آرزو جلیلی اگرچہ عمر میں پروفیسر مختار الدین آرزو سے بڑے تھے تاہم محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی مدت کے بعد دونوں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔ پروفیسر مختار الدین آرزو کے مضمون کی روشنی میں جلیلی صاحب کا جو نقش ابھرتا ہے اس میں سب سے چوکھا رنگ ان کے ذاتی مطالعہ کا نظر آتا ہے۔ان کے ساتھ پروفیسر مختار الدین آرزو کا ایک دہلی کا سفر انجمن ترقی اردو کی کل ہند کانفرنس میں شرکت کے لیے دسمبر ۱۹۳۹ میں ہوا تھا۔اس وقت ثانی الذکر لڑکے تھے اور اول الذکر مسن۔اور ایک کالج میں سائنس کے استاد۔لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے اچھے دوست، محسن، اور رفیق سفر ثابت ہوئے، اور جب ہم دونوں کی زندگی کے نشیب و فراز کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے معمولات یومیہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں بزرگوار کی دوستی و رفاقت کا یہ سلسلہ کافی وسیع رہا ہے اور یہ بات زندگی کے مختلف مواقع پر ہمیں دکھائی بھی دیتی ہے۔ یہ رفاقت و دوستی یقیناً ہم سب لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے اور مشعل راہ بھی اور اس سے دوستی کے معیار کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوستی صحیح معنوں میں کہتے کسے ہیں اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔آج کے مادی زمانے میں جہاں بھائی بھائی کا دوست نہیں ہوتا ہے یہاں دوستی کا نام صرف حصول منفعت ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ دوستی اسی طرح ہونی چاہئے۔ ورنہ آج کل کے مادیت بھرے زمانے میں دوستی تو صرف حصول دنیا کے لیے ہوتی ہے اور وقت نکل جانے کے بعد ایک دوسرے کے دکھ درد

میں شرکت بھی مشکل ہو جاتی ہے ۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ تخلص پروفیسر مختار الدین صاحب کا ''آرزو'' ہے چنانچہ معروف جدید شاعر مظہر امام صاحب نے شرف عالم آرزو جلیلی پر جو بیش بہا کتاب تصنیف کی ہے اور جس میں اپنے ممدوح کی ہمہ دانی کو بھر پور خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے اس کا انتساب بجا طور پر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب کے نام کیا ہے یعنی ایک آرزو کے حالات زندگی کا انتساب دوسرے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کے نام۔

جن لوگوں کو پروفیسر مختار الدین آرزو نے دور سے دیکھا ہے یا سنا ہے ان کے بارے میں ان کا علمی بصری نہیں، سماعی ہے ان سے متعلق بھی ان کے بعض مشاہدات یا ادراکات دلچسپ ہیں اور قرین قیاس بھی معلوم ہوتے ہیں ۔ سر ضیاء الدین احمد طویل مدت تک وائس چانسلر رہے ۔ تاہم ان سے پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کی شناسائی دور ہی کی ہو سکتی تھی ۔ عمر اور منصب دونوں کے تفاوت کی بنا پر۔ پھر بھی ضیاء الدین احمد خاصے عوامی آدمی تھے اور ان کے بارے میں علی گڑھ میں واقعات اور لطیفے بھی اتنے مشہور تھے کہ یہاں کا ہر طالب علم ، بالخصوص وہ طالب علم جو کسی لحاظ سے ممتاز ہو، ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہی کر لیتا تھا۔ پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب نے پیش نظر مضمون میں ان سے اپنی جن چار مختصر ملاقاتوں کا حال لکھا ہے ان سے ڈاکٹر صاحب (ضیاء الدین احمد علی گڑھ میں اس لقب سے مشہور تھے) کی دوستی پر اچھی روشنی پڑتی ہے نیز ان کی بعض ان خصوصیت کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ جن کا حوالہ اوپر دیا گیا۔ سونے کے معاملے میں وہ بلاشبہہ بہت با اختیار تھے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ اس قسم کا مشورہ دیتے وہ بھی اتنا ہی با اختیار ہوتا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب فارسی اور اردو زبان کے ممتاز محقق رہے ہیں اور ان کی تحقیق کا دائرہ بھی خاصہ وسیع رہا ہے اس میں اودھ کا شاہی خاندان، تھیٹر، قدیم اردو شعراء کے دواوین اور تاریخ ادب اردو کے علاوہ بعض دوسرے موضوعات شامل ہیں ۔ وہ اپنے علمی مرتبے کے علاوہ ایک نہایت مہذب اور خوش گفتار انسان تھے اگر چہ ان کی خوش گفتاری بسا اوقات ان کی سنجیدگی اور کم گوئی میں

پوشیدہ رہتی تھی۔ پروفیسر مختارالدین آرزو ان کے بارے میں ان کی شخصیت کا بہت دل فریب نقش صفحۂ قرطاس پر مرتسم کیا ہے۔اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

''وہ پہلے تو خاموش اور کم آمیز معلوم ہوئے لیکن گفتگو آگے بڑھی تو ان کی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری کا اندازہ ہوا۔ دل چاہتا تھا کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ اندازہ ہوا کہ جیسی زبان لکھتے ہیں ویسی ہی صاف ستھری، شستہ اور دھلی ہوئی زبان بولتے بھی ہیں۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر کرتے ہیں جیسے بولنے سے پہلے لفظوں کو تول رہے ہوں۔ ان کے انداز میں دل کشی اور گفتگو میں لطافت و شگفتگی تھی۔ نرم لہجے میں اور ایسی دھیمی لے سے باتیں کرتے ہیں جیسے کہیں آہستہ آہستہ ندی بہہ رہی ہو ان کی گفتگو میں سمندر کے طوفان یا تیز دریا کا بہاؤ کا انداز نہیں ہے''

اس عبارت سے جہاں ایک طرف پروفیسر مختارالدین آرزو صاحب کے مشاہدات کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں دوسری طرف پروفیسر مختار الدین آرزو کے حسن انشاء سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔'' [11]

پروفیسر مسعود حسین خان پر فاضل مضمون نگار پروفیسر مختارالدین آرزو کا مضمون پڑھتے ہوئے ہم ان کی طبیعت کے ایک ایسے رجحان سے آشنا ہوئے جو ابھی تک ہماری نظر کے سامنے نہیں آیا تھا۔ اس مضمون سے پروفیسر مختارالدین آرزو کے مزاج کے ناقدانہ پہلو اور ان کی قلم کی دراکی ہمیں آگاہی ہو جاتی ہے جو بلاشبہ اپنے آپ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پروفیسر مسعود حسین سے پروفیسر مختارالدین آرزو کے مراسم گوناگوں ایک نوعیت کے رہے اور ان میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ تا آن کہ وہ مسعود حسین خان کئی برس تک جامعہ اردو کے پرووائس چانسلر رہے۔ زیرنظر میں جہاں ان مراسم کی داستان بیان ہوئی ہے۔ وہاں پروفیسر مختارالدین آرزو کے مزاج کے مطابق مسعود حسین خان کے خاندانی حالات بھی خاصی تفصیل سے بیان ہو گئے ہیں۔

پروفیسر مختارالدین آرزو نے پروفیسر مسعود حسین کی خوبیوں کا برملا اعتراف کیا ہے، ان کی

لسانیات سے اردو ادب وشاعری کی طرف مراجعت کو فال نیک قرار دیا ہے اور خود لسانیات میں ان کے کارناموں کی دل کھول کر داد دی ہے ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں کہیں اختلافات کا پہلو نکلتا ہے وہاں بھی پروفیسر مختارالدین آرزو کے قلم کی شرافت نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے اور نہ کسی بھی درجے میں دل آزاری کے مرتکب ہوئے ہیں بلکہ کہیں راست حملہ بھی کیا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے بس صرف اشاروں کنایوں میں ہی کہا گیا ہے۔

ڈاکٹر احمد امین کسی ایسے شخص کے لیے محتاج تعارف نہیں ہیں جسے عربی ادب سے شد بد بھی ہے۔ ان کی کئی تصانیف وتالیف بعض دوسری زبانوں (بشمولیت اردو) میں بھی شائع ہو کر داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ پر ان کا کام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کی خود نوشت ''حیاتی'' حقیقت نگاری اور حسن انشاء دونوں لحاظ ست ممتاز ہے۔ پروفیسر مختارالدین آرزو ان کی علمیت اور اس سے بھی زیادہ ان کے اسلوب میں ان کے بہت قائل اور مداح ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۳ء میں یوروپ جاتے ہوئے قاہرہ میں ان سے ملاقاتیں کیں اور ان کے خیالات سے مستفید بھی ہوئے۔ اس وقت احمد امین اپنی عمر کے آخری دور سے گزر رہے تھے اور بہت کمزور ہو چکے تھے۔ یہ ذکر زیر نظر مضمون میں پروفیسر مختارالدین آرزو نے بھی کیا ہے۔ تاہم یہ دو مختصر سی ملاقاتوں میں انہوں نے احمد امین کے بارے میں خاصی مفید معلومات حاصل کر لیں ہیں جو عام طور پر لوگ کئی ملاقات میں بھی حاصل نہیں کر پاتے ہیں دراصل ہر ایک کی اپنی اپنی اپروچ ہوتی ہے اور وہ اسی کے اعتبار سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے کچھ ایسا ہی مختارالدین آرزو نے کیا۔

پروفیسر مختارالدین آرزو نے جب یہ سفر بذریعۂ ہوائی جہاز طے کیا تو احمد امین نے جو جواب دیا اور اپنے ماضی کا جو تأثر بیان کیا اس کا ذکر خوبصورتی سی پیش کیا گیا ہے عجیب سی چاشنی کا احساس ہوتا ہے میں یہاں پر اس کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

''افسوس تم سمندر کے لطف سے محروم رہے۔ سمندر کے سفر میں جو بات ہے

> وہ ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر میں ممکن ہی نہیں۔سمندر سے مجھے بچپن سے ہی
> عشق رہا ہے۔سمندر کے حسن سے پہلی بار مجھے اسکندریہ میں شاد کام ہونے
> کا موقع حاصل ہوا۔فرصت کے وقت میرا بہترین مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ سمندر
> چلا جاتا اور گھنٹوں موجوں کے زیر و بم کے نظارے سے مجھے ایک خاص قسم
> کا سرور حاصل رہتا'' ۱۲؎

ڈاکٹر سیمویل اسٹرن پروفیسر مختار الدین آرزو کے آکسفورڈ کے ہم عصر اور گہرے دوست اور خواجہ تاش (پروفیسر گب کے شاگرد) تھے۔وہ اگرچہ عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن تعلقات دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے۔ڈاکٹر اسٹرن سے ان کے تعلقات آکسفورڈ سے واپسی کے بعد بھی انکی وفات تک قائم رہے۔انہوں نے ان کی وفات پر اپنے مختصر مضمون میں ڈاکٹر اسٹرن کی شخصیت اور ان کے حالات و اطوار، بالخصوص ان کے علمی ذوق کی بہت اچھی اور دل فریب نقش آرائی کی ہے۔اس آخر الذکر وصف میں خود پروفیسر مختار الدین آرزو ان کے شرک و سہیم تھے۔پروفیسر مختار الدین آرزو کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اسٹرن ہسپانوی شاعری کی تاریخ کے ہر موڑ سے واقف تھے۔اور اس کی وجہ ان کی عبرانیت، عربی اور رومانی ادب سے گہری واقفیت تھی جس کی وجہ سے اس میدان میں انہوں نے نہایت اعلی تحقیقات کیں اور ان کے نتائج شائع کئے اور پھر اس ضمن میں پروفیسر مختار الدین آرزو نے اپنی عادت کے مطابق ان کے نام کی پوری تفصیل دیدی۔

پروفیسر مختار الدین آرزو جن لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے بارے میں تو تمام ضروری اطلاع بہم پہنچاتے ہی ہیں لیکن جن حضرات کا ضمناً بھی ذکر آجاتا ہے ان کا بھی تعارف بھرپور انداز میں کراتے ہیں اور پڑھنے والے کو پوری واقفیت ہوجاتی ہے۔اور اس طرح مطالعہ کرنے والا بے شمار دیگر اطلاعات سے بھی واقف ہوجاتا ہے جو عام طور پر اور مصنفین یا معاصر لکھنے والوں میں کم نظر آتی ہے۔اور یہ ایک اچھے مصنف کی پہچان بھی ہے۔مثلاً پروفیسر مختار الدین آرزو پٹنہ میں درگاہ ارزاں میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں ان کی ملاقات مولانا احسن مارہروی سے ہوئی۔تو جب پروفیسر مختار الدین

آرزو نے احسن مارہروی پر اپنا مقالہ لکھا تو وہاں جن دیگر اشخاص سے ملاقات ہوئی ان کا ذکر کر دیا اور ایک اچھی اطلاع ہم تک پہنچائی۔ درگاہ کے سجادہ نشیں اور احسن صاحب کے میزبان سید شاہ حامد حسین حامد تھے پروفیسر مختار الدین آرزو کے قلم سے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے آپ میں اہمیت کا حامل ہے ملاحظہ فرمائیں:

''وہ عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے اور بعض متضاد اوصاف وصفات سے بھی متصف تھے۔ ساٹھ سال کی عمر کے تھے۔ ان کے قوی بہت عمدہ۔ پان، حقہ، سگریٹ، چائے غرض کہ تمام مشروبات ومسکرات سے پرہیز کر تے تھے۔ صرف افیون کا شغل فرما لیتے تھے۔ ظاہر ہے اب اگر یہی بات اس طرح لکھتے کہ وہ افیون کے شوقین تھے تو اس طرح کا لطف کہاں پیدا ہوتا اور حملہ بھی تقریباً براہ راست ہو جاتا۔ ۱۳

پروفیسر مختار الدین آرزو نے اپنے استاد محترم پروفیسر عبد العزیز میمن کا حق استادی جس طرح ادا کیا یہ پورے اعتماد کے کہی جا سکتی ہے کہ کوئی اور نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی نے اب تک کیا اور بالخصوص عرب وعجم کے مشاہیر علماء ومحققین کے گراں قدر مقالات پر مشتمل ''مجلۃ المجمع العلمی الہندی'' کے ہزار صفحات پر مشتمل دوشان دار خصوصی شمارے استاد محترم پر مرتب اور شائع کر کے انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اور ایسا کرنے میں جن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کیا ہے اس کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ آج بھی ان خاص شماروں کا مطالبہ ہند و بیرون حتی کے عرب ممالک میں بھی باس خاص شماری کو بڑی اہمیت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اس شمارے کی پزیرائی ہندوستان کے مقابلہ میں بیرون ہند زیادہ ہوئی اور برابر اس کا مطالبہ وہاں سے بھی ہو رہا ہے اور اگر مطالبہ اسی طرح بڑھتا رہا تو شاید اس کے اشاعت ثانی کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔

حقیقت میں پروفیسر عبد العزیز میمنی بین الاقوامی طور پر شہرت و اہمیت کے حامل ہیں ان کی خدمات علی گڑھ میں نا قابل فراموش ہیں خاص طور پر درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کی بابت ان کی جو ہمہ

جہت شخصیت ہے اس کے پیش نظر تو متعدد سیمنار کا انعقاد ہونا چاہیئے تا کہ ان کی مختلف النوع و مختلف الجہات سرگرمیوں کا بھرپور احاطہ کیا جا سکے اور آنے والی نسل بھی ان کے تبحر علمی کا اندازہ کر سکے اور ان کے متنوع پہلو جو ابھی تک مخفی ہیں وہ بھی منظر عام پر آسکیں پروفیسر مختار الدین آرزو کی تحریروں میں بعض جگہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا ذکر ضمنی طور پر آ گیا ہے ان کے بارے میں بات کچھ زیادہ طویل ہوگئی ہے۔لیکن یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔اور ظاہر ہے قاری ایسے موقع پر اپنے مطلب کی بات کو اخذ کرنا خوب اچھی طرح جانتا ہے۔

پروفیسر مختار الدین آرزو کی خودنوشت اپنے بارے میں تین تحریریں ہمارے سامنے ہیں۔مختار الدین آرزو، یادوں کے چراغ، اور جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ پہلے مضمون میں بچپن کی یادیں اور لڑکپن کی باتیں ہیں، ابتدائی تعلیم کا ذکر ہے۔اور بعض بزرگوں اور استادوں کا ذکر بھی ہے۔ پٹنہ کی ادبی محفلوں کی باز یافت ہے جن میں مشاعروں کا حصہ نمایاں ہے۔ اور بعض مشاعروں کی دل چسپ داستان ہے۔ یہاں جن شعراء یا ان کے شاگردوں سے ہم سب تقریباً واقف ہیں۔ان میں شاد عظیم آبادی، کے بعض تلامذہ کچھ دوسرے شعرا مبارک عظیم آبادی، ریاض حسن کاں خیالی، مولانا تمنا عمادی، احسن مارہروی، نوح ناروی اور نظام الدین بلخی کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔

مختارالدین آرزو کی شعرگوئی

مختارالدین آرزو نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں ہرطرف شعروشاعری کا چرچا تھا۔جگہ جگہ وقفے وقفے سے مشاعرے یا شعری نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ ان میں بڑے شوق سے شریک ہوتے۔شاد عظیم آبادی کے کچھ معمر شاگرد اس وقت زندہ تھے۔پھر وہ درگاہ شاہ ارزاں کے قریب رہتے تھے۔ جہاں کے سجادہ نشین اور ان کے خاندان کے اراکین داغ یا نوح ناروی کے شاگرد تھے۔نوح ناروی ،احسن مارہروی اور دوسرے شعراء بھی عظیم آباد تشریف لاتے رہتے تھے۔غرض ان دنوں شعرائے کرام کی وہ کثرت تھی کہ مصرع طرح پر رات بھر شعر پڑھتے جاتے۔پھر بھی کچھ شعرائے کرام پڑھنے سے رہ جاتے یہ ممکن نہ تھا کہ پروفیسر مختارالدین آرزو اس فضا سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے بھی کم سنی ہی میں شعر کہنا شروع کیا۔ان کا شعری ذوق اساتذہ کے دواوین کے مطالعے اور عظیم آباد کے مشاعروں کی بدولت برابر ترقی کرتا رہا۔طلباء مدرسہ شمس الہدی میں بھی شعراء کی کمی نہیں تھی۔ یہ شعری محفلیں جمتیں اور پروفیسر مختارالدین آرزو بہ حیثیت سامع حاضر ہوتے اور محفل سے بھرپور لطف اٹھاتے۔

شمس الہدی مدرسہ میں ان کے ایک سینئر طالب علم عبدالحلیم حسرت تھے جو پروفیسر مختارالدین آرزو کو مولوی کلاسس میں داخلہ کے لیے پرائیویٹ طور پر تیار کررہے تھے اور انہیں عربی کا درس دینے گھر جایا کرتے پروفیسر مختارالدین آرزو ان کی صحبت سے متاثر ہوئے اور غالباً انھیں کی تحریک سے ان کی شعرگوئی کا آغاز ہوا۔سب سے پہلی غزل انھوں نے سائنس کالج پٹنہ کی ''بزم سخن'' کے مشاعرے

میں پڑھی تھی جس کی صدارت پروفیسر حافظ شمس احمد منیری شعبۂ فارسی واردو پٹنہ کالج کر رہے تھے۔کسی مجمع میں شعر سنانے کا یہ ان کا پہلا موقع تھا۔حاضرین میں زیادہ تر سائنس کالج، پٹنہ کالج، اور مدرسہ شمس الہدی کے طلباء تھے۔کچھ ان کے ترنم اور کچھ ان کی کم عمری کی وجہ سے ان کو خوب خوب داد ملی اور ان کا حوصلہ بھی کافی بلند ہوا۔اس کامیابی سے ان کی ہمت بڑھی، اب وہ مشاعروں میں بلا تکلف اپنے اشعار سنانے لگے۔شاعری میں پروفیسر مختار الدین آرزو کے معلم اول عبد الحکیم ارمان تھے اور کبھی کبھی دوسروں سے بھی اصلاح سخن لیتے رہے پروفیسر مختار الدین آرزو نے اپنا تخلص آرزو رکھا دھیرے دھیرے آپ نے شاعری ترک در دی۔ان کے معاصرین کا ماننا ہے کہ اگر پروفیسر مختار الدین آرزو شعر وشاعری میں توجہ مبذول کرے تو ایک اہم شاعر کی حیثیت سے عوام میں مقبول ہوتے۔

جب ہم آرزو کے ابتدائی عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شاعری کے علاوہ افسانوں اور ڈراموں کی طرف بھی آپ کی توجہ ہوئی۔لیکن اس نئے شوق کی حیثیت محض شوق تک ہی محدود رہی، کبھی اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں کی۔دھیرے دھیرے آپ کی توجہ تحقیق وتدوین کی طرف ہوئی۔اور یہ کام تقریباً ترک کر دیا۔ہم ان کی غزل کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں:

ہے تشنگی سے ذروں کی ہستی عذاب میں — کیا رہ کے ہوگئی مے قدح آفتاب میں
لہراتی ہے زلف سیہ ان کی خواب میں — رہتی ہے چشم شوق عجب پیچ و تاب میں
ہے شوق دید لطف تصور سے ہمکنار — عالم سکون کا ہے مرے اضطراب میں

جب کیا باز نظر چشم تماشائی نے — وسعتیں اپنی بڑھادیں تری رعنائی نے
بربط ناز کے ہر تار سے پید ہے لہر — راگ چھیڑا ہے نرالا ترے سودائی کا
اتنی بیگانہ منش کب تھی تجلی تیری — مجھ کو دھوکہ دیا خود میری ہی بینائی نے
سکوں کے نام سے گھبرائے گی عمر رواں میری — قیامت تک نہ کم ہوں، اے خدا بیتابیاں میری
کبھی تو پر اثر ہونگے مرے نالے، فغاں میری — میں چپ سنتا رہونگا، وہ کہینگے داستاں میری

دل بیتاب میرا مخزن اسرار قدرت ہے کلید باب معنی و حقیقت ہے زباں میری

ساقی، کیا لطف تری زلف رسا دیتی ہے رگ انگور کو پر پیچ بنا دیتی ہے
آ کے سوتے ہوئے فتنوں کو جگا دیتی ہے جب بہار آتی ہے کچھ گل ہی کھلا دیتی ہے
ہم اسیری کے لیے آتے ہیں گلشن میں، گلوا یہ قفس ہی کشش تم سے ملا دیتی ہے

نہ مرنے کے وسیلے ہیں نہ جینے کے سہارے بڑی مشکل سے یہ دو چار دن ہم نے گزارے ہیں
عجب انداز سے اس شوخ نے گیسو سنوارے ہیں فلک پر صورت آئینہ حیراں سب ستارے ہیں
ورق بکھرے ہیں شاید مصحف ہستی بسمل کے وگرنہ ہاتھ میں قاتل کے کیوں قرآن کے پارے ہیں

تغیر ہے سرشت دل، جفا پر ہیں یہ بت مائل نبھیں گی کس طرح ان سے وفائے جاوداں میری
پھول توڑے ہیں بہت باغ سے گلچیں نے مگر فصل گل وسعت دامن کی دعا دیتی ہیں
تحمل کا سبق لیتا رہے انساں اگر غم سے خوشی حد سے گزر کر وجہ مرگ ناگہاں کیوں ہو

بہار صحن گلشن کب رہیں آتش گل ہے چمن کی داستاں کیا داستاں سوز بلبل ہے
بت آتش لقا کے عارض گلگوں پہ کاکل ہے کہ صبح نو پروردہ اسیر شام سنبل ہے
مجھے ڈر ہے، صدا دونوں کی آپس میں نہ ٹکر ہو ادھر ہیں شیخ کے نعرے، ادھر آواز قلقل ہے

گلرویوں سے الفت کرتی تھے، تقدیر میں رسوا ہونا تھا
ہر دل میں کھٹکنا تھا مجھ کو، ہو آنکھ میں کانٹا ہو نا تھا
مجنوں کی دعا میں کم سے کم، یا رب، اثر اتنا ہونا تھا
ہر ذرے کو محمل ہونا تھا، ہر جلوے کو لیلا ہونا تھا

اہل وعیال

مختارالدین آرزو کا رشتہ بچپن میں ہی ان کی خالہ نجم النساء بیگم کی چھوٹی صاحبزادی ناظمہ بیگم سے طے ہوگیا تھا۔ جب علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے تبھی ۱۹۴۵ میں ان کی خالہ زاد بہن ناظمہ بیگم سے ان کی شادی ہوگئی حالاں نکہ احباب واقارب نے ان کے والد سے اس رشتہ کے تعلق سے کافی خدشات کا اظہار کیا۔ وہ اس طرح کہ شادی کے بعد لڑکے کی پڑھائی میں خلل پیدا ہو جائیگا ۔ان کے والد بزرگوار نے کسی بات کی طرف توجہ نہ کی بلکہ یہ کہہ دیا کہ شادی کے بعد بھی اس کی تعلیم جاری رہی گی ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا شادی ہوگئی اور پروفیسر مختارالدین آرزو کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھائی بھی جاری رہی۔آپ کے بفضل خدا چار بچے ہیں ۔ بڑے بیٹے ڈاکٹر طارق مختار ایم ،اے،ایم فل (عربی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔اور مادرعلمی علی گڑھ مسلم کے شعبۂ عربی میں ریڈر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں ۔ان کے چھوٹے بیٹے ،اقبال احمد ملک نے بی ،کام کے بعد اسلامیات میں ایم ،اے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔آپ کی بڑی بیٹی یاسمین مختار ،علی گڑھ سے ایم ،اے کیا ہے ۔ یاسمیں کے شوہر ہندوستان کے معروف ومشہور فکشن نگار پروفیسر طارق چھتاری ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ہیں۔آپ کی نگارشات بے حد وقیع ہیں ۔ دوسری بیٹی فریدہ مختار ایم ،اے کیا اس کے علاوہ انہوں نے بی ،لب بھی کیا۔اورآج کل مولانا آزاد لائبریری میں ملازم ہیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ پروفیسر مختارالدین آرزو کے چاروں بچے اسلامیات میں ایم ،اے کیا ہے۔

انعامات واعزازات

مختارالدین احمد آرزو کے مجموعی کارناموں ہمہ جہت خدمات نیز علم وادب کے فروغ اوراس کی آبیاری جو جواہم رول آپ نے ادا کیا ہے ان سب کے اعتراف میں متعدد اکیڈمیوں واداروں کی طرف سے مختلف انعامات دیئے گئے ہیں۔

(۱) میرا کیڈمی لکھنؤ سے میرایوارڈ ۱۹۶۵

(۲) غالب انسٹی ٹیوٹ سے غالب ایوارڈ برائے اردو فارسی تحقیق ۱۹۸۳

(۳) صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی زبان وادب کی تحقیق پر ملک کے اہم اعزاز و سرٹیفکٹ آف آنر سے ۱۹۷۹ء مین نوازا گیا۔

اس کے علاوہ عرب دنیا کے حسب ذیل اداروں نے انہیں اپنا رکن منتخب کیا۔

(۱) مجمع اللغۃ العربیۃ الأردنی، عمان ۱۹۸۰

(۲) جمعیۃ العالمیۃ لأحیاء التراث الاسلامی، قاہرہ مصر ۱۹۸۴

(۳) مجمع البحوث الحضارۃ الاسلامیۃ، عمان ۱۹۸۱

(۴) مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق (سوریا) ۱۹۸۵

وہ کئی برس انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے رکن رہے۔ کئی برسوں سے جامعہ اردو علی گڑھ کی مجلس عام اور مجلس منتظمہ کے رکن رہے چند ایام اس کے نائب شیخ الجامعہ بھی رہے۔ بہار میں مولانا مظہر الحق اردو فارسی کا جب قیام عمل میں آیا تو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر بھی بنائے گئے۔ دس سال تک

ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی کے جنرل کونسل اور مشاورتی بورڈ کے رکن بھی رہے۔علاوہ ازیں ہندو بیرون کے مختلف اداروں/اکیڈمیوں مدارس/مکاتب کے بھی ممبر رہے اور حسب ضرورت پوری زندگی نیک مشوروں اور مفید باتوں سے نوازتے رہے۔دراصل ان سب باتوں میں ان کے تبحر علمی، تجربات و مشاہدات، علمی وادبی اسفار (مصر، سعودی عربیہ، لندن، بریطانیہ، امریکہ، جرمن وغیرہ) کا بھی دخل تھا۔

مختارالدین آرزو کی خودنوشت اپنے بارے میں تین تحریریں ہمارے سامنے ہیں۔مختارالدین آرزو، یادوں کے چرغ، اور جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ پہلے مضمون میں بچپن کی یادیں اور لڑکپن کی باتیں ہیں، ابتدائی تعلیم کا ذکر ہے۔اور بعض بزرگوں اور استادوں کا ذکر بھی ہے۔ پٹنہ کی ادبی محفلوں کی بازیافت ہے جن میں مشاعروں کا حصہ نمایاں ہے۔اور بعض مشاعروں کی دل چسپ داستان ہے۔ یہاں جن شعراء یا ان کے شاگردوں سے ہم سب تقریباً واقف ہیں۔ان میں شاد عظیم آبادی، کے بعض تلامذہ کچھ دوسرے شعرا مبارک عظیم آبادی، ریاض حسن کاں خیالی، مولانا تمنا عمادی، احسن مارہروی، نوح ناروی اور نظام الدین بلخی کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔

تصنیفات وتالیفات مختارالدین احمد (اردو)

(۱)

خطوط اکبر علی گڑھ،۱۹۵۱

اکبرالہ آبادی کے وہ خطوط جو غیر مطبوعہ تھے یا پرانے اخبار ورسائل میں بکھرے ہوئے تھے لیکن اُن کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہیں تھے ، انھیں یکجا کرکے اور مرتب کرکے ضروری حواشی کے ساتھ ،علی گڑھ میگزین کے اکبرالہ آبادی نمبر (۱۹۵۱) میں شائع کیا گیا۔ کچھ نسخے فاضل چھپوا کر کتابی صورت میں منظر عام پر لائے گئے ۔ یہ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ جو کڑی محنت کے بعود منظر عام پر آیا ہے۔

(۲)

فہرست نمائش گاہ مخطوطات ونوادر، علی گڑھ ۱۹۵۳

کتاب خانہ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

لٹن لائبریری (موجودہ مولانا آزاد لائبریری) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود اہم نوادر کی ایک نمائش کا اہتمام ۱۹۵۳ میں مختارالدین احمد کی تحریک پر کیا گیا تھا۔ ان نوادر کی یہ وضاحتی

فہرست ہے۔ ابتدا میں رشید احمد صدیقی کے قلم سے ''علی گڑھ کے ذخیرۂ مخطوطات کی سیر'' کے عنوان سے ایک تعارف شامل ہے۔ بعض اہم مخطوطات اور نادر وصلیوں کے عکس بھی شامل کیے گئے ہیں ۔ یہ پروفیسر مختار الدین آرزو کا اس وقت کا کام ہے جب وسائل و ذرائع بہت ہی محدود ہوا کرتے تھے۔ اب پہلے کے مقابلے میں کام کرنا آسان ہوگیا ہے چاہے وہ تحقیق کا ہو تدوین کا۔ فہرست سازی کا ہو یا اشاریہ سازی کا یا ریسرچ کی کسی اور نوعیت کا ہو آسانیاں اب زیادہ ہیں۔

(۳)

احوالِ غالب :اس کی پہلی اشاعت ۱۹۵۳ میں دوسری ۱۹۸۶ می ہوئی مجموعے میں ۱۸ مضامین شامل ہیں۔ پہلے چھ مضامین (۱) مرزا غالب اور مالک رام (۲) غالب کی خاندانی پنشن از مہر (۳) دہلی سوسائٹی از عبدالستار صدیقی (۴) ہرمزثم عبدالصمد از قاضی عبدالودود (۵) امراؤ بیگم اور حمید احمد خان (۶) باقر علی خں کامل از حمیدہ سلطان (۷) روائداد مقدمہ مرزا غالب از مولوی عبدالحق (۸) معرکہ غالب وصاحبان قتیل از خواجہ احمد فاروقی (۹) مرزا غالب کی تصویریں از م مختار الدین احمد (۱۰) من کیتم از قمر الدین راقم (۱۱) خواجہ قمر الدین راقم از مرزا رفیق بیگ (۱۲) غالب کے چند اعزا از ناظمہ بیگم پیروی احوال غالب میں یہ تمام مضامین شاملہیں ، بہرحال غالب کو سمجھنے کے لیے یہ بہت ہی اہم اور سنگ میں کی حیثیت رکھتی ہے۔

ادیباچہ طبع دوم اس 'دیباچہ میں طبع اول (۱۹۵۳) اور طبع دوم (۱۹۸۶) درمیانی وقفے میں غالب پر ہونے والے تمام علمی کاموں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ اب تک غالب پر کئے گئے کام میں یہ اپنی نوعیت کا الگ اور اہم کام ہے۔ اور غالب کی فہرست میں ایک

اہم کام کا اضافہ بھی ہے۔طلبا و اسکالر کے لیے بہت مفید ہے۔

(۴)

تذکرۂ شعرائے فرخ آباد مجلسِ علمی، دہلی؛ ۱۹۵۶

از مفتی سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی

مفتی سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی کی فارسی غیر مطبوعہ کتاب ''تاریخ فرخ آباد'' کا چوتھا باب ''تذکرہ شعرائے فرخ آباد'' پر مشتمل ہے ۔اس باب کو مرتب کر کے رسالہ اردو ادب (علی گڑھ) جولائی ستمبر ۱۹۵۴ء میں شائع کیا گیا۔ بعد میں اسی حصے کو مالک رام صاحب نے اپنے ادارے مجلسِ علمی، دہلی سے کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۵)

سیر دہلی از ریاض الدین امجد دہلی، ۱۹۶۲

شیخ ریاض الدین امجد سندیلوی کے ۱۸۶۰ء کا دہلی کا سفر نامہ جسے حواشی وتعلیقات سے مزین کر کے رسالہ صبح (دہلی) ۱۹۶۲ میں شائع کرایا۔ اسی مطبوعہ نسخے کے کچھ فرنے فاضل چھپوا کر اسے کتابی شکل دے دی گئی۔ یہ سفر نامہ پر ایک اہم کتاب ہے (۷)

(۶)

کربل کتھا

ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۶۵، ص ۳۴۸

کربل کتھا اب تک کی تحقیق کے مطابق شمالی ہند میں اردو نثر کی قدیم ترین کتاب ہے۔اس کے مصنف کا نام فضل علی اور تخلص فضلی ہے۔اس اہم کتاب کا تصنیف کا سنہ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲۔۱۷۳۳) اور نظر ثانی کا سنہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸) ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اتنی اہم اور قدیم ہونے کے باوجود مدتوں اہل

علم کی نگاہوں سے یہ کتاب اوجھل رہی۔ فضلی کے معاصرین اور زمانہ مابعد کے تذکرہ نگاروں نے نہ فضلی کا ذکر کیا اور نہ ان کی اس اہم کتاب کا۔ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے ے بعد سب سے پہلے مولوی کریم الدین نے طبقات شعرائے ہند (طبع اول ۱۸۴۸) کے ذریعے اس کتاب کو اہل علم کے درمیان متعارف کرایا۔ وہ مذکورۃ الصدر کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''فضل علی نام، تخلص فضلی، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وہ موجود تھا۔ اس نے ایک کتاب ''وہ مجلس'' اردو زبان میں قدما کے محاورات پر لکھی ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ ان ایام میں میری عمر بائیس برس کی تھی۔ اس کتاب کا نام اس نے ''کربل کتھا'' رکھا ہے۔ سبب تصنیف اس کتاب کا جو اس نے بیان کیا ہے۔ بعینہٖ اس کی عبارت بے کم و کاست لکھتا ہوں۔''
>
> اس کے بعد کریم الدین نے اس کتاب کے دیباچے کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جو تقریباً ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اقتباس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔ ''قبلۂ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے۔۔۔۔ الخ'' اور خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے ''بجہاں نامش ہم بہ نیکی باد'' (۸)

کریم الدین کے تعارف اور اصل کتاب کے طویل اقتباس نقل کر دینے کا فائدہ یہ ہوا کہ زمانۂ مابعد کے مصنّفین اس کتاب سے واقف ہوگئے۔ چنانچہ گارسان دتاسی نے تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی میں (۱۸۷۰) محمد حسین آزاد نے آب حیات میں (۱۸۸۷) فرزند احمد صفیر بلگرامی نے جلوۂ خصر میں (۱۸۸۵) احسن مارہروی نے تاریخ نثر اردو (۱۹۳۰) نصیر حسین خیال نے نعل اور اردو میں (۱۹۳۳) اور حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں (۱۹۵۷) اردو نثر کی ایک قدیم کتاب کے طور پر کربل کتھا کا ذکر کیا۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی یہ کتاب دستیاب نہ ہوسکی۔ ان سب کا ماخذ کریم الدین کی طبقات شعرائے ہند تھی۔

دراصل ہوا یہ کہ کریم الدین نے کربل کتھا کا اپنا اکلوتا قلمی نسخہ مشہور جرمن مستشرق، ڈاکٹر الواس

اشپرنگر (۱۸۱۳۔۱۸۹۳) کی نذر کر دیا۔ کیونکہ وہ ان کے محسنوں میں تھے اور انھوں نے آڑے وقتوں میں کریم الدین کی مدد کی تھی۔ اشپرنگر نادر و نایاب کتابوں کے نہایت قدرداں بلکہ عاشق تھے۔ ۱۸۵۷ میں جب ملازمت سے سبک دوش ہوکر وہ ہندوستان سے یورپ کے لیے روانہ ہوئے تو عربی و فارسی اور اردو کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ کتابوں میں کربل کتھا کا منحصر بہ فرد قلمی نسخہ بھی شامل تھا۔ جو ان کے ساتھ جرمنی پہنچ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کریم الدین کے تعارف کے بعد بھی عام اہل علم حضرات کی اصل کتاب تک رسائی نہ ہوسکی اور طبقات شعرائے ہند میں منقول اقتباس کے علاوہ کربل کتھا کا کوئی حصہ زیور اشاعت سے آراستہ نہ ہوسکا۔

پروفیسر مختارالدین احمد نے کربل کتھا کی بازیابی کی اطلاع اپنے متعدد کرم فرماؤں اور دوستوں کو دی۔ شدہ شدہ اس کا علم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو بھی ہوگیا۔ انھوں نے ٹوبنگن سے اس کا عکس حاصل کیا اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے مارچ ۱۹۶۱ میں اسے شائع کر دیا۔ لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اس کے نسخے منظر عام پر نہ لائے جاسکے۔ اسی دوران جناب مالک رام اور پروفیسر مختارالدین احمد نے ترتیب و تدوین کے جدید اصولوں کے تحت اسے مرتب کیا اور اکتوبر ۱۹۶۵ میں ادارۂ تحقیقاتِ اردو پٹنہ کی جانب سے چھاپ کر علمی و ادبی حلقوں میں عام کر دیا۔

ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس کی بازیافت کر کے اس کا متن مرتب کیا اور اس پر حواشی و تعلیقات لکھے جس سے اس کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہوگیا۔ ابتدا میں ایک تفصیلی مقدمہ بھی سپرد قلم کیا۔ ترتیب و اشاعت میں انھیں مالک رام صاحب کا پورا تعاون حاصل رہا۔

ہمارے زمانے میں اس کتاب کی بازیافت اور پھر اشاعت کی نہایت اہم خدمت پروفیسر مختار الدین احمد نے نجام دی۔ اس کی روداد لذت بخش بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ تفصیل پروفیسر موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> ''میں جب ۱۹۵۳ میں آکسفورڈ جا رہا تھا تو جناب قاضی عبدالودود صاحب
> نے مجھ سے فرمایا کہ اشپرنگر کے پاس کربل کتھا کا جو نسخہ تھا اس کا سراغ نہیں

ملتا کہ کیا ہوا؟ ہو سکے تو یورپ کے کتب خانوں میں اس گم شدہ کتاب کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں اشپرنگر کے پاس یہ کتاب تھی۔ لیکن کیا یہ جرمنی پہنچی یا نہیں؟ پہنچی تو یورپ کی پچھلی صدی کی متعدد لڑائیوں اور ہمارے سامنے کی ان دو عظیم الشان جنگوں میں، جن میں جرمنی شریک غالب رہا تھا، اس کتاب پر کیا بیتی؟ یہ سوال تھے جن کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔ میں نے انگلستان پہنچ کر کتاب خانہ برلن کے ناظم اور مشرقی علوم وفنون کا سارا ذخیرہ پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں حفاظت کے خیال سے برلن سے باہر جرمنی کے ایسے شہروں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جو نسبتاً محفوظ اور فوجی نقطۂ نظر سے غیر اہم تھے، اور اب تک یہ کتابیں ان مقامات سے برلن واپس نہیں آئی ہیں۔ آتیں بھی کہاں؟ خود برلن ہی کے حصے بخرے ہو گئے تھے۔ میں نے اس سلسلے میں جرمنی، ہالینڈ، فرانس اور مغربی یورپ کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں سے خط وکتابت کی۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے چھوٹے سے چھوٹے کتاب خانے میں خود اس کی تلاش میں پہنچا۔ لیکن کہیں سے کچھ پتہ نہ چلا۔ انگلستان میں اس سے متعلق کسی قسم کی اطلاع نہ ملنے سے تو مجھے کوئی مایوسی نہیں ہوئی، کیونکہ میرا شروع سے خیال تھا کہ اس کے جرمنی میں دستیاب ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ لیکن میں اس بات کی تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ شاید ہندوستان سے اس کا کوئی اور نسخہ انگلستان آ گیا ہو اور یہاں کے کسی غیر معروف کتب خانے میں پڑا ہو۔

اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے مزید مواد جمع کرنے کے لیے مجھے ۱۹۵۴ء کے اواسط میں لائیڈن (ہالینڈ) جانا پڑا۔ لائیڈن کا کتاب خانہ عربی، فارسی، ترکی مخطوطات کے لیے دنیا بھر میں بجا طور پر مشہور ہے۔ ہیگ، امسرڈم، راٹرڈم — اور ہالینڈ کے بعض دوسرے شہروں میں بھی مشرقی مخطوطات ملتے ہیں۔ میں نے یہاں کئی مہینے ان مخطوطات کے مطالعے میں صرف کیے لیکن اس تمام دوران میں کربل کتھا کے خیال سے

کبھی غافل نہیں رہا۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں وہاں سے جرمنی پہنچا، جہاں مجھے کولون، بون، فرینکفرٹ، مائنز، ماربرگ اور ہائیڈل برگ یونیورسٹیوں اور وہاں کے کتاب خانوں میں کئی ماہ رہ کر کام کرنا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ برلن کے سرکاری کتب خانے کی کتابیں ماربرگ اور ٹوبنگن بھیجی گئی تھیں۔ اس پر میں جنوری ۱۹۵۵ء میں ماربرگ گیا اور وہاں کے کتاب خانے کے ناظم ڈاکٹر ولف گانگ فوگٹ سے ملا اور ان سے اپنا مقصد بیان کیا۔ فرمایا ہماری یونیورسٹی کا اپنا کتاب خانہ ہے اور خاصا بڑا۔ جنگ کے دوران میں کچھ فوجی بہت سی گاڑیوں میں برلن سے کتابیں لے کر آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی فہرست نہیں آئی۔ نہ کوئی انھوں نے بعد کو بھیجی۔ یہ ساری کتابیں ہم نے کتاب خانے کے تہ خانے میں رکھوادی تھیں، جہاں یہ آج بھی پڑی ہیں۔ آج تک کسی اسکالر نے انھیں نہیں دیکھا۔ نہ کبھی ہمیں ایسی ضرورت پیش آئی بلکہ ہمیں تو آج تک یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کتابیں ہیں کس کی ملکیت —— جامعہ ماربرگ کی یا برلن کی۔

میرے اصرار پر انھوں نے کہا کہ تہ خانے سے ان کتابوں کو نکلوا کر اوپر دارالمطالعہ میں لانا تو بالکل ممکن نہیں، ہاں، میں ایک آدمی ساتھ کر دیتا ہوں۔ آپ وہیں تہ خانے میں جا کر اپنی مطلوبہ کتاب تلاش کر لیجیے۔ اس پر میں جرمن رہبر کے ساتھ تہ خانے میں اترا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا، اور ان دنوں ماربرگ میں شدید برف باری ہو رہی تھی۔ آتش دان کے بغیر تہ خانہ گویا کرۂ زمہریر کا خطہ بن رہا تھا۔ میں کانپتا ٹھٹھرتا ایک لمبی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ کتاب خانے کا وہ آدمی بیس بیس پچیس پچیس کتابیں لا کر میز پر لگا دیتا۔ میں جب انھیں دیکھ لیتا، تو وہ انھیں ہٹا کر اسی طرح کا دوسرا ڈھیر لے آتا۔ سات دن تک صبح سے شام تک یہی ہوتا رہا۔ ساتویں دن یہ پورا ذخیرہ جو آٹھ نو ہزار کتابوں پر مشتمل تھا ختم ہو گیا۔ ان میں عربی فارسی کی سیکڑوں اہم کتابیں ملیں۔ جن سے متعلق کئی سو صفحے کی یادداشت تیار ہو گئی۔ لیکن میں نے جس گوہر نایاب کی خاطر یہ ہفت خواں طے کیا تھا۔ اس کا کوئی

سراغ نہ ملا۔

میں ماربرگ سے تھکاہارا ہائیڈل برگ پہنچا۔ یہاں ڈاکٹر البرٹ ڈیٹریش استاذ السنۂ سامی نے برلن کے کتاب خانے کے انگل کا خط (مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۵ء)، مجھے دیا جس میں انھوں نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا تھا کہ پرانے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مخطوطۂ اشپرنگر: ۱۷۳، جس کی آپ کو تلاش ہے اور کتابوں کے ساتھ ٹوبنگن بھیجا گیا تھا۔ اب کیا تھا، میں خوش خوش ٹوبنگن پہنچا اور ڈاکٹر کریمر سے ملا جو وہاں عربی زبان وادبیات کے استاد تھے۔ انھوں نے ناظم کتاب خانہ سے ملایا اور وہ مجھے ایک نئے تعمیر شدہ زمین دوز کمرے میں لے گئے۔ جہاں انھوں نے یہ سارے انمول جواہر جمع کر رکھے تھے۔ کمرہ تو یہ برائے نام ہی تھا بس ننگی دیواروں کا چوکھٹا تھا جو جنگ کے اختتام کے دس برس بعد بھی گچ اور سفیدی سے محروم تھا۔

''کتاب کے دیباچے کے مطابق ۱۱۴۵ھ تک، جب کہ اس کا نقشِ اول تیار ہوا، ان کی عمر ''حدودعشرین'' سے صرف ''دوتین منزل'' متجاوز ہوئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر وہ اس وقت بائیسویں یا تیئیس برس میں تھے۔ اس بنیاد پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۱۲۲ھ/ ۱۷۱۰ کے اواخر یا ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۱ کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ اپنی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں وہ بالکل خاموش ہیں۔ تاہم ان کی تحریر میں آیات واحادیث کے حوالوں کی فراوانی، عربی وفارسی الفاظ وتراکیب کے برمحل استعمال اور فارسی نظم میں بے تکلف اظہارِ خیال سے نیز ان کے اس بیان سے کہ انھیں ابتدائے سے ہی سے جگر گوشہ ہائے رسول کے احوال شہادت مآل کی تحقیق ودریافت سے دلچسپی تھی اور وہ اپنا بیشتر وقت اس سلسلے کی حکایتوں اور روایتوں کی تصحیح وتصریح میں گزارتے تھے۔ یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ اور مستحکم بنیادوں پر ہوئی تھی۔(۹)

پروفیسر مختارالدین آرزو اس کتاب کے حوالے سے بہت دلچسپ باتیں ہم سے شیر کرتے ہیں

اس مناسبت سے آپ مزید فرماتے:

یہاں کھلی الماریوں میں کتابیں چنی رکھی تھیں۔ پہلے دن چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد ایک کتاب پر نظر پڑی، جس کی جلد کے پشتے پر ''اشپرنگر:۱۷۴۳'' لکھا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے الٹ کر دیکھا تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ فضلی کی کربل کتھا تھی۔ یورپ سے واپس آیا تو اور بہت سے نوادر کے ساتھ یہ فضلی کی کربل کتھا بھی میرے ساتھ آئی۔ اس طرح یہ انمول کتاب جو ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے باہر گئی تھی۔ پوری ایک صدی بعد عکسی شکل میں پھر اپنے وطن واپس آ گئی یہ بہت اہم بات ہے اس مناسبت سے میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار لفظوں میں کر ہی نہیں سکتا اب اس کا استفادہ عام ہو جائے گا اور بہت سے تشنہ لبوں کو اس اہم کتاب سے سیرابی ہوگی۔(۱۰)

گلشنِ ہند (تذکرہ شعرائے اردو) از حیدر بخش حیدری

مجلسِ علمی، دہلی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۴

باڈلین لائبریری اور برٹش میوزیم کے نسخوں کی مدد سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے جس میں اردو کے ۲۸۹ شعرا کے حالات مع نمونۂ کلام درج ہیں۔ اس پر مرتب کے حواشی خاصے معلوماتی ہیں۔ اب اس طرح سے ایک ہی جگہ سب کا مختصر تذکرہ دستیاب ہو جانا ایک اہم کام ہے تذکرہ پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت مدد گار ثابت ہوگی۔

(۸)

تذکرۂ آزردہ مولفہ مفتی صدرالدین آزردہ

علمی مجلس، دہلی، ۱۹۷۰، ص ۱۱۶

مفتی صدرالدین آزردہ (۱۷۸۹۔۱۸۶۸) کا مرتب کردہ تذکرہ

شعرائے اردو، جس کے ایک ناقص الآخر نسخے کے فقط ابتدائی ۴۴صفحات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو کر کورپس کرسٹی کالج، کیمبرج (انگلستان) میں محفوظ ہیں۔ڈاکٹر مختارالدین احمد وہاں سے اس کا عکس لائے اورانھوں نے اپنے حواشی وتعلیقات کے ساتھ ایڈٹ کرکے شائع کیا۔ اس تذکرے میں حرف ق تک کے ۱۰۶شعراء کامختصر تذکرہ مع انتخابِ کلام درج ہے۔میرا اپنا خیال ہے کہ ان شعراء کے حالات بیک وقت جمع کر دئے گئے ہیں اور بڑے اختصار کے ساتھ معلومات کو فراہم کرانے کی بھر پور کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی ایک اہم ترین کام ہے۔مرتب کے حواشی بہت قیمتی اور بیحد مفید ہیں۔طلباء واسکالروں کے لیے یقیناً یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے

(۹)

دیوان حضور عظیم آبادی

مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۷،ص۱۳۲

شیخ غلام یحیٰ حضور عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۶ھ) کے اردو دیوان کے انتخاب کا مختصر اور منفرد نسخہ خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ سٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔مرتب موصوف نے اسی نسخے کی بنیاد پر یہ دیوان ایڈٹ کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب جو پردۂ خفا میں تھی اور جس سے طلباء کا استفادہ تقریباً نا ممکن تھا۔اس سے ممکن ہوا کہ عام آدمی بھی رسائی کر سکے۔ابتدا میں ۴۳صفحات پر مشتمل مرتب کا تفصیلی مقدمہ ہے جس سے مصنف کے مختصر مگر جامع حالات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۱۰)

عبدالحق ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴،ص۱۲۴

ملک العلماء مولانا ظفرالدین قادری رضوی کی حیات اوران کے علمی کارناموں کا تعارف ۔ ابتدا میں سید نور محمد قادری کا مصنفِ کتابِ ہٰذا پرایک تعارفی مضمون بعنوان 'مصنف صحیح البہاری کے صاحب زادے ڈاکٹر مختارالدین احمد کا مختصر تعارف' کے عنوان سے شامل ہے۔

(۱۱)

ذاکر صاحب کے خط

خدبخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام۔جلد سوم،۱۹۹۹،ص۱۱۴

خدابخش لائبریری، پٹنہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط کئی جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔پہلی اور دوسری جلدان خطوط کی عکسی اشاعت پر مشتمل تھی ۔تیسری جلد ڈاکٹر ذاکر حسین کے ان ۶۱ خطوط پر مشتمل ہے جوانھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھے تھے۔ یہ خطوط جو۱۹۲۵ کے طویل عرصے پر محیط ہیں ۔ان تمام خطوط کومختارالدین احمد نے نہایت تفصیلی حواشی کے ذریعے مرتب کیاہے۔آخر میں شخصیات،ادارے،مقامات، کتب،مضامین، رسائل ، اخبارات ،اہم واقعات وغیرہ عنوانات کے تحت اشاریہ بھی دیا گیاہے۔اخیر میں جوتفصیلات درج ہیں اس سےاس کتاب کی اہمیت اورزیادہ بڑھ گئی ہےاوراس سے اسفتادہ کی راہ اوربھی آسان ہوگئی ہے۔آج کل کتب ورسائل کے ساتھ ساتھ خطوط کی بھی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

(۱۲)

ذاکر صاحب کے خط۔جلد چہارم

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ،۲۰۰۰،ص۲۱۰

خدابخش لائبریری ان اہم اداروں میں سے ایک ہے جو ادباء، شعراء، دانشوران کی نگارشات کو شائع کرتی رہتی ہے وہاں سے شائع ہونا اپنے آپ میں ایک معیار رکھتا ہے یہ لائبریری ملک کے اہم مصنفین کی کتابیں شائع کر چکی ہے۔ پروفیسر مختارالدین آرزو خدابخش لائبریری سے شائع ہونے والی اس سلسلے کی چوتھی جلد جس میں ڈاکٹر ذاکرحسین کے ۲۸ مکتوب الیہوں کو لکھے گئے ۷۰ خطوط شائع کیے گئے ہیں ۔ مرتب موصوف نے مکتوب الیہ کے تفصیلی حالات کے ساتھ ساتھ خطوط پر مفصل حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔جلد سوم کی طرز پرآخر میں اشاریہ بھی دیا گیاہے ۔عصر حاضر میں مکتوبات ورسائل کے ساتھ مکتوبات کی بھی بے پناہ اہمیت و افادیت ہے۔اورموجودہ عہد میں یہ بھی بحث وتحقیق میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔(۱۱)

تصانیف وتالیفات مختارالدین احمد (عربی)

(۱)

دیوان شعر: الامیر مؤید الدولہ اسامہ بن منقذ الکنائی الشیذری

۱۹۵۱

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور مصنف وشاعر اسامہ بن منقذ الشیز ری الکنانی (۴۸۸۔۵۹۴ھ) کے اشعار مختلف مطبوعہ وغیر مطبوعہ مصادر سے جمع اور مرتب کر کے ایک دیوان کی شکل دیدی گئی ہے (غیر مطبوعہ)

(۲)

فضائل من اسمہ احمد أومحمد لابن بُکیر البغدادی

علی گڑھ، ۱۹٦۰

ابوعبداللہ الحسین بن احمد بن عبداللہ بن بُکیر البغدادی (متوفی ۳۸۸ھ) کا ایک مختصر عربی رسالہ 'کتاب فضائل من اسمہ احمد أو محمد' کے مکمل عربی متن کو حواشی وتعلیقات سے مزین کیا گیا ہے۔ متن کتاب خانہ جامعہ لائیڈن کے دو نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ ابتدا میں مصنف اور اس رسالے پر اردو زبان میں جامع تعارف ہے۔

(۳)

المختار من شعر ابن الدُّ مینة علی گڑھ،۱۹۶۲

ابن الدُ مینۃ مخضرمی الدولتین ہے۔اگراس نے کچھ زمانہ عہداموی کا پایاہے تو کم ازکم نصف صدی کے قریب اس نے اپنی زندگی عصرعباسی میں گزاری ہے ۔ یہ خالدی برادران ابوبکرمحمد (م۳۸۰ھ)اورابوعثمان سعید(م۴۰۰ھ تقریباً) کے پسندیدہ شعراء میں ہے جس کے اشعارکا اہم اورطویل انتخاب اس نے اپنی کتاب 'الاشباہ والنظائر' میں درج کیاہے ۔اس میں ایسے مقطوعات بھی ہیں جواس کے دیوان میں نہیں ملتے ۔مرتب موصوف نے قاہرہ کے ایک قدیم نسخے سے اشعار کامتن مرتب کیاہے ۔کتاب کی ابتدامین ابن الدمینۃ اورالخالدیان کے احوال وآثار پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۴)

الحماسة البصرية لصدرالدين على بن ابى الفرج البصرى

۱)دائرۃ المعارف العثمانیہ،حیدرآباد،۱۹۶۴

۲)عالم الکتب،بیروت،۱۹۸۳

عربی اشعار کے قدیم مجموعے المفضلیات ،الاصمعیات،کتاب الاختیارین،جمہرۃ اشعارالعرب،مختارالاشعارالعرب،منتہی الطلب من اشعارالعرب وغیرہ ہیں۔ابوتمام(م۲۳۱ھ)وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے مجموعۂ انتخاب کا نام الحماسہ رکھا۔حماسۂ ابوتمام کی پیروی میں متعدد مصنفوں اورادیبوں نے حماسے لکھے جن میں

حماسۃ الأعلم الشنتمر ی ، حماسۃ الشاطبی ،حماسۃ شُمیم الحلّی ، الحماسۃ المغربیۃ ،الحماسۃ الخالدین وغیرہ شہرت رکھتے ہیں۔انھیں حماسوں میں صدرالدین علی بن ابی فرج البصری (م ۶۹ھ) کی الحماسۃ البصریۃ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ قدیم علماء عبدالقادر البغدادی ، بدرالدین العینی ، جلال الدین السیوطی ، ابن الشاکر الکتبی ،ابن الاکفانی اورخضر الموصلی ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے اس مجموعے کواہمیت دی اوراس سے استفادہ کیا۔الحماسۃ البصریۃ کے نسخے استانبول،قاہرہ اوراسکودیال وغیرہ میں محفوظ تھے۔ڈاکٹر مختارالدین احمد نے ان اہم نسخوں کی بنیاد پراس کاایک تنقیدی ایڈیشن علامہ عبدالعزیز المیمنی کی نگرانی میں مرتب کیاجودائرۃ المعارف العثمانیہ ،حیدرآباد سے۱۹۶۴ میں دوجلدوں میں شائع ہوا۔اس کی ابتدا میں پچاس صفحے کاایک طویل عربی مقدمہ ہے اورآخر میں شعراءاورقوافی کی فہرستیں درج ہیں۔اس کتاب کادوسرا ایڈیشن بیروت سے۱۹۸۳ میں شائع ہوا۔ اس کتاب پر کام پروفیسرمختارالدین کے کام کرنے سے پہلے پردۂ خفا میں تھا۔میری اپنے نظر میں پروفیسرمختارالدین آرزو کے جہاں بے شمار دیگرادبی وعلمی کام اہمیت کے حامل ہیں وہیں یہ بھی بہت اہم ہےاور یہ کام جس نوعیت کا ہے اس سے پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کی لگن ،محنت اورتحقیق وتدوین میں دلچسپی ومہارت کابھی ثبوت فراہم کرتا ہے۔علمی دینا میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔

(۵)

رسالۃ المبرّد النحوی دہلی،۱۹۶۸

مشہور نحوی ابوالعباس محمد ابن یزید المبرّد (م ۲۸۵ھ) کی متعدد تصانیف مرتب ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔ رسالۃ المبرد الی احمد ابن الوائن کا نایاب مخطوطہ ڈاکٹر مختارالدین احمد کو جرمنی میں ۱۹۵۵ میں ملا تھا اسے انہوں نے مرتب کرکے اپنے حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع کیا۔ یہ رسالہ مشہور بغدادی خطّاط ابن البوّاب (م ۴۱۳ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ اس کی اہمیت کی بنا پر پوری کتاب کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔ مقدمے میں ابن البوّاب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جتنے نسخے شرقِ اوسط اور یورپ میں ملتے ہیں ،ان کا بھی ذکر کردیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے اہل علم و اسکالر کو کافی فائدہ ہوگا۔ دراصل ایک زمانے سے علماء، دانشوان ،طلباء واساتذہ میں اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے کافی آسانی ہوئی ہے۔ (۱۲)

(۶)

القصيدة الدالية للأعشى الكبيرمع شرح الشنزرى

علی گڑھ، ۱۹۶۹

ڈاکٹر مختارالدین احمد نے عربی کے ایک مشہور قصیدے کو، جس کی شرح مُسلّم بن محمود الشیز ریّ نے کی ہے اور جس کا نایاب خطی نسخہ لائیڈن یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ،حواشی وتعلیقات کے ساتھ مرتب کیا ہے ۔متن سے قبل ایک تفصیلی تعارف بطور مقدمہ شامل ہے ۔ اور یہ مقدمہ بذات خود اپنے آپ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بڑی اہم معلومات کا ذریعہ بھی ہے ۔کبھی کبھی صرف مقدمہ سے ہی بڑی اطلاعات مل جاتی ہیں اور اس طرح کتاب کی

قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

(۷)

کتاب مجالس المیمنی

للعلامۃ الشیخ الاستاذ عبدالعزیز المیمنی

قدّم له و حققه و علق علیه الدکتور مختارالدین الاحمد

علی گڑھ، ۱۹۸۶

ممتاز حسن (۱۹۔۱۹۷۴) کی فرمائش پر الاستاذ المیمنی نے تاریخ عربی اور عربی لغات و معاجم پر شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی میں ایک سلسلہ محاضرات شروع کیا تھا جو ''اردو نامہ'' کراچی میں دس قسطوں میں ۱۹۶۹۔۱۹۷۰ مین شائع ہوتا رہا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ان علمی تقریروں کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے اپنے احباب و تلامذہ سے انھیں عربی میں منتقل کرایا اور ان پر بڑے قیمتی اور مفید حواشی تحریر کر کے مجلۃ المجمع العلمی الھندی علی گراہ (شمارہ یازدہم) میں شائع کیا۔ کچھ نسخے علیحدہ کتابی شکل میں چھپوا کر اہل علم میں تقسیم بھی کیے یہ ان کے علمی ذوق و شوق کی بڑی دلیل ہے نیز علم و عرفان کی ترویج و اشاعت کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔

(۸)

دیوان شعر الحادرۃ/رام پور رضا لائبریری رام پور

ص/۷۸ سن اشاعت/۲۰۱۰

۹ ویں صدی ہجری کا ایک بہت ہی اہم مخطوطہ جو رام پور رضا

لائبریری رام پور کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ دراصل اس مخطوطہ میں زمانۂ جاہلیت کے وہ اشعار مندرج ہیں جسے قطبہ بن اوس اصمعی نے اپنی مشہور کتاب ''مفضلیات'' میں جمع کئے ہیں۔ ان اشعار کے کاتب دنیا کے مشہور و معروف کیلیگرافر یاقوت مستعصمی ہیں۔ ان کے بارے آتا ہے کہ زمانۂ عباسی میں ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ جواہرات واشرفیوں میں تولا جاتا تھا۔ پہلے اس کتاب کو ہندوستان کے مشہور ماہر غالبیات و رضا لائبریری کے سابق ڈائرکٹر مولانا عرشی نے ایڈٹ کیا تھا بعد میں اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر پروفیسر مختار الدین آرزو نے دوبارہ مزید اضافہ، مقدمہ و تحشیہ کے ساتھ رضا لائبریری سے شائع کرایا ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئی ۔ یہ رضا لائبریری کی اہم ترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔ (۱۳)

تصنیفات وتالیفات مختارالدین احمد (انگریزی)

1.The Bani Muniqidh, Their Scholastic and Literary Persuits with special reference to Mu ayyid al-Daulah Usama b. Munqidh al-Shizani (474-552 A.H.) pp-59 1449

2. Sadar al Din 'Ali b. Faraj al Basri (656 A.H.)

نوٹ: ساتویں صدی ہجری کے مصنف صدرالدین علی بن ابی الفرج البصری کی زندگی اوراس کی تصانیف پرایک پرمعلومات مفصل مقالہ۔

3. Catalogue of the Persion Manuscripts in the Maulana Azad Library, Aligarh Muslim Univesity, Aligarh Prepared by Dr. Athar Abbas Rizvi, Revised and Edited by Dr. Mukhtar ud Din Ahmad.

4. Abdul Haq, Written by (in Urdu) Prof. Mukhtar Uddin Ahmad,

Translated into English by Balraj Varma

Published by: Delhi, Sahitya Acadmy 1991, pp.84.

اشاریۂ مقالاتِ مختارالدین احمد (اردو) (موضوعاتی ترتیب)

مختارالدین احمد (خودنوشت، ڈائری وخطوط)

عنوان	مآخذ
مختارالدین احمد آرزو (خودنوشت)	نقوش (لاہور): ستمبر ۱۹۶۵۔آپ بیتی نمبر
میرے بچپن کا عظیم آباد	نقوش (لاہور)
علی گڑھ کے شب وروز: (ڈائری کے چند اوراق)	علی گڑھ میگزین؛ ۹۷۔۱۹۹۵، خصوصی شمارہ: علی گڑھ

آئینۂ ایّام میں

مقالہ نگار کی مسلم یونیورسٹی میں آمد اور ۴؍جولائی ۱۹۴۳ سے ۳۱؍ دسمبر ۱۹۴۴ تک کی ڈائری کی روداد جس میں مسلم یونیورسٹی کے اس عہد کی پوری تاریخ سمٹ کر گئی آئی ہے۔

میرے شب وروز: نصف صدی پہلے کی ڈائری کے رسالۂ غالب (کراچی) ۲۰۰۰ کے کچھ اقتباسات۔

جنوری ۱۹۴۵ سے (جب مصنف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے) ۲۴؍دسمبر ۱۹۴۵ تک کی ڈائری کے کچھ اقتباسات۔ڈائری نگار نے اشاعت کے وقت اس پر مفید حواشی کا اضافہ کر کے اسے علی گڑھ کی اس عہد کی ثقافتی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔

یادوں کے چراغ (۱)سرسید ہال میگزن (علی گڑھ)اولڈ بوائز نمبر

(بعد ترمیم و اضافہ)۱۶۷۵،مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس

(۲) سہ ماہی تحریر (مرتبہ مالک رام)

زہے روانئ عمرے کہ در سفر گزرد۔ نقوش (لاہور) دسمبر ۱۹۵۹، خاص نمبر

۱۹۵۳ کے دورۂ یورپ کا سفر نامہ

علی گڑھ قاہرہ میں علیگ (علی گرھ)، خاص نمبر، ۱۰رفروری ۱۹۵۷

یورپ کے سفر کے دوران قاہرہ میں قیام کی روداد جس میں ڈاکٹر سید احمد، قاضی مظہر الدین بلگرامی، رشاد عبدالمطلب، احمد سالم، ڈاکٹر سید محمود اوران کے سکریٹری حسن نعیم سے ملاقاتوں کا ذکر ہے۔

جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے (۱)صحیفہ (لاہور)

(۲) سہ ماہی امکان مرتبہ علی سردار جعفری

مہاراشٹر اردو اکادمی بمبئی، نومبر ۱۹۹۰

اس مضمون میں اپنے کچھ قدیم اساتذہ اور ایشیا اور یورپ کے بعض مشاہیر کا ذکر کیا ہے۔

طلبائے علی گڑھ دیار فرنگ میں مسلم یونیورسٹی گزٹ (علی گڑھ)، ۲۴راپریل

اپریل، ۸رمئی ۱۹۵۴ مرتبہ سید شریف الحسن بلگرامی

علی گڑھ کے ان لوگوں کا تذکرہ جن سے مضمون نگار کی قیام انگلستان کے دوران ملاقات رہی یہ ہیں: شہاب الدین محمد مغنی، ڈاکٹر سلام اللہ انصاری، قیصر زیدی انور انصاری، شاہ مشہور علام سید عبدالعزیز، سید ظہور قاسم، ابوسالم، حفیظ زیدی، عرفان حبیب، سائرہ عرفان، متین الزماں، احمد شفیق، صدیق احمد صدیقی، امجد علی، ساجد علی خاں راز مرادآبادی، غزالہ انور، افسر افضال الدین، فیروز

جبیں، فاطمہ منہاج، بیگم فاطمہ خیری، مسز مخدوم، مسز آڈری مقبول احمد، زہرہ احمد، عزیز الرحمٰن (مقیم جرمنی) سے بھی ملاقات کا ذکر ہے۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن علی گڑھ میگزین (علی گڑھ) ۱۹۷۵ء/مرتبہ قمر رئیس

قیام آکسفورڈ کے زمانے کے احباب کا تذکرہ۔ احمد شفیق، معصوم علی ترمذی، شاہ مشہود عالم، عرفان حبیب، سائرہ عرفان، متین الزماں، بکرماجیت حسرت، یعقوب اقبال، سید عبدالعزیز، محمد شفیع، محمد حسیب، محمد اشفاق قادری، منیر وغیرہ۔

مکتوب فرنگ صدق جدید (لکھنؤ) ۲۳/جولائی، ۳۰/جولائی ۱۹۵۴ء و ۱۱/فروری ۱۹۵۵

مکتوب نگار نے انگلستان کے دورانِ قیام یہ خطوط تحریر کیے تھے جن میں وہاں کی معاشرتی، علمی اور ثقافتی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ تینوں خط عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے ہیں۔

مکتوب مختارالدین احمد مشمولہ 'انجم اعظمی حیات وخدمات' مرتبہ ڈاکٹر مشرف احمد، کراچی، ۱۹۹۷

۱۳ دسمبر ۱۹۸۴ اور ۲۰ مارچ ۱۹۸۹۔۔۔۔ بیان لکھے گئے چار مفصل خط۔

مکتوب پروفیسر مختارالدین احمد بنام اقبال احمد فاروقی جہانِ رضا، لاہور، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۷

مکتوب پروفیسر مختارالدین احمد بنام اقبال احمد فاروقی جہانِ رضا، لاہور؛ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۸

اس مکتوب میں ملک العلماء مولانا ظفرالدین قادریؒ کی چار جلدوں پر مشتمل تصنیف ''حیات اعلی حضرت'' کی عدم اشاعت کا سبب اور اس سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کی پوری تفصیل پیش کی ہے۔

مکتوب پروفیسر مختارالدین احمد بنام اقبال احمد فاروقی جہانِ رضا، لاہور؛ اپریل۔مئی ۱۹۹۹

مکتوب پروفیسر مختارالدین احمد بنام اقبال احمد فاروقی جہانِ رضا، لاہور؛ جون ۲۰۰۰

مکتوب نگار نے اس خط میں پروفیسر محمد شفیع (لاہور) کے

کچھ علمی کوائف اوران سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔

ایک خط مدیر مخزن (حامد علی خان) کے نام مخزن (لاہور)؛ فروری ۱۹۵۴ء

(یاران نکتہ داں کے تحت) از آکسفورڈ

مکتوب مختارالدین احمد ہمایوں (لاہور) مدیر میاں بشیر احمد

بنام حامد علی خاں نومبر ۱۹۵۲

مکتوبات مختارالدین احمد، مشمولہ مکاتیب مشاہیر ادب بنام مولانا حامد علی خاں' مرتبہ زاہد علی خاں

(الفیصل ،اہور، ۲۰۰۱)

۸ مئی ۱۹۵۱ اور ۲۷ دسمبر ۱۹۸۷ کے درمیان لکھے گئے مختارالدین احمد کے پانچ خط۔

آکسفورڈ سے مشرب (کراچی) مدیر مشفق خواجہ:

بنام خلیل الرحمٰن اعظمی اگست ۱۹۵۴

ڈاکٹر مختارالدین احمد کا خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام آکسفورڈ سے ۸ر نومبر ۱۹۵۳ کا لکھا گیا خط جس میں دہلی سے لندن تک کے سفر کی مختصر روداد اور آکسفورڈ کے قیام کی داستان تحریر ہے۔

ایک خط اور ایک غزل الحمراء (لاہور)، مدیر حامد علی خاں دسمبر ۱۹۵۴

مذکورہ بالا خط دوسرے عنوان سے۔غزل دیوان رونق عظیم آبادی نسخۂ آکسفورڈ سے نقل کی گئی ہے۔

مکتوب مختارالدین احمد آرزو۔نقوش (لاہور)، نمبر ۶۵۔۶۶، نومبر ۱۹۵۷، مکاتیب نمبر

مذکورہ بالا خط دوسرے عنوان سے۔

مکتوب ڈاکٹر مختارالدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲۔۱۳؛

بنام شیخ محمد اکرام (علمی مکتوبات) ۹۸۔۹۹

۲ر مارچ ۱۹۴۴ کا لکھا مکتوب جس میں شیخ محمد اکرام کی تصنیف ''غالب نامہ'' پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مکتوب پروفیسر مختار الدین احمد بنام عبد المجید قریشی العلم، کراچی؛ جولائی۔ستمبر ۱۹۶۸

۳۱ر مارچ ۱۹۶۷ کا لکھا مکتوب جس میں علی گڑھ کی علمی فضا اور نئی تعمیر شدہ عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مکتوبات مختار الدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر

بنام غلام رسول مہر (علمی مکتوبات) ۱۲۔۱۳، ۹۸۔۱۹۹۹

یکم فروری ۱۹۵۵ اور ۱۰ر ستمبر کو لکھے گئے دو خط۔ اشاعت کے وقت ان پر حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔

مکتوبات ڈاکٹر مختار الدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۷

بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ۹۴۔۹۵

۴ر دسمبر ۱۹۹۴ سے ۱۳ر جولائی ۱۹۹۵ کے دوران لکھے گئے ۴ تفصیلی خط

مکتوبات مختار الدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲، ۱۳

بنام قاضی عبد الودود (علمی مکتوبات) ۹۸۔۱۹۹۹

۲ر مئی ۵۸ سے ۱۳ر اپریل ۴۹ کے دوران لکھے گئے ۱۴ خطوط

مکتوب مختار الدین (تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر

بنام قاضی عبد الودود (علمی مکتوبات) ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹ء

۲ر فروری ۵۵ کو ٹیوبنگن (جرمنی) سے لکھا گیا خط جس میں فضلی کی دہ مجلس المعروف بہ کربل کتھا کی بازیافت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اشاعت کے وقت حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مکتوب آرزو نقوش (لاہور)، شمارہ ۹، ۱۰؛ اپریل۔مئی ۱۹۶۸

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام خط جس میں وسکونسن یونیورسٹی (امریکہ) نہ پہنچنے اور وہاں کی وزیٹنگ پروفیسر شپ سے استعفیٰ دینے کے وجوہ واسباب لکھے ہیں۔

مکتوبات مختار الدین احمد　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲، ۱۳

بنام مالک رام (علمی مکتوبات)　　　　۹۸-۱۹۹۹

۴؍فروری ۵۵ کا ٹیوبنگن سے لکھا ہوا خط جس میں فضلی کی کربل کتھا کی بازیافت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

ایک خط مظہر امام کے نام　　　　آوازنو، دربھنگہ؛ اپریل ۱۹۹۹

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا ۴؍نومبر ۱۹۹۸ کا لکھا خط جس میں مظہر امام صاحب سے ۱۹۶۴ میں اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ خط کی اشاعت کے وقت مظہر امام صاحب نے اس پر تفصیلی حواشی لکھے ہیں جس کے ذیل میں دونوں کے آپسی تعلقات نیز دونوں کے کچھ مشترکہ احباب کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلا عبدالعلیم آسی، مولانا نور اصلاحی، ظہیر ناشاد دربھنگوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وغیرہ۔ اسی ذیل میں مظہر امام صاحب نے اپنے سسرال رشتے داروں بالخصوص مولانا شفیع داؤدی اور ان کے خاندان پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مکتوبات ڈاکٹر مختار الدین احمد　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۷؛

بنام نجم الاسلام　　　　۱۹۹۳

۵؍مئی ۸۷ سے ۲۹؍دسمبر تک کل ۲۶ تفصیلی علمی خطوط

مکتوبات ڈاکٹر مختار الدین احمد　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)

بنام نجم الاسلام　　　　نمبر ۱۰-۱۱: ۹۶-۹۷

۲۰ جنوری ۹۵ء سے ۳؍ مارچ ۹۸ء کے دوران لکھے گئے ۱۷ علمی خطوط۔

پروفیسر مختار الدین احمد کا مکتوب　　　معارف (اعظم گڈھ) دسمبر ۱۹۹۲

بنام ضیاء الدین اصلاحی

پروفیسر مسعود حسن پر معارف ستمبر ۹۲ کے شمارے میں مکتوب نگار کا ایک تاثراتی مضمون شائع ہوا تھا۔ پیش نظر مکتوب اسی مضمون کے سلسلے میں ہے جس کے ذیل میں انسابِ عرب پر مصعب بن عبداللہ الزبیری کی دو کتابوں نیز الزبیر بن بکّار کی کتاب 'نسب قریش و اخبارھم' اور ابن الکلبی کی 'الجمھرۃ فی النسب' پر مفید معلومات پیش کیے گئے ہیں۔

مکتوب علی گڑھ (بنام ضیاء الدین اصلاحی)　　　معارف (اعظم گڈھ) ستمبر ۱۹۹۷

جولائی ۱۹۹۱ء میں شرق اُردن میں منعقدہ موتمر ہشتم کی روداد جس میں مکتوب نگار نے اپنا مقالہ بعنوان 'مشارکہ اللغة الاردية فی الحضارة الاسلامية' پیش کیا تھا جو وہاں کی روداد میں بھی شائع ہوا۔

مکتوباتِ احتشام حسین، بنام ڈاکٹر مختار الدین احمد　　　غالب نامہ، نئی دہلی؛ جولائی ۱۹۹۷

مکاتیبِ اختر جونا گڑھی بنام مختار الدین احمد　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۸، ۹؛ ۱۹۹۵

۲۳؍ فروری ۱۹۵۰ اور ۴؍ جولائی ۱۹۵۳ کے درمیان لکھے ہوئے ۳ خط۔

مکتوبات شیخ محمد اکرام　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۱۲، ۱۳؛

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات)　　　۹۸۔۱۹۹۹

مختار الدین احمد کے نام شیخ محمد اکرام کے ۸؍ اپریل ۱۹۴۴ سے ۷؍ جولائی ۱۹۵۶ کے درمیان لکھے گئے ۳ خطوط۔

مکتوبات نیاز فتح پوری　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۲، ۱۳؛

بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات)　　　　۹۸-۱۹۹۹

مختارالدین احمد کے نام ۸/اکتوبر ۳۸ء سے ۲۰/اکتوبر

۵۲ء کے دوران لکھے ہوئے نیاز فتح پوری کے گیارہ خطوط۔

مکتوبات ڈاکٹر مولوی محمد شفیع　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۲، ۱۳؛

بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات)　　　　۹۸-۱۹۹۹

مختارالدین احمد کے نام ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے چھ خطوط۔ یہ خطوط ۹/مارچ ۴۷ء سے ۱۳/دسمبر ۱۹۵۶ کے دوران لکھے گئے۔ مختارالدین احمد نے اشاعت کے وقت ان خطوط پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

مکتوبات مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۲-۱۳؛

بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات)　　　　۹۸ء-۹۹

مختارالدین احمد کے نام مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے ۹ خطوط جو ۲۶/اکتوبر ۵۱ سے ۲۱/فروری ۶۹ کے دوران لکھے گئے۔

مکتوبات عبدالماجد دریابادی　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۲، ۱۳؛

بنام مختارالدین احمد　　　　۹۸-۱۹۹۹

مختارالدین احمد کے نام عبدالماجد دریابادی کے ۴ خطوط جو ۲۳/مئی ۴۹ سے ۱۷/جنوری ۵۵ کے طویل عرصے پر محیط ہیں۔

مکتوبات حمید احمد خاں　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۲، ۱۳؛

بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات)　　　　۹۸-۱۹۹۹

مختارالدین احمد کے نام ۱۰/مارچ ۱۹۴۴ سے ۱۴/اپریل ۱۹۵۸ کے دوران لکھے گئے عبدالستار صدیقی کے ۴۶ خطوط جن پر مختارالدین احمد نے حواشی بھی لکھے ہیں۔

مکتوبات مولانا غلام رسول مہر تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲، ۱۳

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸-۱۹۹۹

مختار الدین احمد کے نام مولانا غلام رسول مہر کے ۲۲ خطوط جو ۲۳/اکتوبر ۴۴ء سے ۲۵/اگست ۱۹۵۲ کے دوران لکھے گئے ہیں اشاعت کے وقت مختار الدین احمد نے ان خطوط پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

مکتوبات مالک رام تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲، ۱۳

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸-۱۹۹۹

مختار الدین احمد کے نام ۱۷/نومبر ۴۸ء سے ۲۹/اپریل ۵۰ء کے دوران مالک رام کے لکھے ۱۳ خطوط جسے اشاعت کے وقت انھوں نے اپنے معلوماتی حواشی سے بھی مزین کیا ہے۔

مکتوبات قاضی عبدالودود تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲، ۱۳

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸-۱۹۹۹

مختار الدین احمد کے نام لکھے ۱۳ خطوط رجنوری ۴۸ سے ۱۳/مارچ ۵۰ کے عرصے پر محیط ہیں۔اس پر ان کے حواشی بھی درج ہیں۔

مکتوبات مہیش پرشاد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲، ۱۳

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸-۱۹۹۹

مختار الدین احمد کے نام مہیش پرشاد کے ۴ خطوط جو ۱۹۴۸ سے ۱۹۴۹ کے دوران لکھے گئے۔

مکتوبات ڈاکٹر سید عبداللہ ۹۸-۱۹۹۹

مختار الدین احمد کے نام ڈاکٹر سید عبداللہ کے ۱۶ مکتوبات جو ۲۳/اکتوبر ۴۷ سے ۲۹/دسمبر ۱۹۵۶ کے دوران لکھے گئے۔

مکتوباتِ محفوظ الحق بنام مختار الدین احمد خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) ۲۰۰۰

فارسی و اردو کے ممتاز استاد، مشہو مصنف اور نامور محقق پروفیسر محفوظ

الحق (۱۹۰۰۔۱۹۴۶)۲۱ خطوط مختارالدین احمد کے مرتب کیے
ہوئے۔ان میں دوخط مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (۱۸۶۷۔
۱۹۵۰) کے ،تین نصیرالدین ہاشمی (۱۸۹۵۔۱۹۶۴)اورایک خط
سیدالطاف علی بریلوی (۱۹۰۵ ۔۱۹۸۶) کے نام ہے اور پندرہ
خطوط کے مکتوب الیہ مختارالدین احمد ہیں جنھوں نے ان خطوط پر
قیمتی تعلیقات وحواشی لکھے ہیں اورتمہید میں محفوظ الحق مرحوم کے
حالات اوران کی تصانیف اوران کے مقالات کاذکر کیا ہے۔

۱۹۴۷کےعلی گڑھ میگزین کے بارے میں۔خدابخش لائبریری جرنل (پٹنہ) نمبر۹۶: ۱۹۹۴
(خط بنام ڈاکٹر عابدرضا بیدار)

علی گڑھ میگزین اگست ۱۹۴۷ کے شمارے میں اظہرامام اظہؔر کی ایک
نظم ''فرزندان قوم سے'' شائع ہوئی تھی، جواس زمانے کے حالات
سے متاثر ہوکرلکھی گئی تھی۔اسکالب ولہجہ تلخ تھا معلوم نہیں علی گڑھ
میگزین کا یہ شمارہ گاندھی جی کی نظر سے کس طرح گزرا۔انھوں نے
یہ نظم پڑھی یاکسی کے متوجہ کرنے پڑھواکرسنی اوراس پر اپنی
ناپسندیدگی کاانھوں نے ایک خط میں اظہار کیا۔ یہ خط رشیداحمد
صدیقی کے نام تھاجومیگزین کے نگراں تھے۔اس نظم سے متعلق
خدابخش لائبریری جرنل کے ایڈیٹر(ڈاکٹر عابد رضا بیدار) نے
مختارالدین احمد سے استفسار کیا تھا۔جس کا جواب خط کی صورت
میں انھوں نے دیا جسے ایڈیٹر نے مضمون کی صورت میں جرنل کے
پیش نظر شمارے میں شائع کردیا۔اس خط میں اظہرامام اظہر کی نظم

اور گاندھی جی کے اس اردو خط کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔

مکتوب مختار الدن احمد   رسالہ سہیل (گیا)

بنام حسن امام نسیم الحق

اس طویل خط میں جو آکسفورڈ سے ۸/مارچ ۱۹۵۴ء کو لکھا گیا ہے سید عبدالقیوم مہجور شمسی سہسرامی (۱۹۱۵-۱۹۷۴) کی ابتدائی زندگی اوران کی دوسری سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ مہجور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں پروفیسر مختار الدین احمد کے سینیر معاصر تھے۔ (۱۵)

شخصیات (ہم عصروں پر مضامین)

شرف عالم آرزو جلیلی   مشمولہ ''تذکرہ کاملان بہار'' حصہ ا، پٹنہ، خدا بخش لائبریری، ۱۹۹۵

آل احمد سرور   مشمولہ ''آل احمد سرور۔ دانشور، نقاد و شاعر'' مرتبہ شاہد ماہلی، نئی دہلی
غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی   (ا) فکر و نظر (علی گڑھ) دسمبر ۱۹۹۴
(۲) قومی زبان (کراچی) فروری ۱۹۹۶

پروفیسر ابواللیث صدیقی (کچھ چراغ اور بجھے)   ہماری زبان (دہلی)، ۱۵، نومبر ۱۹۹۴

مکتوبات احتشام حسین بنام ڈاکٹر مختار الدین احمد   غالب نامہ (دہلی)، جولائی ۱۹۹۷

احمد امین سے ایک ملاقات   ۱) رسالہ اوراق (لاہور) مدیر وزیر آغا
۲) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)، یکم جون ۱۹۸۵

مصر کا ایک نامور مصنف۔ احمد امین   ۱) نقوش (لاہور)، مئی ۱۹۶۷
۲) اردو ادب (علی گڑھ) نظر ثانی اور اضافے کے بعد

اسکالر   آواز (دہلی) ۱۹۵۶
ڈاکٹر شفیق پر تأثراتی مضمون

مکاتیبِ اختر میاں جونا گڑھی   تحقیق (حیدر آباد، سندھ)، نمبر ۸، ۹: ۱۹۹۵
قاضی اختر میاں اختر جونا گڑھی (م ۱۹۵۵) کے مکاتیب جو درج
ذیل لوگوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ علامہ عبدالعزیز میمن (دو خط)
صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (ایک خط)

محمد عبداللہ خاں خویشگی (ایک خط)، سید الطاف علی بریلوی (۲۸
خط) محمد اسماعیل پانی پتی (ایک خط)، مختار الدین احمد (تین خط)۔
مقالہ نگار نے ابتدا میں مکتوب نگار پر ایک تاثراتی مضمون اور آخر
میں مکاتیب پر مفید حواشی بھی دیے ہیں۔

مکاتیب اختر کے ذیل میں اضافی معلومات۔ تحقیق (حیدر آباد، سندھ)، نمبر ۸، ۹: ۱۹۹۵

۱۹۴۷ کے علی گڑھ میگزین کے بارے میں۔ خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)؛ نمبر ۹۶: ۱۹۹۴

علی گڑھ میگزین اگست ۱۹۴۷ء کے شمارے میں اظہر امام اظہر کی
ایک نظم 'فرزندانِ قوم' سے شائع ہوئی تھی۔ اس نظم سے متعلق جرنل
کے ایڈیٹر (ڈاکٹر عابد رضا بیدار) نے مختار الدین احمد سے استفسار
کیا تھا جس کا جواب خط کی صورت میں انھوں نے دیا تھا جسے
مضمون کی صورت میں پیش نظر شمارے میں شائع کر دیا گیا جس
میں اظہر امام اظہر کے متعلق مفید معلومات ملتے ہیں اور اس میگزین
سے مختار الدین احمد صاحب کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔

تاریخ اکبری معروف بہ تاریخ قندھاری مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)؛ جلد ۶؛ نمبر ۱-۲؛ جون۔
دسمبر ۱۹۶۷

حاجی محمد عارف قندھاری کی تصنیف تاریخ اکبری مرتبہ امتیاز علی عرشی پر تبصرہ۔

عرشی صاحب کی عربی تصانیف غالب نامہ (دہلی)؛ جنوری ۱۹۹۲

کٹیلاگ آف عربک مینسکرپٹس رضا لائبریری مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)؛ جلد ۶؛ نمبر ۱-۲؛
جون دسمبر ۱۹۶۷

رام پور رضا لائبریری کے عربی خطوط کی دستی فہرست (Hand list) کی پہلی جلد مرتبہ امتیاز علی

عرشی پر تبصرہ۔اس جلد میں علوم قرآن وعلوم حدیث سے متعلق مخطوطات کا ذکر ہے۔

مکتوبات مولانا امتیاز علی عرشی تحقیق (حیدرآباد،سندھ)؛نمبر۱۲۔۱۳؛۹۸۔۱۹۹۹

۸/فروری ۱۹۴۴ء سے ۶/اپریل ۱۹۵۸ء تک کے وقفے میں لکھے گئے ۳۰ خطوط ۔ ہر خط پر مختارالدین احمد کے حواشی بھی تحریر ہیں۔

مکتوبات مختارالدین احمد مشمولہ'انجم اعظمی حیات وخدمات' مرتبہ ڈاکٹر مشرف احمد، کراچی، ۱۹۹۷

۱۳/دسمبر ۱۹۸۴ء اور ۲۰/مارچ ۱۹ء کے درمیان لکھے گئے چار مفصل خط۔

جمیل الدین عالی ۔ کچھ یادیں کچھ باتیں مشمولہ'جمیل الدین عالی ۔فن اور شخصیت ،مرتبہ ایم حبیب خاں ؛ دہلی ؛ ۱۹۸۸

حرفِ چند مشمولہ ''میلاد رضوی'' ازحضرت مولانا ظفرالدین قادری بہاری؛ لاہور؛ بزم عاشقان مصطفیٰ ۱۴۶۱ھ

تقریظ نگار کے والد ملک العلماء مولانا ظفرالدین قادری کی میلاد کی کتاب پر تقریظ بعنوان'حرفِ چند'۔یہ میلاد نامہ ملک العلماء نے سید شاہ حامد حسین ،سجادہ نشین درگاہ شاہ ارزاں (متوفی ۱۳۸۷ھ) کی فرمایش پر تحریر کیا تھا جو قلمی صورت میں محفوظ تھا۔پہلی بار بزمِ عاشقانِ مصطفیٰ ،لاہور نے ۱۴۱۶ھ میں اسے شائع کیا۔ دیباچہ ڈاکٹر مختارالدین احمد نے تحریر کیا جس میں اس میلاد نامہ کے محرک سید شاہ حامد حسین صاحب کے حالات کے علاوہ ان کے اجداد اور خانقاہ شاہ ارزاں کی پوری ادبی وروحانی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔اس ذیل میں بہار کی دیگر خانقاہوں اور ان کے موسسین کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

تقریظ بر ثلاثہ غسّالہ مشمولہ ''ثلاثہ غسّالہ' مؤلفہ حکیم حبیب الرحمٰن

مرتبہ عارف نوشاہی؛ لاہور، ۱۹۹۵ء

حکیم حبیب الرحمٰن کی تالیف 'ثلاثہ غسّالہ' جو بنگال میں لکھی جانے والی اردو، فارسی اور عربی کتابوں کی ببلیوگرافی ہے، پر تقریظ۔ جس میں حکیم حبیب الرحمٰن کے حالات کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ اس تالیف کو عارف نوشاہی نے مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا۔

مثنوی غلام رسول حسرتؔ　　　خدابخش لائبریری جرنل (پٹنہ)؛ نمبر ۵۳؛ ۱۹۹۰ء

غلام رسول حسرت عظیم آبادی (م ۱۹۴۱ء) کی ایک اردو مثنوی ''خواب حسرت عرف پٹنہ کی کہانی'' خدابخش لائبریری جرنل نمبر ۲۱۔۲۳ (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوئی تھی۔ مختارالدین احمد نے یہ اطلاع دی کہ مثنوی ۱۹۳۸ء میں کتابی شکل میں پٹنہ سے شائع ہو چکی ہے اور شاعر کی فرمائش پر انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا تھا۔ زیر نظر شمارے میں یہ مقدمہ مثنوی کی کمیابی کی وجہ سے دوبارہ شائع کیا گیا ہے جس میں شاعر کے تعارف کے ساتھ ساتھ مثنوی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ غلام حسرت، شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

مکتوبات حمید احمد خاں　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛

بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات)　۹۸۔۱۹۹۹ء

۲۳ مارچ ۴۹ء سے ۵ مئی ۶۷ء تک کے دوران لکھے گئے پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۴ء) کے ۱۹ مکتوبات۔

حمید احمد خاں کے خط　　　مشمولہ 'نثری ادب' (بی۔اے کی نصابی کتاب)

بنام مختار الدین احمد　　　　مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن؛ نذر سنز، لاہور، ۸۶ء

مختار الدین احمد کے نام کیمبرج سے بھیجے گئے ۲۷/اکتوبر اور ۲۹/دسمبر ۱۹۵۳ء کے لکھے ہوئے پروفیسر حمید احمد خاں کے دو خط۔

حمیدہ آپا　　　　مشمولہ 'بیگم حمیدہ سلطان احمد۔ ناول نگار اور مجاہد اردو'

مرتبہ شاہد ماہلی؛ نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ؛ ۱۹۹۹ء

مکتوب علی گڑھ (مختار الدین احمد معارف (اعظم گڑھ)، دسمبر ۱۹۹۷ بنام ضیاء الدین اصلاحی)

مکتوب مورخہ ۵/دسمبر ۱۹۹۷ء جس میں ہندوستان کے مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی (متوفی ۵/دسمبر ۱۹۹۹) انتقال کی اطلاع دی گئی ہے۔

دیوان فائز　　　　ہماری زبان (دہلی)، یکم جون ۱۹۶۷ء

سید شاہ نذیر الحق فائز پھلواروی (۱۲۵۹ھ۔۱۳۲۳ھ) کے فارسی دیوان مرتبہ ڈاکٹر خواجہ فضل امام پر تبصرہ۔

ممتاز حسن کے خطوط دوارکا داس شعلہ کے نام　مشمولہ ''ارمغان علمی؛ بپاس علمی وادبی ڈاکٹر وحید قریشی''　　مرتبین؛ رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی تحسین فراقی، لاہور، مجلس ادبیات مشرق، ۱۹۹۸ء

دوارکا داس شعلہ (۱۹۰۱ء۔۱۹۸۳ء) کے نام ممتاز حسن (۱۹۰۶۔۱۹۷۴) کے ۲۳ خطوط۔ تمہید میں مضمون نگار نے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے آپسی تعلقات پر تفصیل سے، نیز ان دونوں سے اپنے تعلقات پر بھی سے خاصی روشنی ڈالی ہے۔

ذاکر صاحب اپنے ایک استاد کی نظر میں　　　　جامعہ (دہلی)، جون ۱۹۸۷ء

اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ کے عربی کے مدرس مولوی محمد فیاض خاں

کاایک خط جوانھوں نے مختارالدین احمد کو اپنے شاگرد ڈاکٹر
ذاکرحسین کے بارے میں ۱۸؍اکتوبر۱۹۷۲ءکولکھا جس میں ذاکر
حسین سے ان کے تعلقات کی بھی تفصیل ہے۔

ڈاکٹر ذکی الدین: تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) دسمبر۱۹۹۱
علی گڑھ کا ایک ممتاز سائنسداں

رشیداحمد صدیقی کے چند غیر مطبوعہ خطوط غالب نامہ(نئی دہلی)؛ جنوری۱۹۹۶
رشیداحمد صدیقی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷) ۱۳خطوط بنام ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۸۹۶۔۱۹۷۸) یہ
خطوط اگست ۱۹۳۸ سے ۱۱؍مئی ۱۹۷۲ کے طویل عرصے پر محیط ہیں۔ مقالہ نگار نے جا بجا حواشی بھی دیے
ہیں اور تمہید میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ ہر دو کے آپسی تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

رمز عظیم آبادی کی شاعری مشمولہ 'رمز عظیم آبادی۔شخصیت اور فن' مرتبہ شمس الحق؛ پٹنہ، ۲۰۰۰

دیوان رکن صاین ہروی مجلۂ علوم اسلامیہ(علی گڑھ)؛ جلد۶، نمبر۱۔۲ جون۔دسمبر ۱۹۶۵
دیوان رکن صاین ہروی (متوفی ۷۶۵ھ) مرتبۂ پروفیسر سید حسن پر تبصرہ۔

مکتوب ڈاکٹر سید عبداللہ تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۲۔۱۳:
بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸۔۱۹۹۹
۲۳؍اکتوبر ۴۷ سے ۵۶ کے دوران لکھے ہوئے ۱۶مکتوبات شفیع
جاوید کے افسانوی مجموعہ ''کھلی جو آنکھ'' پر تبصرہ۔

پروفیسر منظور حسین شورؔ (کچھ چراغ اور بجھے) ہماری زبان(دہلی)؛ ۱۵؍نومبر۱۹۹۴ء

مکتوبات ڈاکٹر شوکت سبزواری تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر۱۲۔۱۳؛
بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸۔۱۹۹۹ء
۴؍جنوری ۴۹ سے ۱۶؍اپریل ۵۱ کے دوران لکھے گے

۵خطوط

مکتوباتِ شیخ محمد اکرام تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲۔۱۳؛

بنام مختارالدین احمد (علمی مکتوبات) ۹۸۔۱۹۹۹

۸/اپریل ۴۴ سے ۷/جولای (؟) تک کے درمیان لکھے گے ۳ خط

مکتوبات قاضی عبدالودود تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛

بنام شیخ محمد اکرام (علمی مکتوبات) ۹۸۔۱۹۹۹

شیخ محمد اکرام کے نام ۱۰ جنوری ۴۳ اور ۲۵/اگست ۴۳ کو لکھے قاضی عبدالودود کے دو خط جنھیں مختارالدین احمد نے اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

مکتوبات ڈاکٹر مختارالدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛ بنام شیخ محمد اکرام (علمی مکتوبات) ۹۸۔۱۹۹۹

شیخ محمد اکرام کے نام ۲/مارچ ۴۴ کا مختارالدین احمد کا لکھا خط جس میں اُن کی تصنیف ''غالب نامہ'' کے پہلے ایڈیشن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

سرضیاءالدین؛ کچھ یادیں کچھ باتیں (۱) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)؛ یکم تا ۱۶/دسمبر ۱۹۸۴

(۲) قومی زبان (کراچی)؛ ۱۹۸۵

(۳) ہماری زبان (دہلی)؛ ۲۲/فروری و یکم مارچ ۱۹۸۵

رشید احمد صدیقی کے چند غیر مطبوعہ خطوط، غالب نامہ (نی دہلی ۱۹۹۶

سید عابد حسین (۱۸۹۶۔۱۹۷۸) نام رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۲۔۱۹۷۷) کے ۱۳ خطوط۔ یہ خطوط اگست ۱۹۳۸ سے ۱۱رمی

۱۹۷۲ کے طویل عرصے پر محیط ہیں۔ مقالہ نگار نے جابجا حواشی بھی

دیے ہیں اور اپنی تمہیدی تحریر میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے آپسی

تعلقات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

حرفے چند: مشمولہ 'پیام دوست' مرتبہ عبدالقیوم اثر؛ پٹنہ: ۱۹۹۴

عبدالاحد فاطمی کے مجموعۂ مکاتیب 'پیام دوست' پر حرفے چند کے

عنوان سے فاطمی خاندان، عظیم آبادی احباب اور کچھ سوشلسٹ

کارکنوں کا تعارف۔

بابائے اردو (مولوی عبدالحق) ۱) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)؛ یکم تا

۱۵ر اگست ۱۹۸۴

۲) قومی زبان (کراچی)؛ اگست ۱۹۸۹

مولوی عبدالحق کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط قومی زبان (کراچی)؛ اگست ۱۹۹۱

مولوی عبدالحق کے ۹ خطوط بنام قاضی عبدالودود۔ مقالہ نگار نے ان خطوط پر حواشی بھی لکھے ہیں۔
آخر میں مولوی عبدالحق کے خطوط قاضی عبدالودود کے نام ۵ خطوط کے عکس بھی شامل ہیں۔

مکتوبات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۱۲، ۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

بنام مختارالدین احمد (مشمولہ علمی مکتوبات)

۱۰ر مارچ ۱۹۴۴ سے ۱۴ر اپریل ۱۹۵۸ کے دوران لکھے گے ۴۶ خطوط جن پر مختارالدین احمد کے
حواشی بھی درج ہیں:

مکتوبات قاضی عبدالودود تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۱۲، ۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

عبدالستار صدیقی کے نام ۱۳ر دسمبر ۴۷ سے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۹ کے دوران لکھے گے قاضی عبدالودود
کے خطوط۔ مختارالدین احمد نے ان خطوط پر مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔

مکتوبات عبدالماجد دریابادی — تحقیق (حیدرآبا،سندھ)،نمبر۱۲،۱۳؛۹۸۔۱۹۹۹

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات)

۲۳ر مئی ۴۹ سے ۱۷رجنوری ۵۵ کے دوران لکھے گئے ۴ خط۔

مکتوب عبدالماجد دریابادی — علی گڑھ میگزین (علی گڑھ؛) غالب نمبر ۱۹۴۹

بنام مختار الدین احمد

مقام محمود — علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)؛اگست ۱۹۴۷

نقد و نظر کے عنوان کے تحت عبدالمالک آروی کے مجموعۂ مضامین ''مقام محمود'' پر تبصرہ۔

مثنوی حیات وکائنات — ہماری زبان (دہلی)؛۱۵رمئی ۱۹۶۷

پروفیسر عبدالمجید شمس عظیم آبادی (۱۹۰۵ ۔۱۹۷۳) کی

مثنوی 'حیات وکائنات' پر تبصرہ۔

مکتوب پروفیسر مختار الدین احمد — العلم،کراچی؛جولائی۔ستمبر ۱۹۶۸

بنام عبدالمجید قریشی

اس خط میں علی گڑھ کی پرانی یادوں اور یہاں کی علمی وادبی فضا کا ذکر کیا گیا ہے۔

اشعار میر پر ایک نظر — علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)۴۸۔۱۹۴۷

''اشعار میر'' مرتبہ پروفیسر عبدالمنان

بیدل (۱۹۰۷۔۱۹۸۲)

مکتوبات مولانا غلام رسول مہر — تحقیق (حیدرآباد،سندھ)؛نمبر۱۲۔۱۳؛۹۸۔۱۹۹۹

۲۳راکتوبر ۴۴ سے ۲۵راگست ۵۲ کے دوران لکھے گئے ۲۲ خطوط جنھیں مختار الدین احمد نے اپنے قیمتی حواشی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

مکتوبات مختار الدین احمد — تحقیق (حیدرآباد،سندھ)؛نمبر۱۲۔۱۳؛۹۸۔۱۹۹۹

بنام مولانا غلام رسول مہر (علمی مکتوبات)

مولانا غلام رسول مہر (۱۸۹۵۔۱۹۷۱) کے نام یکم فروری ۵۵ اور ۱۰ر ستمبر ۵۵ کو لکھے گے دو خطوط
جس پر پروفیسر مختارالدین احمد نے اشاعت کے وقت حواشی بھی لکھے ہیں۔

مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مشمولہ ''مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ'' جلد دوم مرتبہ خالد محمود؛
زبیر پبلکیشنز لطیف آباد، حیدر آباد سندھ؛ ۱۹۹۹

۲۴ر دسمبر ۱۹۸۸ اور ۲۳ر نومبر ۱۹۸۸ کے درمیان لکھے گے ۳۱ خطوط

مکتوبات مختارالدین احمد مشمولہ ''یادگار خطبہ'' مرتبہ خالد محمود؛ زبیر پبلیکیشنز لطیف آباد،
بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں حیدر آباد سندھ؛ ۱۹۹۸

ڈاکٹر خورشید احمد فارق (م ۵/ نومبر ۲۰۰۱) معارف اعظم گڑھ)؛ جنوری ۲۰۰۲

مکتوب علی گڑھ (مختارالدین احمد معارف (اعظم گڑھ)؛ ستمبر ۱۹۹۷
بنام ضیاء الدین اصلاحی)

مختارالدین احمد کے شاگرد سید محمد فاروق بخاری کے ارتحال
(جولائی ۱۹۹۷) پر تأثرات۔ بخاری مرحوم نے مکتوب نگار
کی نگرانی میں مولانا انور شاہ کشمیری پر ریسرچ کر کے علی گڑھ
سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ مقالہ علمیہ کتابی
صورت میں کشمیر سے شائع ہو چکا ہے۔

دو بلخی برادران قومی زبان (کراچی)؛ ستمبر ۲۰۰۰

فصیح الدین بلخی اور نظام الدین بلخی پر تأثراتی مضمون

کچھ دیر سادات بلخ کے ساتھ ادراک (گوپال گنج، سیوان) شمارہ ۴؛ ۲۰۰۲

(زیرِطبع)

فصیح الدین بلخی، نظام الدین بلخی اور یوسف الدین بلخی پر تأثراتی
مضمون ۔طویل تمہید میں ہندوستان بالخصوص بہار میں سادات بلخ
کی آمد اور مشاہیر بلخ پر عربی وفارسی کے کچھ مآخذ کا تفصیلی تعارف۔

قاضی عبدالودود　　　نقوش(لاہور)؛اکتوبر۱۹۵۶شخصیات نمبر۲

قاضی عبدالودود　　　معاصر(پٹنہ)،حصہ۳۱۔۳۴؛۱۹۷۹
قاضی عبدالودود نمبر

قاضی عبدالودود۔خاندانی حالات　　　غالب نامہ(نئی دہلی)؛جنوری۱۹۸۷

قاضی صاحب　　　مشمولہ''یادگارنامہ قاضی عبدالودود''
مرتبین پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختارالدین احمد
، پروفیسر شیف حسین قاسمی؛نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ،۲۰۰۰
نقوش(اکتوبر۱۹۵۶) کا مضمون ترمیمات واضافات کے بعد

مکاتیب قاضی عبدالودود　　　قومی زبان(کراچی)؛جنوری۱۹۸۶
مقالہ نگار کے نام قاضی صاحب کے پندرہ خطوط مع حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔

مکاتیب قاضی عبدالودود　　　قومی زبان(کراچی)؛مئی۱۹۸۸
بیگم حمیدہ سلطان کے نام ایک خط، مشفق خواجہ کے نام ایک خط اور
مختارالدین احمد کے نام تین خط۔یہ سارے خطوط مقالہ نگار کے قیمتی
اور معلوماتی حواشی سے مزین ہیں۔

کچھ غالب کے بارے میں　　　غالب نامہ(نئی دہلی)؛جولائی۱۹۸۸
قاضی عبدالودود کے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام تین خط، شیخ

محمد اکرام کے نام دوخط اور اکبر علی خاں عرشی زادہ کے نام دوخط۔ ان خطوط میں زیادہ تر بحثیں غالب سے متعلق ہیں۔

غالب اور قاضی عبدالودود — غالب نامہ (نئی دہلی)، جنوری ۱۹۸۵

غالب اور متعلقات غالب پر لکھے گئے قاضی عبدالودود کے ۳۷ مضامین کا تعارف۔

مآثر غالب — ۱) مشمولہ 'مآثر غالب' مرتبہ قاضی عبدالودود

پٹنہ، خدا بخش لائبریری: ۱۹۹۸

۲) تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۷، ۱۹۹۳

قاضی عبدالودود کی تالیف 'مآثر غالب' کا تعارف جس میں غالب کی چند نادر و نایاب تحریریں جمع کی گی ہیں اور جو مختار الدین احمد کی ہی کوششوں سے مرتب ہو کر ۱۹۴۹ میں شائع ہوئی تھیں۔

مکتوبات قاضی عبدالودود بنام شیخ محمد اکرام (علمی مکتوبات) — تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳: ۹۸۔۱۹۹۹

۱۰/ جنوری ۴۳ اور ۲۵/ اگست ۴۳ کے لکھے ہوے دوخط مختار الدین احمد کے قیمتی حواشی کے ساتھ۔

مکتوبات قاضی عبدالودود بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات) — تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳: ۹۸۔۱۹۹۹

۲۶/ جنوری ۴۸ اور ۲۵/ اگست ۴۳ کے لکھے ہوے دوخط مختار الدین احمد کے قیمتی حواشی کے ساتھ۔

مکتوبات قاضی عبدالودود — تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳: ۹۸۔۱۹۹۹

۲۶/ جنوری ۴۸ سے ۳۱/ مارچ ۵۰ تک کے ۱۳ خطوط۔

مکتوبات قاضی عبدالودود تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

بنام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (علمی مکتوبات)

۱۳ر دسمبر ۱۹۴۷ سے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۹ کے دوران لکھے گئے ۳ خط جن پر مختارالدین احمد کے حواشی بھی ہیں۔

مکتوبات مختارالدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

بنام قاضی عبدالودود (علمی مکتوبات)

قاضی عبدالودود کے نام ۲ر فروری ۵۵ کو ٹیوبنگن سے لکھا ہوا خط جس میں وہ مجلس المعروف بہ 'کربل کتھا' کی بازیافت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ مختارالدین احمد صاحب نے اشاعت کے وقت اس پر تفصیلی حواشی لکھے ہیں۔

مکتوبات مختارالدین احمد تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

بنام قاضی عبدالودود (علمی مکتوبات)

قاضی عبدالودود کے نام لکھے مختارالدین احمد کے ۱۴ خطوط جو ۲ر مئی ۴۸ سے ۱۳ر اپریل ۴۹ کے عرصے پر محیط ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کے کچھ غیر مطبوعہ قومی زبان (کراچی) اگست ۱۹۹۱

قاضی عبدالودود کے نام مولوی عبدالحق کے ۹ خطوط۔ مختارالدین احمد نے ان خطوط پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

قیوم قواد ۱) علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)؛ ۱۹۵۴؛ طنز و ظرافت نمبر، مرتبہ ظہیر احمد صدیقی

۲) مشمولہ (تذکرہ کاملان بہار' حصہ ۲؛ پٹنہ، خدا بخش لابریری؛ ۱۹۹۵

تلاش و تحقیق مصنفہ کاظم علی خاں (تبصرہ) ۱) ہماری زبان (دہلی)؛ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۹

۲) آجکل (دہلی)؛؟۱۹۸۹

کالی داس گپتا رضا — قومی زبان (کراچی)؛ مئی ۲۰۰۱

کالی داس گپتا رضا؛ مصنف، شاعر اور کتابوں کا عاشق — ہماری زبان (دہلی)؛ یکم تا ۲۸/جون ۲۰۰۱ کالی داس گپتا رضا نمبر

غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں؛ تعارف وجائزہ — غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جولائی ۱۹۹۲

کالی داس گپتا رضا کی تصنیف ''غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں'' غالب پر لکھے گئے ان کے دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ پیش نظر مضمون میں ان مضامین کا الگ الگ تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے ؛(۱) غالب کی زندگی میں مطبوعاتِ غالب (۲) دیوان غالب اردو (۳) غالب کی متنازعہ رباعی پر ایک نظر (دل رک کر بند ہوگیا ہے غالب ..الخ) (۴) غالب کے ایک قطعے کی اولین شرح (۵) کنز المطالب شرح دیوان غالب (۶) پنج آہنگ کے چند اہم نسخے (۷) مثنوی بیان نموداری شان نبوت وولایت (۸) مہر نیم روز کا نسخۂ ارسطو جاہ (۹) غالب کی زندگی میں مہر نیم روز کی اشاعتیں (۱۰) دعاے صباح۔

مالک رام — نقوش (لاہور)، اکتوبر ۱۹۵۶ شخصیات نمبر ۲

مالک رام — قومی زبان (کراچی) اپریل ۱۹۹۴

یہ مقالہ اس استقبالیہ جلسہ میں پڑھا گیا جو مالک رام کے اعزاز میں ۱۴/ اگست کو ناب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی کوٹھی پر ان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کا اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا۔

مالک رام۔ ایک تعلق کا سفر نامہ — قومی آواز (دہلی)، ضمیمہ؟

سلیقے کے پیکر۔ مالک رام — روز نامہ منصف (حیدر آباد)، سنڈے، ایڈیشن ۱۸/ اگست ۱۹۹۱

خطوط مالک رام　　　　　　　　　غیر مطبوعہ

خطوط مالک رام مرتبہ شمیم جہاں (انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۹۷

) کا تعارف وتبصرہ۔ یہ مقالہ بوجوہ شائع نہ ہوسکا۔

مکتوبات مالک رام　　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر۱۲۔۱۳، ۹۸۔۱۹۹۹

۱۷/نومبر ۴۸ سے ۲۹/اپریل ۵۰ تک کے دوران لکھے گئے ۱۳ خطوط

جن پر مختار الدین احمد کے حواشی درج ہیں۔

مکتوبات مالک رام　　　　　تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر۱۲۔۱۳، ۹۸۔۱۹۹۹

مالک رام کے نام ۴/فروری ۵۵ کو ٹیوبنگن سے لکھا خط جس میں فضلی

کی کربل کتھا کی بازیافت کی خوشخبری دی گئی ہے۔

مکتوبات محفوظ الحق　　　　　خدابخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، نمبر۱۲۰؛ جون ۲۰۰۰

فارسی واردو کے ایک ممتاز مصنف اور محقق محفوظ الحق

(۱۹۰۰۔۱۹۴۶) کے ۱۲ خالص علمی خطوط جو درج ذیل لوگوں کو لکھے

گئے ؛ (۱) صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۔ ۲ خط

(۲) نصیر الدین ہاشمی ۔ ۳ خط (۳) سید الطاف علی بریلوی ۔ ایک

خط (۴) مختار الدین احمد۔ ۱۵ خط۔ تمام خطوط کو قیمتی اور معلوماتی

حواشی سے مزین کیا گیا ہے۔ آغاز میں مکتوب نگار پر ایک تعارفی

وتاثراتی مضمون بھی شامل ہے۔

محمد احمد عثمانی (کچھ چراغ اور بجھے)　　　　　ہماری زبان (دہلی)، ۱۵ نومبر ۱۹۹۴

طہماس نامہ؛ تصنیف محکم الدولہ اعتقاد جنگ　　غالب نامہ (نئی دہلی)، جنوری ۱۹۸۸

طہماس بیگ خاں رومی

سعادت یار خاں رنگین کے والد طہماس خاں کے حالات اور تاریخ پر اس کی تصنیف 'طہماس نامہ' کا تعارف و تبصرہ جسے پروفیسر محمد اسلم نے ایڈٹ کر کے لاہور سے شائع کیا۔

مکتوبات ڈاکٹر مولوی محمد شفیع — تحقیق (حیدر آباد، سندھ) نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

بنام مختار الدین احمد (علمی مکتوبات)

۹؍مارچ ۱۹۴۷ سے ۱۳؍دسمبر ۱۹۶۵ تک کے دوران لکھے گے ۶ خطوط جن پر پروفیسر مختار الدین احمد کے حواشی بھی درج ہیں۔

محمد طفیل — نقوش؟

محمد طفیل کی یاد میں — نقوش، شمارہ ۱۳۶، دسمبر ۱۹۸۷

یہ مضمون ہمیلٹن ہوٹل لاہور میں منعقد نقوش طفیل نمبر کی تقریب رونمائی ۶؍جولائی ۱۹۸۷ میں جنرل ضیاء الحق کی صدارت میں پڑھا گیا۔

طفیل صاحب سے ایک ملاقات — ۱) ہماری زبان (دہلی)، ۸؍مارچ ۸۷

۲) الفاظ علی گڑھ جنوری ۲۰۰۱

مولانا سید محبوب حسین — مشمولہ 'تذکرہ کاملان بہار'، حصہ ۲؛ پٹنہ، خدا بخش لا بریری؛ ۱۹۹۵

ڈاکٹر مختار احمد انصاری — روزنامہ انصاری (دہلی)، ؟ ۱۹۳۶

مکتوبات مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، تحقیق (حیدر آباد، سندھ)، نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

۲۶؍اکتوبر ۱۹۵۱ سے ۲۱ فروری ۶۹ کے دوران لکھے گئے ۹ مکتوبات۔

ڈاکٹر مسعود احمد؛ حیات اور نثری خدمات۔ مشمولہ؛ ڈاکٹر مسعود احمد؛ ''حیات اور نثری خدمات'' مرتبہ اعجاز انجم؛ کراچی، ۲۰۰۲ء

اعجاز انجم کے مقالہ علمیہ پر، جس پر انھیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی، لکھی گئی تقریظ۔

پروفیسر مسعود حسن — ۱) معارف (اعظم گڑھ)؛ ستمبر ۱۹۹۲ء

پروفیسر مسعود حسن ۲) روزنامہ قومی تنظیم (پٹنہ)؛ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ء

پروفیسر مسعود حسن (بعد نظر ثانی و اضافہ) ۳) تحقیقات اسلامی (علی گڑھ)؛ جون ۱۹۹۳ء

دانا پور (پٹنہ) کے رہنے والے عربی فارسی کے پروفیسر اور مقالہ نگار کے بچپن کے دوست پر ایک تأثراتی مضمون جوان کی وفات (مئی ۱۹۹۲ء) کے فوری بعد لکھا گیا۔ 'تحقیقات اسلامی' میں نظرِ ثانی اور اضافے کے بعد شائع ہوا۔ قومی تنظیم میں اس کی تلخیص شائع ہوئی۔

پروفیسر مختار الدین احمد کا مکتوب گرامی معارف (اعظم گڑھ)؛ دسمبر ۱۹۹۲ء

(بنام ضیاء الدین اصلاحی)

پروفیسر مسعود حسن پر معارف، دسمبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون پر مزید اضافہ عربی کے بعض مخطوطات کا ذکر۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری ۱۹۹۳ء؛ مسعود حسن رضوی نمبر

مکاتیب مسعود حسن رضوی غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری ۱۹۹۳ء؛

بنام پروفیسر مختار الدین احمد مسعود حسن رضوی نمبر

مسعود حسن رضوی ادیب کے ۶ خطوط۔ مکتوب الیہ نے اشاعت کے وقت ان خطوط پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

مسعود حسین خاں؛ چند تاثراتی نقوش مشمولہ 'نذر مسعود' مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ

۱) علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

۲) ملتان، بیکن بکس؛ ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر معظم حسین ۱) معارف (اعظم گڑھ)؛ نومبر ۱۹۹۲ء

۲) تحقیقات اسلامی (علی گڑھ)؛ ستمبر ۱۹۹۳ء

عربی واسلامیات کے ایک جلیل القدر عالم، ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابق صدر اور وہاں کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر معظم حسین کا تذکرہ جو پہلے معارف (اعظم گڑھ) میں شائع ہوا بعد میں اضافے اور نظرِ ثانی کے بعد تحقیقات اسلامی میں شائع ہوا۔

چند ادبی مسائل (تبصرہ) ہماری زبان (دہلی) یکم مئی ۱۹۶۷ء

پروفیسر شاہ مقبول احمد کے مجموعہ مضامین 'چند ادبی مسائل' پر تبصرہ

ممتاز حسن کے خطوط بنام دوارکا داس شعلہ مشمولہ ''ارمغان علمی: بپاس علمی وادبی ڈاکٹر وحید قریشی''

مرتبین: رفیع الدین ہاشمی، عارف نوشاہی و تحسین فراقی؛ لاہور، مجلسِ ادبیات مشرق؛ ۱۹۹۸ء۔

ممتاز حسن (۱۹۰۶ـ۱۹۷۴ء) کے ۲۳ خطوط لالہ دوارکا داس شعلہ (۱۹۱۰ـ۱۹۸۳ء) کے نام۔ ابتدا میں مضمون نگار نے تمہید کے طور پر مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے آپسی تعلقات نیز ان دونوں سے اپنے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مکتوب گیلانی بنام مالک رام معارف (اعظم گڑھ)، نومبر ۱۹۸۹ء

مولانا سید مناظر احسن گیلانی (۱۸۸۲ء۔۱۹۵۶ء) کا ایک مکتوب جوانہوں نے مالک رام کی مشہور زمانہ تصنیف 'عورت اور اسلامی تعلیم' کے مطالعہ کے بعد مصنف کو لکھا تھا۔ تمہید میں مختار الدین احمد نے مناظر احسن گیلانی، مالک رام اور ان کی زیر بحث تصنیف پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

مکتوب گیلانی بنام غلام دستگیر رشید صحیفہ (لاہور)؛ مئی جون ۱۹۸۹ء

مولانا مناظر احسن گیلانی کے پانچ خط تمہید اور حواشی کے ساتھ۔

منٹو ایک نیم علیگی — علیگ (علی گڑھ)؛ ۱۰/فروری ۱۹۵۷ء

مکتوبات مہیش پرشاد — تحقیق (حیدر آباد، سندھ)؛ نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹ء

۲۱/جون ۱۹۴۸ء کے دوران لکھے گئے ۴ خطوط۔

علامہ میمن کا ایک نہایت ممتاز شاگرد — تحقیق (حیدر آباد، سندھ)، نمبر ۹، ۱۰؛

نبی بخش بلوچ پر تفصیلی تأثراتی مضمون ۔ تمہید میں علامہ عبدالعزیز میمن کے بیسیوں اہم شاگردوں اور ان کی علمی کوششوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

پروفیسر نجم الاسلام — ہماری زبان (دہلی)؛ یکم تا ۷/اپریل ۲۰۰۱ء

سندھ یونیورسٹی، جام شورو، حیدر آباد (سندھ) کے شعبۂ اردو کے مجلّہ 'تحقیق' کے مدیر اور اردو فارسی کے نامور محقق پروفیسر نجم الاسلام کی وفات (۱۳/فروری ۲۰۰۱ء) پر ایک تعزیتی و تأثراتی مضمون۔

ڈاکٹر نجم الاسلام — قومی زبان (کراچی)، مئی ۲۰۰ء

ڈاکٹر نجم الاسلام پر ایک پُر از معلومات مضمون ۔ اس میں مرحوم کے مقالات کی تفصیلی فہرست بھی پیش کی گئی ہے۔

نجیب اشرف صاحب کے چند خطوط — نوائے ادب (بمبئی)؛ جنوری ۱۹۶۹

چھ خطوط مقالہ نگار کے نام اور دو خطوط خواجہ حمید الدین شاہد کے نام ۔ ان تمام خطوط پر مقالہ نگار نے حواشی بھی تحریر کیے ہیں:

مکتوبات ندوی صاحب مرحوم — نوائے ادب (بمبئی)؛ جنوری ۱۹۸۶

بنام خواجہ حمید الدین شاہد

دو بلخی برادران　　　　　　　قومی زبان (کراچی)؛ستمبر ۲۰۰۰

نظام الدین بلخی اور فصیح الدین بلخی پر تاثراتی مضمون

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ایک محقق　　　　　　مشمولہ ''پروفیسر نورالحسن ہاشمی۔محقق، نقاد اور شاعر''

مرتب شاہد ماہلی؛ نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ؛ ۱۹۹۹

مکتوب نیاز فتح پوری بنام مختار الدین احمد　　　　علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۴۹

مکتوبات نیاز فتح پوری بنام مختار الدین احمد، تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲۔۱۳؛ ۹۸۔۱۹۹۹

(علمی مکتوبات)

۸/اکتوبر ۳۸ء سے ۲۰/اکتوبر ۵۲ تک کے گیارہ خطوط

مغز مرغوب و چہار شہادت　　　　　　　ہماری زبان (دہلی)؛؟

میرانجی شمس العشاق کی تصنیف ''مغز مرغوب و چہار شہادت'' مرتبہ محمد ہاشم علی پر تبصرہ۔

یگانہ چنگیزی کے حالات　ایک غیر مطبوعہ تذکرہ میں　　قومی زبان (کراچی)، مئی ۲۰۰۰ء

ایک نامکمل و ناتمام تذکرہ ''تذکرہ تلامذہ شاد عظیم آبادی'' سے یگانہ

چنگیزی کے حالات۔ یہ تذکرہ اب ناپید ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف　　　　　　　برہان (دہلی)، ستمبر ۱۹۷۹

عربی کے ایک ممتاز عالم، کراچی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر

اور صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر سید محمد یوسف (۱۹۱۶۔۱۹۷۸) پر تاثراتی

مضمون۔

سید یوسف الدین احمد بلخی باطن　　　　خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)؛ نمبر ۱۲۱؛ ستمبر ۲۰۰۰

کچھ دیر سادات بلخ کے ساتھ　　　　　ادراک (گوپال گنج، سیوان) مرتبہ سید حسن عباس؛ شمارہ

نمبر ۴ (زیر طبع)

یوسف الدین احمد بلخی ،نظام الدین بلخی اور فصیح الدین احمد بلخی پر تأثراتی مضمون ۔طویل تمہیدی تحریر میں ہندوستان بالخصوص بہار میں سادات بلخ کی آمد اور مشاہیر بلخ پر عربی و فارسی میں موجود مواد اور مآخذ کا تفصیلی تعارف۔

شخصیات۔ مستشرقین

ڈاکٹر اسٹرن مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد ۱۰، نمبر ۱۔۲؛

جون۔ دسمبر ۱۹۶۹ء

آکسفورڈ میں مضمون نگار کے دوست ممتاز مستشرق سیمویل اسٹرن کی وفات (متوفی ۱۹۶۹ء) پر تأثراتی مضمون۔ یہ بہت اہم مضمون ہے جو ممتاز مستشرق سیمویل پر ہے طلباء و اسکالر کے لیے بہ طور خاص یہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اردو میں اس طرح کا مواد کم ملتا ہے

کتابت الصید نہ کے کچھ الفاظ اورینٹل کالج میگزین (لاہور)

ڈاکٹر میشیل حنّا الخوری سوریا کے نامور اہل قلم اور مقالہ نگار کے دوستوں میں تھے۔ ڈاکٹر میشیل کے عربی مقالے کے اردو ترجمہ ''کتاب الصید نہ کے کچھ الفاظ'' (از محمد اجمل اصلاحی) پر محنّا الدین احمد کی لکھی ہوئی تمہید اور مشیل الخوری پر ایک تأثراتی مضمون۔ حنا الخوری کی زبان و ادب میں جو خدمات ہیں وہ ناقابل بیان ہیں یقیناً تاریخ میں ان کا نام نامی آباد رہے گا اور طالبان علم و عرفاں ان کی کاوشوں کو بھلا نہیں سکتے۔

تذکرۂ علماء وصوفیاء

نزہتہ الخواطر میں بہار کے علماء ومشاہیر کا ذکر، مشمولہ ''عربی، فارسی علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ''، مرتبہ سید اطہر شیر؛ پٹنہ، ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی؛ ۱۹۸۳ء

مفتی صدرالدین آزردہ کی کچھ نایاب وکمیاب تحریریں	غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جولائی ۱۹۸۱ء

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (م ۱۲۸۵ھ) کی ۱۳/ عربی وفارسی کی نایاب وکمیاب کتابوں کا تعارف، نیز ان کے کچھ اردو اشعار۔ ان کے ۶۰ فارسی خطوط جو رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہیں جنہیں مضمون نگار نے مرتب کیا ہے وہ جلد ہی شائع ہوں گے میرا اپنا خیال ہے کہ ان خطوط کو منظر عام پر آنے کے بعد ان کی اہمیت وافادیت بہت بڑھ جائے گی اور ان خطوط سے استفادہ بھی عام ہو جائے گا

مولانا احسن مارہروی:	دائرہ (کراچی)؟
کچھ یادیں کچھ باتیں	روزنامہ قومی آواز (دہلی)، ضمیمہ؟
امام احمد رضا کا شخصیتی جائزہ	المیزان (بمبئی) اپریل ۱۹۷۶، امام احمد رضا نمبر

ہندوستان کا ایک بے حد ممتاز مصنف: فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۳۴، شمارہ ۴، ۱۹۹۷
احمد رضا خاں فاضل بریلوی

ملفوظات فاضل بریلوی فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۳۵، شمارہ ۱۲، ۱۹۹۸

اپنی طویل تمہید میں مقالہ نگار نے ملفوظاتی ادب کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ فارسی ملفوظات کے جو اردو تراجم ہو چکے ہیں، ان کی فہرست پیش کی ہے اسکے بعد اردو ملفوظات کی ابتدا و ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے ملفوظات فاضل بریلوی کے ملفوظات جو مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے تھے اس کی فہرست سامنے آنے سے طلباء و اساتذہ کو اس سے استفادہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے اور غیر فارسی داں حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور ان کے ملفوظات، معارف رضا (کراچی)، شمارہ ۱۴/ اگست ۱۹۹۴

ملفوظات ادب کی تاریخ پر مشتمل تمہیدی حصہ پیش نظر مضمون میں حذف کر دیا گیا ہے۔

نوادر رضا اعلی حضرت (بریلی)؛ جولائی ۲۰۰۱

اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کا ایک فتویٰ اور رویت ہلال پر دو مختصر رسالے کا تعارف مع عکس۔

مولانا بدرالدین احمد مرحوم کا آخری مکتوب حجاز جدید (دہلی)، نومبر ۱۹۹۲
(بنام مختار الدین احمد)

مولانا بدالدین احمد قادری رضوی (متوفی ۸/ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ/ ۱۳/ مارچ ۱۹۹۲) کا ایک مکتوب جو آخری مکتوب ثابت

ہوا۔

مولانا (سعید احمد) اکبر آبادی کی ڈائری جامعہ (دہلی)، دسمبر ۱۹۸۶ کے آخری اوراق

سطحیات سید سلیمان ندوی نگار (لکھنؤ)، دسمبر ۱۹۴۰

مولانا سید سلیمان ندوی کے اردو مجموعۂ مضامین ''نقوش سلیمانی'' پر تبصرہ۔ عنوان مدیر نگار کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہ تبصرہ م۔ا ے کے نام سے شائع ہوا تھا۔

نقوش سلیمانی جدید اردو (کلکتہ)؛ جنوری ۱۹۴۱

مولانا سید سلیمان ندوی کے مجموعہ مضامین ''نقوش سلیمانی'' پر تبصرہ، بعد نظر ثانی۔

نقوش سلیمانی جدید اردو (کلکتہ)؛ مئی ۱۹۴۲

ماہنامہ ''نگار'' بابت دسمبر ۱۹۴۰ میں ''نقوش سلیمانی'' پر (م۔ا) کا تبصرہ بعنوان ''سطحیات سید سلیمان ندوی'' شائع ہوا تھا، اور یہی مضمون بعنوان ''نقوش سلیمانی'' پرویز شاہدی کے رسالہ جدید اردو (کلکتہ) جنوری ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا جس کا جواب ماہنامہ ندیم (گیا) جولائی ۱۹۴۱ء میں اغنا طیوس بہاری (سید صباح الدین عبدالرحمٰن) نے دیا تھا۔ پیش نظر مضمون اسی کا جواب الجواب ہے۔

ملا محمد سعد پٹنوی مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۳، نمبر ۲، دسمبر ۱۹۶۲

عہد شاہ جہاں کے ایک عظیم آبادی مصنف کے مختصر حالات درج کیے ہیں اور ان کی دستیاب شدہ تصانیف کی فہرست پیش کی ہے۔

شیخ محمد طیب عرب مکّی رامپوری فکر و نظر (علی گڑھ)، جلد ۳۷، شمارہ ۳؛ ۲۰۰۰

معقولات کے ایک جید عالم شیخ محمد طیب عرب مکّی رامپوری (متوفی

۱۳۳۴ھ) کے حالاتِ زندگی اوران کی بعض تصانیف کا
ذکرکیاگیاہے۔

ملک العلماء مشمولہ'تذکرہ کاملان بہار'جلد۱؛ پٹنہ،خدابخش لائبریری،۱۹۹۵
مقالہ نگار کے والد ملک العلماء مولانا ظفرالدین قادری کا تذکرہ مع
فہرست تصانیف۔

مکتوب پروفیسر مختارالدین احمد جہانِ رضا،لاہور؛اکتوبر۔نومبر ۱۹۹۸
بنام اقبال احمد فاروقی
اس مکتوب میں ملک العلما مولانا ظفرالدین قادریؒ کی چارجلدوں
پرمشتمل تصنیف ''حیات اعلی حضرت'' کی عدم اشاعت کا سبب
اوراس سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کی پوری تفصیل پیش کی
ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ حسینی بلگرامی مجلۂ علوم اسلامیہ(علی گڑھ)،جلد۱۴،نمبر۱۔۲،۱۹۸۸
علامہ سید مرتضیٰ حسینی بلگرامی (۱۱۴۵ھ۔۱۲۰۵ھ) کا تذکرہ

مغزمرغوب وچہارشہادت ہماری زبان(دہلی)
میرانجی شمس العشاق کی تصنیف ''مغزمرغوب وچہارشہادت''
مرتبۂ محمد ہاشم علی پرتبصرہ۔

تذکرۂ ادبا،شعرا ومشاہیر (اردو وفارسی)

تعارف؛وفیات مشاہیر بہار مشمولہ ''وفیات مشاہیر بہار؛ ۱۹۴ سے ۱۹۹۹ تک کا اشاریہ''

مرتبہ ڈاکٹر سید شاہد اقبال؛ دہلی؛ ۲۰۰۰

اپنے طویل تعارف میں مضمون نگار نے عربی، فارسی اور اردو میں مرتب شدہ وفیات ناموں کی مکمل تاریخ پیش کی ہے۔

آبرو کے دو مخمس معاصر (پٹنہ)، حصہ ۹، جنوری ۱۹۵۶

کنگس کالج کیمبرج یونیورسٹی میں محفوظ دیوان آبرو کے نسخے سے دو مخمس، نسخے کے تعارف کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں۔

غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب اردو ادب (علی گڑھ)، جولائی۔دسمبر ۱۹۵۲

سید ابن حسن خاں (مصنف برہان اودھ، قلمی) کے مختصر حالات زندگی اور ان کے نام غالب کا ایک نو دریافت شدہ فارسی خط شائع کیا ہے۔ وہ خط بھی مضمون میں پیش کیا گیا ہے جس کے جواب میں غالب نے انہیں یہ خط لکھا تھا۔

کلام احمد علی شاہ رامپوری معاصر (پٹنہ)، مئی جون ۱۹۴۳

جمعے جئے متر ارمان؛ حیات وخدمات قومی زبان (کراچی)، ستمبر ۱۹۸۵

ڈاکٹر رئیس انور کی تصنیف ''جنمے جئے مترا رمان؛ حیات وخدمات
''پر تبصرہ۔اس ذیل میں جنمے جئے مترا رمان اوراس کے تذکرے
''نسخہ دلکشا'' کا تعارف۔

علامہ اقبال کا ایک نو دریافت خط کے بارے میں ہماری زبان (دہلی)، ۱۵؍اپریل ۱۹۹۷

۲۲؍مارچ ۱۹۹۷ کے ہماری زبان کے شمارے میں پروفیسر سید محمد
عقیل (الٰہ آباد یونیورسٹی) نے اقبال کا ایک خط بنام اکبرالٰہ آبادی
بعنوان 'علامہ اقبال کا نو دریافت خط' شائع کرایا۔مختارالدین
احمد صاحب نے ۱۵؍اپریل کے شمارے میں یہ اطلاع دی کہ یہ خط
نہ تو نو دریافت ہے اور نہ ہی غیر مطبوعہ۔یہ پورا خط شیخ محمد عطاء اللہ
کے مرتب کردہ 'اقبال نامہ اور 'کلیاتِ مکاتیب اقبال' مرتبہ سید مظفر
حسین برنی میں شائع ہو چکا ہے۔

کلام اقبال کے عربی تراجم مشمولہ 'اقبال۔فکروفن' مرتبہ سید اطہر شیر؛ پٹنہ،
ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، ۱۹۸۸

ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ کی طرف سے ۱۹۸۷ میں علامہ
اقبال پر منعقدہ سمینار میں پڑھا گیا مقالہ۔

خطوط اکبر علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)، ۱۹۵۱، اکبر نمبر

اکبرالٰہ آبادی کے ۳۶ خطوط مختلف مصادر سے تلاش کر کے مرتب
کیے گئے ہیں۔خطوط پر مرتب کے مفید حواشی بھی ہیں۔

اکبر خطوط ہمایوں (لاہور)، جون ۱۹۵۳

سید انشاء کی ایک نادر تصنیف مشمولہ 'ارمغان مالک' مرتبۂ گوپی چند نارنگ

؛نئی دہلی،مجلس ارمغان مالک؛۱۹۷۱

سیدانشاء اللہ خاں انشاء (م۱۲۳۲ھ) کی ایک نادر تصنیف 'مطرالمرام' (فارسی) کا تعارف جس کا واحد نسخہ جون ریلینڈ لائبریری ، مانچسٹر میں محفوظ ہے ۔ یہ کتاب دراصل خود انشاء کا حضرت علی کی شان میں صنعت مہملہ میں لکھے ہوئے اردو قصیدہ 'طور الکلام' کی شرح ہے۔

مکتوب علی گڑھ (مختارالدین احمد کا خط بنام ضیاءالدین اصلاحی، مدیر معارف) معارف (اعظم گڑھ)، جون۱۹۹۵

نومبر۱۹۹۴ کے معارف میں 'اخبار علمیہ' کے تحت لفظ 'ایلتمش' کی بحث پر مزید اضافہ۔

غالب کا ایک معاصر نواب امیرحسن خاں بسمل غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری،۱۹۹۸

امیرحسن خاں بسمل کے حالات وتصانیف کے تذکرے کے بعد مقالے کے آخر میں بسمل کے ایک ناقص الطرفین فارسی دیوان (مخزونۂ کتب خانہ تکیہ شریف کاکوری) کا عکس بھی شائع کیا گیاہے۔

خواجہ غلام غوث بےخبرؔ غالب نامہ (نئی دہلی)؛ زیرطبع

بالمکند بےصبرؔ ہماری زبان (علی گڑھ)؛ یکم جولائی ۱۹۵۷

میرحسن علی تجلی غالب نامہ (نئی دہلی)، جولائی ۲۰۰۰، میرنمبر

میرتقی میرؔ کے ہمشیرزادہ شاگرد میرحسن علی تجلی کا تذکرہ

تجلی دہلوی ہماری زبان (علی گڑھ)؛۱۵رمئی ۱۹۵۷

میر حسن علی تجلی کا دیوان | دلی کالج میگزین (دہلی)؛۱۹۶۲، میر نمبر

دیوان تجلی کے اس نسخے کا تعارف جو مختار الدین احمد کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ ہے۔

متفرقات تفتہ؛ کچھ منشی ہرگوپال تفتہ کے بارے میں | غالب نامہ (دہلی)، جنوری ۱۹۸۴

تفتہ کی متعدد تحریروں کا تعارف

تفتہ کی تضمین گلستاں | غالب نامہ (دہلی)، جنوری ۱۹۹۰

تضمین گلستاں کے ایک قدیم مطبوعہ نسخے کا تعارف

سالِ وفات جوشش عظیم آبادی | معاصر (پٹنہ)، حصہ ۳۸؛ ۱۹۸۳

شیخ محمد روشن جوشش کا سالِ ولادت کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد مرتبینِ دیوانِ جوشش نے صرف اتنا لکھا ہے کہ جوشش کم از کم ۱۲۱۶ھ تک زندہ تھا۔ مختار الدین احمد نے دیوانِ ناسخ کے ایک نسخے سے اس کا سالِ وفات ۱۲۳۶ھ ثابت کیا ہے۔

رسالۂ قافیہ از جوشش عظیم آبادی | تحقیق (حیدر آباد، سندھ)، نمبر ۱۴ (زیر ترتیب)

جوشش کے ایک غیر مطبوعہ رسالے کا تعارف جو کتب خانۂ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

حالی کی دو کمیاب تحریریں | فکر و نظر (علی گڑھ)؛ ۱۹۷۱

حالی کی چند کمیاب تصانیف | غالب نامہ (نئی دہلی؛ جولائی ۲۰۰۲

شاہ حاتم کا فارسی دیوان | معاصر (پٹنہ)، حصہ ۲؛ جنوری ۱۹۵۲

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ منیر عالم میں محفوظ شاہ حاتم

کے دیوان فارسی (مکتوبہ مکند سنگھ فارغ در ۱۱۹۵ھ) کا تعارف۔

دیوان حاتم دہلوی　　　مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد ۱۰، نمبر ۱-۲، جون، دسمبر ۱۹۶۹

دیوان فارسی نسخہ علی گڑھ مکتوبہ مکند سنگھ فارغ دہلوی کا تعارف۔

انتخاب دیوان حاتم دہلوی　　　علی گڑھ میگزین مرتبہ سید امین اشرف

حاتم دہلوی کا تعارف اوران کے فارسی دیوان کا انتخاب

دیوان حافظ اور تفاؤل　　　۱) ایشیا (میرٹھ)؛ مرتبہ ساغر نظامی؛ ۱۹۳۹

۲) سر سید ہال میگزین (علی گڑھ)؛ ۱۹۵۱

غلام یحیٰ حضور　　　ہماری زبان (علی گڑھ)؛ ۸/و۲۲/اپریل ۱۹۵۷

علی گڑھ میں تصانیف خسرو کے قلمی نسخے ، بازیافت نمبر ا، مجلۂ شعبۂ اردو، اورینٹل کالج لاہور؛ ۲۰۰۲

خیراتی خاں دلسوز　　　ہماری زبان (علی گڑھ)؛ ۱۵ و ۲۲/مارچ ۱۹۵۵

اشعار ذوق　　　ہماری زبان (علی گڑھ)؛ ۲۲/مئی و یکم جون ۱۹۵۷

عمدۃ المنتخبہ (سَروَر)، عیار الشعرا (خوب چند ذکا) اور تذکرۂ صدرالدین آزردہ سے ذوق کے تراجم اوران کے اشعار درج کیے گئے ہیں جن میں سے بیشتر ذوق کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے۔

راجا راج کشن راجا　　　غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری ۱۹۹۹

بنگال کے ایک قدیم اردو و فارسی شاعر اور مرزا جان تپش دہلوی کے

شاگرد راجا راج کشن راجا کا تذکرہ جس کے باقیات میں صرف
ایک اردو مثنوی ''جہاں شاہ جہاں بانو'' ملتی ہے اس کے اردو کے
چاروں دیوان اب مفقود ہیں لیکن خوش قسمتی سے چاروں دواوین
پر تپش دہلوی کے لکھے ہوئے دیباچے محفوظ ہیں جسے مختار الدین احمد
اب شائع کرنا چاہتے ہیں۔

راجا رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ آجکل (دہلی)، جون ۱۹۵۶

راجا رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ گارساں دتاسی کے
نام

تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ ادبی دنیا (لاہور)؛ دسمبر ۱۹۴۰

تاریخ کے ابتدائی حصے پر فاضلانہ اور محققانہ تبصرہ

مرزا رحیم بیگ ہماری زبان (دہلی)؛ یکم ستمبر ۱۹۸۳

دہلی یا اطراف دہلی کے ایک شاعر مرزا رحیم بیگ اور ان کی ایک
مطبوعہ تصنیف (۱۶ صفحات کا کتابچہ) 'واسوخت رحیم' کا تعارف۔

قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی فکر و نظر (علی گڑھ)؛ مرتبہ سید نور الحسن نقوی؛ نامورانِ
علی گڑھ نمبر حصہ دوم

سرسید کے ایک عظیم آبادی معاصر کا مفصل تذکرہ

دیوانِ رکن صاین ہروی مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد ۶، نمبر ۱-۲؛ جون۔ دسمبر ۱۹۶۵

دیوان رکن صاین ہروی (متوفی ۷۶۵ھ) مرتبۂ
پروفیسر سید حسن پر تبصرہ

مخمس رنگین ہماری زبان (علی گڑھ)؛ یکم اپریل و ۸/ اپریل ۱۹۵۷

محمد امان نثار کی غزلوں پر سعادت یار خاں رنگین کے دو مخمس
جو غیر مطبوعہ ہیں۔

طہماس نامہ؛ تصنیف محکم الدولہ اعتقاد جنگ غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری ۱۹۸۸
طہماس بیگ خاں رومی
سعادت یار خاں رنگین کے والد طہماس بیگ خاں کے حالات
زندگی اور اس کی تصنیف ''طہماس نامہ'' کا تعارف جسے پروفیسر
محمد اسلم نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

سیر دہلی از ریاض الدین امجد صبح (دہلی)؛ ۱۹۶۲
سرّ غالب در حدیث دیگراں احمد، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۰
شیخ محمد ریاض الدین امجد کی تصنیف ''سیر دہلی'' سے مصنف کی
غالب سے ملاقات و گفت و شنید کا حال۔

کچھ سیاح شاگرد غالب کے بارے میں غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری ۱۹۸۹
سید الشعراء حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم و مغفور عالم گیر (لاہور)؛ اکتوبر ۱۹۳۸
مقالے کے آغاز میں مقالہ نگار کی طرف سے یہ اطلاع بھی درج
ہے ''میں آجکل شاد عظیم آبادی مرحوم پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔
زیر نظر مضمون اسی کتاب کے کچھ ابواب ہیں جو عالمگیر کے صفحات
کی قلت کی وجہ سے بحالت اختصار پیش کیے جاتے ہیں۔

سرّ غالب در حدیث دیگراں مشمولہ ''احوال غالب'' مرتبہ مختار الدین احمد؛ دہلی، انجمن
ترقی اردو ہند؛ ۱۹۵۳
تذکرۂ جلوۂ خضر سے فرزند احمد صفیر بلگرامی کی غالب سے ملاقات

کا ذکر۔

شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین خاں دہلوی ۱) دلی کالج میگزین (دہلی)؛ ۱۹۵۰

۲) نقوش (لاہور)؛ جنوری ۱۹۶۳

سالنامہ (اضافہ وترمیم کے ساتھ)

غالب کے ایک مکتوب الیہ ضیاء الدین خاں دہلوی کا تذکرہ۔

غالب کے خطوط ۔ ایک قدیم مجموعے میں آجکل) (دہلی)؛ مارچ ۱۹۶۷

شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں دہلوی کی تالیف 'انشائے

اردو' (مطبوعہ ۱۸۶۶ء) سے غالب کے گیارہ مکاتیب۔

طہماس نامہ: تصنیف محکم الدولہ اعتقاد غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جنوری ۱۹۸۸

جنگ طہماس بیگ خاں رومی

سعادت یار خاں رنگیں کے والد طہماس خاں کے حالات اور تاریخ پر اس کی تصنیف 'طہماس نامہ' کا تعارف جسے پروفیسر محمد اسلم نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

عالم علی عظیم آبادی اور اس کی تصنیفات ندیم (گیا)؛ جولائی ۱۹۴۰

عالم علی عظیم آبادی (م بعد ۱۲۶۵ھ) اور ان کی دو کتابوں 'زبدۃ الخیال' اور 'دہ مجلس' کا تعارف۔

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں آجکل (دہلی): فروری ۱۹۵۵

چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب کا خط اور سرور کے ایک قصیدہ اور نو قطعات پر غالب کی اصلاح۔

سرّ غالب در حدیث دیگراں مشمولہ 'احوالہ غالب' مرتبہ مختار الدین احمد: دہلی، انجمن ترقی اردو ہند؛ ۱۹۵۳

خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی کی تصنیف ''مثنوی گل گشت کشمیر'' سے ماخوذ عزیز لکھنوی کی غالب سے ملاقات کا ذکر۔

غالب سے ایک ملاقات　　　　ماہِ نو (کراچی)، فروری ۱۹۵۳

خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی نے سفرِ کشمیر کی روداد اپنی فارسی مثنوی 'مثنوی گل گشت کشمیر' میں لکھی ہے۔ دورانِ سفر دہلی میں قیام کے دوران غالب سے بھی آپ کی ملاقات رہی جس کی روداد اردو نثر میں لکھی ہے۔ اس مثنوی میں اسی ملاقات کا ذکر ہے۔

مرزا زین الدین عشق دہلوی اور کلیات عشق　　۱) مشمولہ 'یادگار نامہ قاضی عبدالودود'، مرتبین پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختارالدین احمد، پروفیسر شریف حسین قاسمی؛ نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۰ (بعد نظرِ ثانی)

۲) تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۲۔۱۳: ۹۸۔

۱۹۹۹ (بعد نظرِ ثانی و اضافات)

بارہویں صدی ہجری کے ایک فارسی شاعر عشق دہلوی کے حالات زندگی اور اس کی شاعری کا تعارف نیز ان کے کلیات کا تحلیلی تجزیہ جس کا واحد قلمی نسخہ جون ریلینڈز لائبریری، مانچسٹر میں محفوظ ہے۔

منتخب القوافی از عشق عظیم آبادی　　۱) معاصر (پٹنہ)، حصہ ۳، دسمبر ۱۹۵۲ء (نقش اول)

۲) تحقیق (حیدرآباد، سندھ)، نمبر ۱۴

(نقش دوم ترمیم و اضافے کے ساتھ)۔

منتخب القوافی مصنفہ عشق عظیم آبادی کے قلمی نسخے کا تعارف۔

شاہ غلام قلندر قلندر عظیم آبادی۔　　زبان و ادب (پٹنہ) مرتبہ کلیم الدین احمد، جولائی، دسمبر ۱۹۸۳

بہار کا ایک گمنام مصنف

شاہ غلام قلندر قلندر عظیم آبادی اور ان کے مجموعۂ مکاتیب (فارسی)

کے قلمی نسخہ مخزونہ انڈیا آفس لائبریری، لندن کا تعارف۔

سرّ غالب در حدیث دیگراں مشمولہ 'احوال غالب' مرتبہ مختار الدین احمد؛ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند؛ ۱۹۵۳

سید غوث علی شاہ قلندر کی غالب سے ملاقات کا ذکر (تذکرہ غوثیہ سے ماخوذ)

حضرت غوث علی شاہ قلندر کی رند بلانوش سے ملاقات ۱) شبستاں (دہلی) غالب نمبر، ۱۹۶۹

۲) آجکل (دہلی)؛؟

ہماری زبان (دہلی)؛ یکم جون ۱۹۶۷ء

سید شاہ نذیر الحق فائز پھلواری (۱۲۵۹ھ۔۱۳۲۳ھ) کے فارسی دیوان مرتبہ ڈاکٹر خواجہ فضل امام پر تبصرہ۔

کلام فغاں معاصر (پٹنہ)؛ نومبر ۱۹۴۰

اشرف علی خاں فغاں (م ۱۱۸۶ھ) کا مختصر تعارف اور اس کے چند پسندیدہ اشعار۔

کیا قتیل کا وطن فرید آباد تھا؟

۱) نگار، جون ۱۹۴۴

۲) ہندوستان (بمبئی)؛ مرتبہ عزیز احمد، حسن احمد رضا؛ سالنامہ ۱۹۴۴

۳) نقوش (لاہور)؛ شمارہ ۲۹۔۳۰؛ فروری، مارچ ۱۹۵۳

۴) نقوش (لاہور)؛ شمارہ ۷۹۔۸۰؛ اپریل ۱۹۶۰

ادب عالیہ نمبر

۵) نقوش (لاہور)؛ شمارہ ۱۲۷؛ ستمبر ۸۰

راجا رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ   آجکل (دہلی)؛ جون ۱۹۵۶

گارساں دتاسی کے نام راجا رام موہن رائے کا ایک اردو

رقعہ

مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں

نگار (لکھنؤ)؛ اپریل ۱۹۳۹ ماہنامہ نگار کے مصحفی نمبر پر تبصرہ

تلامذۂ مصحفی   نگار (لکھنؤ)؛ اکتوبر، نومبر و دسمبر ۳۹

مصحفی کے تلامذہ کا مفصل تذکرہ جو تین قسطوں میں نگار "لکھنؤ) میں

شائع ہوا۔ یہ اردو میں شاید پہلی روایت ہے جس کے تحت کسی

استاد شاعر کے تلامذہ کا مفصل تذکرہ ترتیب دیا گیا ہے۔

دیوان مصحفی کا خدا بخش ایڈیشن   خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۷۸۔۸۰، ۹۲

ایڈیٹر لکھا گیا خط جس میں مصحفی کے دیوان ہشتم، شائع کردہ کتب

خانۂ خدا بخش کے حوالے سے مصحفی اور دیوان مصحفی سے متعلق قیمتی

علمی معلومات درج ہیں۔

کلام منور   معاصر (پٹنہ)؛ دسمبر ۱۹۴۲

اشعار میر پر ایک نظر   علی گڑھ میگزین (علی گڑھ) ۴۷۔۱۹۴۸

'اشعار میرؔ' مرتبہ پروفیسر عبدالمنان بیدل پر مفصل تبصرہ۔

غالب اور مفتی میر محمد عباس   آجکل (دہلی)؛ اگست ۱۹۵۱

مفتی میر محمد عباس شوستری (۱۲۲۴ھ۔۱۳۰۶ھ) کو غالب نے ''قاطع برہان'' کا ایک نسخہ بھیجا تھا اس سلسلے کی خط و کتابت کو مدنظر رکھ کر دونوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مفتی صاحب کے نام غالب کے وہ غیر مدوّن خطوط شائع کیے گئے ہیں جو اب تک خطوط غالب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

محمد امان نثار ہماری زبان (علی گڑھ)؛ ۸/ جون ۱۹۵۷ء

سرسید کے ایک رفیق۔ منشی نجم الدین ۱) نئی تحریریں (لاہور)؛ مرتبہ سید الطاف امجد و وحید قریشی؛ ستمبر ۱۹۵۴

۲) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)؛؟

۳) فکر و نظر (علی گڑھ)؛ ۱۹۸۵

ناموران علی گڑھ نمبر؛ (پہلا کارواں ۴) نقوش (لاہور)؛ شمارہ ۱۳۶؛ ۱۹۸۷ (اضافہ شدہ)

فکر و نظر اور نقوش میں ترمیم و اضافہ شدہ

مخمس نصیر دہلوی ہماری زبان (علی گڑھ) ۸/ مارچ ۱۹۵۷

راجہ پیارے لال کی مدح میں کہا گیا غیر مطبوعہ مخمس

نعیم دہلوی ہماری زبان (علی گڑھ)؛ یکم مارچ ۱۹۵۷

کلیات ولی کا ایک نایاب نسخہ معاصر (پٹنہ)؛ مئی۔ جون، ۱۹۴۳

کتب خانۂ خدا بخش، پٹنہ کے ایک قدیم نسخے کا تعارف اور ولی کے بہت سے غیر مطبوعہ اشعار کی نشان دہی جو دیوان ولی مرتبہ احسن مارہروی میں موجود نہیں۔ یہ سارے غیر مطبوعہ اشعار بعد کو مرتب ثانی ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اپنے ایڈیشن میں مختار الدین احمد کے حوالے سے شامل کر لیے ہیں۔

انور علی یاس آروی کا اردو خط معاصر (پٹنہ)؛ حصہ ۲؛

انور علی یاس آروی (م ۱۲۶۲ھ) شاگرد راسخ عظیم آبادی کا ایک اردو خط جو ان کے مجموعۂ مکاتیب فارسی قلمی (مملوکہ خانقاہ احمدیہ مجیبیہ، پھلواری شریف) میں موجود ہے۔

غالبیات

آثار غالب؛علی گڑھ میں غالب کی تحریریں،علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)؛غالب نمبر؛۱۹۶۹ء
تصویریں اوردوسرے نوادر مولانا آزاد لائبریری ،علی گڑھ میں موجود غالب کی حسب ذیل تحریرات وتصاویر کا مختصر تعارف:

غالب کا فارسی مکتوب بنام خدادادخاں اورولی داد خاں ، دوسرا مکتوب فارسی بنام آغامحمد حسین شیرازی ، اردومکتوب بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی اوراحمد حسن فرقانی ،ایک قلمی بیاض جس کے مندرجات میں مرزاغالب کے ۴۸ فارسی خطوط اور فارسی قطعے ایک فارسی مثنوی اورایک اردوغزل شامل ہے، غالب کی دوتصویریں، آغااحمد علی جہانگیر نگری کی ''موید برہان'' پرعلیحدہ کاغذ پر چھپا ہوا غالب کا فارسی قطعہ اوردیوان غالب کا پہلاایڈیشن (مطبع سیدالاخبار، دہلی،شعبان ۱۲۵۷ھ)

غالب کی ایک مہر آجکل (دہلی)؛فروری ۱۹۵۲

مالک رام صاحب کے مضمون میں غالب کی جن مہروں کا ذکر کیا گیا ہے مختارالدین احمد کے مضمون میں غالب کی ایک نئی دریافت شدہ مہر کا اضافہ ہے۔

غالب کی تصویریں ۱)علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)؛غالب نمبر؛۱۹۴۹

۲) آجکل (دہلی)؛فروری ۱۹۵۲ء

۳) احوال غالب، مرتبہ مختار الدین احمد؛ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند؛ ۱۹۵۳ء

احوال غالب میں یہ مضمون مزید اضافے کے ساتھ۔ اس میں غالب کی اور غالب کی طرف منسوب دو تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں۔

نوادر غالب۔ غالب کے تین خط — آجکل (دہلی)؛ جون ۱۹۵۰ء

غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب — اردو ادب (علی گڑھ)؛ جولائی۔ دسمبر ۱۹۵۲ء

سید ابن حسن خاں (مصنف برہان اودھ، قلمی) کے نام غالب کا فارسی خط۔ ابن حسن خاں کا وہ خط بھی مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کے جواب میں غالب نے انہیں یہ خط لکھا تھا۔

غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط — آجکل (دہلی)؛ مئی ۱۹۵۲ء

غالب کے چند نایاب خطوط — نگار (لکھنؤ)؛ جولائی ۱۹۵۲ء

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام غالب کے پانچ خط جو صفیر بلگرامی کی تصنیف ''جلوۂ خضر'' سے لیے گئے ہیں۔

غالب کا قدیم ترین مکتوب — ہمایوں (لاہور)؛ ۱۹۵۳ء، سالنامہ

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں — آجکل (دہلی)؛ فروری ۱۹۵۵ء

چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب کا خط اور سرور کے ایک قصیدہ اور نو قطعات پر غالب کی اصلاح۔ خط، قصیدہ اور قطعات کے عکس بھی شائع کیے گئے ہیں۔

غالب کے آٹھ خط — ۱) نقوش (لاہور)؛ مکاتیب نمبر حصہ اول ۱۹۵۷ء

۲) نقوش (لاہور)؛ ادب عالیہ نمبر، اپریل ۱۹۶۰ء

بنام چودھری عبدالغفور سرور، نواب امین الدین احمد خاں بہادر والئی لوہارو، ذکی دہلوی مرحوم، عزیز اللہ شاہ عزیز صفی پوری اور نواب علاء الدین خاں علائی۔

غالب کے خطوط ایک قدیم مجموعے میں — آجکل (دہلی)؛ مارچ ۱۹۶۷ء

شمس العلماء مولوی ضیاء الدین دہلوی کی تالیف ''انشائے اردو'' (مطبوعہ ۱۸۶۶ء) سے غالب کے گیارہ مکاتیب۔

نوادر غالب — علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)؛ ۱۹۴۹ء؛ غالب نمبر

اس عنوان کے تحت غالب کی نظم و نثر کی وہ تحریریں جمع کی گئی ہیں جو ان کے دیوان یا نثر کے مجموعوں میں شامل نہیں۔ قاضی نورالدین حسین فائق مولف مخزن شعراء، صاحب عالم مارہروی اور صوفی منیری کے نام ایک ایک اردو خط، غالب کی ایک کمیاب تصنیف ''رقعات غالب'' سے دو نثری انتخاب۔ ایک فارسی مخمس جو قدسی کی مشہور نعتیہ غزل کی تضمین ہے، اردو کا ایک مخمس جو بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل پر تضمین ہے، غالب کی تصنیف قادر نامہ سے دو غزلیں اور آخر میں ''عمدۃ المنتخبہ'' اور ''عیار الشعرا'' سے غالب کے ۱۶ متفرق اردو اشعار۔

منتخب چمن بے نظیر، میں غالب کی طرف منسوب غزل (بشر کا امتیاز/ نظر کا امتیاز) جس کے بارے میں اب مختار الدین احمد صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ غزل اسداللہ خاں غالب دہلوی کی نہیں بلکہ طالب جنگ ولد نیاز بیگ خاں غالب کی ہے۔

غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر — اردوئے معلیٰ (دہلی) جلد ۲، شمارہ ۲-۳ فروری ۱۹۶۵ غالب نمبر

تائے مدوّرہ کی بحث۔ لفظ 'صلوۃ' میں ۃ کے ۴۰۰ عدد شمار کیے
جائیں یا صرف پانچ۔

آثر غالب　　　۱) تحقیق (حیدرآباد، سندھ)؛ شمارہ ۷؛ ۹۳

۲) مشمولہ ''آثر غالب'' مرتبہ قاضی عبدالودود، پٹنہ خدابخش لائبریری، ۹۵

قاضی عبدالودود کی مرتب کردہ تالیف ''آثر غالب'' کا تعارف جس
میں غالب کی چند نادر و نایاب اردو فارسی تحریرات نظم و نثر جمع کی گئی
ہیں۔ اور جو مقالہ نگار کی ہی کوششوں سے سب سے پہلے ۱۹۴۹ میں
شائع ہوئی۔

غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار　　　ہمایوں (لاہور)؛ جنوری ۱۹۴۱
سرور اور خوب چند ذکا کے تذکروں سے ماخوذ۔

مرزا غالب کا کچھ نایاب کلام　　　ادبی دنیا (لاہور)؛ ۱۹۴۱ سالنامہ

مرزا غالب کا ایک نایاب قصیدہ در مدح لارڈ میکلورڈ بہادر، دو اردو
غزلیں اور چند متفرق اشعار۔

مرزا غالب کی تاریخ گوئی　　　ادبی دنیا (لاہور)؛ مارچ ۱۹۴۰

اپنے موضوع پر شاید یہ پہلا مضمون ہے جو آج سے ۶۰ سال پہلے
شائع ہوا۔

غالب کی ایک کمیاب تصنیف　　　۱) غالب نامہ (نئی دہلی)؟

۲) رسالہ غالب (کراچی)؛ ۲۰۰۰

قضیۂ قاطع برہان کے سلسلے کی ایک تصنیف 'تیغ تیز' کا تعارف۔

غالب کی ایک اردو تقریظ　　　ہماری زبان (علی گڑھ) ۱۵/مئی ۱۹۶۷

درج بالاعنوان سے ہماری زبان (۲۲/اپریل ۱۹۶۷) میں ایک مضمونچہ شائع ہوا تھا جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ یہ تقریظ غالب کے کسی نثر کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ مختارالدین احمد نے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ یہ تقریظ 'اردوئے معلیٰ' میں موجود ہے نیز انتخاب غالب میں بھی شریک اشاعت ہے۔

غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں:　　　غالب نامہ (نئی دہلی)، جولائی ۱۹۹۲ء

تعارف و جائزہ

کالی داس گپتا رضا کی تصنیف 'غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں' غالب پر لکھے گئے ان کے دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ پیش نظر مضمون میں ان دسوں مضامین کا الگ الگ مفصل تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے:

(۱) غالب کی زندگی میں مطبوعات غالب (۲) دیوانِ غالب اردو (۳) غالب کی متنازعہ رباعی پر ایک نظر (دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب......الخ) (۴) غالب کے ایک قطعے کی اولین شرح (۵) کنز المطالب شرح دیوانِ غالب (۶) پنج آہنگ کے چند اہم نسخے (۷) مثنوی بیان نمودار ی شان نبوت وولایت (۸) مہر نیم روز کا نسخہ، ارسطو جاہ (۹) غالب کی زندگی میں مہر نیم روز کی اشاعتیں (۱۰) دعائے صباح۔

کچھ غالب کے بارے میں　　　غالب نامہ (نئی دہلی)؛ جولائی ۱۹۸۸ء

قاضی عبدالودود کے ڈاکٹر عبدالستار کے نام ۳ شیخ محمد اکرام کے ۲

اور اکبر علی خاں عرشی زادہ کے نام ۲ خط۔ ان خطوط میں زیادہ تر

بحثیں غالب سے متعلق ہیں۔

غالب کی عظمت مشمولہ ’غالب کی عظمت‘ مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار؛ رامپور؛ ۱۹۶۵ء

غالب کے ایک شعر پر بحث ہماری زبان (دہلی)؛ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۴ء

غالب کا ایک شعر

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کے وزن کے سلسلے میں سید اوصاف علی کی ایک تحریر ’’ہماری زبان‘‘ ۸ ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس شعر کے سلسلے میں مختلف لوگوں نے بحث میں حصہ لیا۔ زیر نظر مضمون اسی بحث کا حصہ ہے۔

سرّ غالب در حدیث دیگراں مشمولہ ’احوال غالب‘ دہلی انجمن ترقی اردو ہند؛ ۱۹۵۳ء

غالب کے معاصرین سید غوث علی شاہ قلندر (تذکرہ غوثیہ) شیخ محمد

ریاض الدین امجد (سیر دہلی) خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

(مثنوی گل گشت کشمیر) اور فرزند احمد صفیر بلگرامی (جلوۂ خضر) سے

غالب کی ملاقاتوں کا ذکر۔

حضرت غوث علی شاہ قلندر کی رند بلانوش ۱) شبستاں (دہلی)؛ غالب نمبر ۱۹۶۹

غالب سے ایک ملاقات ۲) آجکل (دہلی)؛ ؟

غالب سے ایک ملاقات ماہ نو (کراچی)؛ فروری ۱۹۵۳

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے سفر کشمیر کی روداد اپنی فارسی مثنوی

’’مثنوی گل گشت کشمیر‘‘ میں لکھی ہے۔ دورانِ سفر دہلی میں قیام کے

دوران غالب سے بھی ان کی ملاقات رہی جس کی روداد اردو نثر
میں پیش کی ہے۔اسی ملاقات کی تفصیل۔

مرزا غالب سے ایک ملاقات آجکل (دہلی) فروری ۱۹۵۳ء

شیخ محمد ریاض الدین امجد کا سفرنامہ 'سیر دہلی' (۱۲۷۷ھ) سے
مصنف کی غالب سے ملاقات کی روداد۔

غالب کا ایک معاصر۔نواب امیر حسن خاں بسمل۔غالب نامہ (نئی دہلی)؛جنوری ۱۹۹۸

مقالہ کے آخر میں بسمل کے ایک ناقص الطرفین فارسی دیوان
(مخزونہ کتب خانہ تکیہ شریف کاکوری) کا عکس بھی شائع کیا گیا
ہے۔

فغان بے خبر میں غالب کا ذکر آجکل (دہلی)؛فروری ۱۹۵۸ء

متفرقات تفتہ۔کچھ منشی ہرگوپال تفتہ کے بارے میں۔غالب نامہ (نئی دہلی)؛جنوری ۱۹۸۴

تفتہ کی تضمین گلستاں غالب نامہ (نئی دہلی)؛جنوری ۱۹۹۰

کچھ سیاح شاگرد غالب کے بارے میں غالب نامہ (نئی دہلی)؛جنوری ۱۹۸۹

شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین خاں دہلوی ۱) دلی کالج میگزین (دہلی)؛ ۱۹۵۰

۲) نقوش (لاہور، جنوری ۱۹۶۳، سالنامہ (ترمیم و اضافہ شدہ)

غالب کے ایک مکتوب الیہ ضیاء الدین خاں دہلوی کا
تذکرہ۔

غالب اور مفتی میر محمد عباس آجکل (دہلی)؛اگست ۱۹۵۱

مفتی میر محمد عباس شوستری (۱۲۲۴ھ۔۱۳۰۶ھ) کو غالب نے
'قاطع برہان' کا ایک نسخہ بھیجا تھا۔اس سلسلے کی خط کتابت کو مدنظر رکھ

کر دونوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

در مدح غالب می گوید   ہماری زبان (علی گڑھ) ۱۵/جون ۱۹۵۷

منشی بالمکند بے صبر کی مثنوی لخت جگر سے غالب کی مدح میں

۴۸شعر۔اس کے ایک قلمی نسخے سے ماخوذ۔

غالب اور قاضی عبدالودود   غالب نامہ (نئی دہلی) جنوری ۱۹۹۵

غالب اور متعلقات غالب پر لکھے گئے قاضی عبدالودود کے ۳۷ مضامین کا مبسوط تعارف۔

سرسید/علی گڑھ تحریک

مکاتیب سرسید   نقوش (لاہور) شمارہ ۳۱۔۳۲

مکاتیب سرسید   ہماری زبان (علی گڑھ) ۱۶/اپریل ۱۹۵۳

سرسید کے پانچ خطوط بنام صفیر بلگرامی، وقار الملک، فرید احمد امروہوی، محسن الملک اور مولانا عبدالحئی حسنی۔

سرسید کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط   فکر و نظر (علی گڑھ) جنوری ۱۹۶۰

سرسید کے ۱۷ غیر مطبوعہ خطوط

مکاتیب سرسید   فکر و نظر (علی گڑھ) اپریل ۱۹۶۰

جنوری ۱۹۶۰ میں شائع شدہ ۱۷ مکتوب بعنوان ''سرسید کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط'' کی اگلی قسط جس میں سرسید کے ۲۶ غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے گئے ہیں۔

مکاتیب سرسید   فکر و نظر (علی گڑھ) اکتوبر ۱۹۶۰

مکاتیب سرسید   فکر و نظر (علی گڑھ) جنوری ۱۹۶۲

سرسید کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام وقار الملک مورخہ ۲۶/اپریل ۱۸۹۳

تمہید میں مقالہ نگار ے وقار الملک کا ۲۳ر اپریل ۱۸۹۳ کا لکھا وہ خط بھی نقل کیا ہے جس کے جواب میں سرسید نے پیش نظر خط لکھا ہے۔

سرسید کے دو غیر مطبوعہ خطوط — فکر ونظر (علی گڑھ) اپریل ۱۹۶۲

سرسید کے دوخطوط مورخہ ۶راپریل ۱۸۸۴ء اور ۲۷رجنوری ۱۸۸۵ بنام احمد الدین۔

قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی — فکر ونظر (علی گڑھ) کا ناموران علی گڑھ نمبر، جلد دوم

سرسید کی تحریک کے ایک ممتاز رکن کا مفصل تعارف۔

سرضیاء الدین۔کچھ یادیں کچھ باتیں (۱) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) یکم تا ۱۶ر دسمبر ۱۹۸۴

(۲) قومی زبان (کراچی)

(۳) ہماری زبان (دہلی) ؛۲۲ر فروری و یکم مارچ ۱۹۸۵

سرسید کے ایک رفیق۔منشی نجم الدین (۱) نئی تحریریں (لاہور) ستمبر ۱۹۵۴

(۲) فکر ونظر (علی گڑھ) ۱۹۸۵، ناموران علی گڑھ نمبر، پہلا کارواں

(۳) قومی زبان (کراچی)

(۴) تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)

(۵) نقوش (لاہور) شمارہ ۱۳۶، دسمبر

تذکرے (متن و تعارف)

تذکرۂ آزردہ　　　　تحریر (دہلی) جلد۴ شمارہ۴، ۱۹۷۰

مفتی صدرالدین آزردہ کا مرتب کردہ تذکرہ شعرائے اردو جس کا واحد نسخہ کورپس کرسٹی کالج کیمبرج میں محفوظ ہے۔ مقالہ نگار نے اسے ایڈٹ کر مالک رام کے رسالہ تحریر میں مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ بعد میں مشفق خواجہ کی توجہ سے یہ کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو (کراچی) سے شائع ہوا۔

تذکرۂ خرابات۔ مشمولہ 'نذر عرشی' مرتبہ مالک رام و مختارالدین احمد، نئی دہلی مجلس نذر عرشی ۱۹۶۵

فتح علی شاہ قاچار کے عہد کا ایرانی شاعر احمد الشہیر بہ ہلاکو المتخلص بہ خراب کا 'تذکرۂ خرابات' (۱۲۵۳ھ) کا تعارف جس کے نسخے کتاب خانہ شاہی، برلن اور کتاب خانہ ملی، پیرس میں موجود ہیں۔ تعارف کے بعد تذکرہ سے ان شعرا کے حالات درج کیے گئے ہیں جن کا تعلق ہندوستان سے ہے۔

تذکرہ ریاض الوفاق　　　　غالب نامہ (دہلی) جولائی ۱۹۹۶

ذوالفقار علی مست کا تذکرۂ ریاض الوفاق کا تعارف۔ یہ بارہویں وتیرہویں صدی ہجری کے ان ہندوستانی فارسی و اردو شعراء کا تذکرہ

ہے جومؤلف کے معاصر تھے۔ذخیرۂ اشپرنگر، برلن کا یہ واحد نسخہ ہے جس کے وجود کی اب تک اطلاع ہے۔مقالہ نگار نے اس نسخے کا مطالعہ اس وقت کیا تھا جب وہ عارضی طور پر ٹیوبنگن (جرمنی) میں مقیم تھے اور عربی و فارسی اور اردو مخطوطات و نوادر کا مطالعہ کر رہے تھے۔

تذکرۂ شعرائے فرخ آباد　　　اردو ادب (علی گڑھ)؛ جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴

مفتی محمد ولی اللہ فرخ آبادی (۱۱۶۵ھ۔۱۲۴۹ھ) کی تصنیف 'تاریخ فرخ آباد' کی دوسری فصل جو فرخ آباد کے شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔اسے مفید تعلیقات و حواشی کے ساتھ مرتب نے مرتب کیا ہے۔

تذکرہ گلشن ہند (تذکرہ شعرائے اردو)　　　اردو ادب (علی گڑھ) شمارہ ۳، ۱۹۶۶

از سید حیدر بخش حیدری دہلوی۔

باڈلین لائبریری اور برٹش میوزیم کے نسخوں کی مدد سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے جس میں اردو کے ۲۸۹ شعرا کے حالات مع نمونۂ کلام درج ہیں۔اس پر مرتب کے حواشی بہت قیمتی ہیں۔

تذکرۂ یادگار ضیغم　　　آجکل (دہلی) دسمبر ۱۹۵۴

محمد عبداللہ ضیغم کا مطبوعہ لیکن نایاب تذکرۂ شعراے اردو 'یادگار ضیغم' کا تعارف ۔شعرا کی مکمل فہرست اور بیشتر کی تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

تلامذۂ مصحفی　　　نگار (لکھنؤ) اکتوبر، نومبر و دسمبر ۱۹۳۹

مصحفی کے تمام تلامذہ کے حالات پر مشتمل تذکرہ۔ کسی استاد شاعر
کے تمام تلامذہ پر ترتیب دیا جانے والا غالباً یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے
جسے مختار الدین احمد صاحب نے ترتیب دیا۔

تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ادبی دنیا (لاہور) دسمبر ۱۹۴۰
تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ (مترجم میرزا عسکری) پر تنقید و
تبصرہ۔ طوالت کے خوف سے صفحہ ۲۵۶ تک ہی کا جائزہ لیا گیا ہے
اور مصنف کے اوہام و اغلاط دکھائے گئے ہیں۔

جمے جئے مترا رمان۔ حیات و خدمات قومی زبان (کراچی) ستمبر ۱۹۸۵
ڈاکٹر رئیس انور کی تصنیف 'جمے جئے مترا رمان: حیات و خدمات' پر
تبصرہ۔ اس ذیل میں جمے جئے مترا رمان اور اس کے تذکرۂ 'نسخہ
دلکشا' کا تعارف۔

ایک غیر مطبوعہ تذکرہ ''تلامذۂ شاد عظیم آبادی'' تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۱۲۔۱۳
یگانہ چنگیزی کے حالات ایک غیر مطبوعہ تذکرے میں قومی زبان (کراچی) مئی ۲۰۰۰
ایک غیر مرتب و مدون تزکرہ 'تلامذہ شاد عظیم آبادی' کا تعارف
نیز اس سے ماخوذ یگانہ چنگیزی کے حالات اور نمونۂ کلام۔

تذکرۂ ریاض الافکار (عبرتی عظیم آبادی) کے دو نسخے زیر طبع
تذکرۂ معراج الخیال از عبرتی عظیم آبادی زیر طبع
تذکرے کا تعارف اور کچھ شعرا کے حالات اور ان کا نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔
تذکرۂ ریاض الافکار از عبرتی عظیم آبادی زیر طبع
تذکرے کا تعارف جس میں فارسی نثر نویسوں کے حالات اور ان کی نثر کے نمونے درج ہیں۔

عربی ادب

کتاب فضائل من اسمہ احمد أو محمد لابن بُکیر البغدادی

مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ا، نمبر ۲، دسمبر ۱۹۶۰

ابوعبداللہ الحسین بن احمد بن عبداللہ بن بُکیر البغدادی (متوفی ۳۸۸ھ) کا ایک مختصر عربی رسالہ 'کتاب فضائل من اسمہ احمد او محمد' کا مکمل عربی متن حواشی واختلاف نسخ کے ساتھ۔ متن کتاب خانۂ جامعہ لائیڈن کے دونسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ ابتدا میں مصنف اوراس رسالے کا تعارف شامل ہے۔ بلا شبہہ یہ مضمون پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کے اہم مضمون میں سے ایک ہے اور کافی اہم معلومات یہاں ملتی ہیں۔

کتب خانہ ابن العلقمی کا ایک مخطوطہ مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد نمبر ا؛ جون ۱۹۶۰

ابوعبیداللہ محمد المرزبانی (۳۸۴ھ) کی کتاب الموشح (ک ۶۳۷ھ کے ایک قلمی نسخے کا تعارف جو آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ کے وزیر ابن العلقمی (م ۶۵۶ھ) کے کتب خانے کی زینت تھا اور جس پر ابن العلقمی کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ نسخہ اب کتب خانۂ ینی جامع، استانبول میں موجود ہے۔ نسخے کے سرورق کا عکس بھی شریک

اشاعت ہے۔

احمد بن یوسف الکاتب المعروف بابن الدایۃ: مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد ۹، نمبر ا۔۲، جون۔دسمبر ۱۹۶۸

مصری مصنف ابوجعفر احمد بن یوسف بن ابراہیم المعروف بابن الدایۃ (۱۷۰ھ۔۲۶۰ھ) کا تذکرہ۔

ابن سینا کی اہم ترین کتاب الشفاء مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۱۰، نمبر ۱۔۲، جون۔دسمبر ۱۹۶۹

ابنِ سینا کی مشہور زمانہ فلسفیانہ تصنیف 'کتاب الشفا' کا تعارف اس کی وجہ تصنیف، اس کے تراجم اور اس کی مختلف اشاعتوں کی تاریخ پر گفتگو کی گئی ہے۔

ابن میمون البغدادی مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ)، جلد ۲، نمبر ۱؛ جون ۱۹۶۱ء

چھٹی صدی ہجری کے بغدادی مصنف ابن میمون البغدادی کا تذکرہ

مجمل اللغۃ لابن فارس کا ایک قیمتی نسخہ۔ مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۲، نمبر ۲، دسمبر ۱۹۶۰

ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریاء القزوینی الرازی (۳۲۹ھ۔ ۳۹۵ھ) کی تصنیف 'مجمل اللغۃ' کے ایک اہم قلمی نسخے کا تعارف جو کتب خانۂ جامع لائیڈن میں موجود ہے۔ جس کا کاتب ابن الخشّاب النحوی (م ۵۶۷ھ) کا عزیز شاگرد ابن میمون البغدادی (۵۲۳ھ۔۵۹۷ھ) ہے۔ مضمون کے آخر میں نسخے کے سرورق اور آخری صفحہ کا عکس بھی شامل ہے۔

مجمل اللغۃ لابن فارس (استدراک) مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۲، نمبر ۲، دسمبر ۱۹۶۱

برٹش میوزیم میں موجود مجمل اللغۃ کے ایک قلمی نسخے کا تعارف جس
کی کتابت مشہور عالم ابن الخشّاب النحوی (م ۵٦۷ھ) نے کی
ہے۔

ابوالحکم الحکیم الطبیب المغربی ،مشمولہ'نذرحمید'مرتبہ مالک رام، نئ
دہلی،مجلس نذرحمید،۱۹۸۱ء

ابوالحکم عبیداللہ ابن المظفف الباہلی المغربی (۴۸٦ھ۔ ۵۴۹ھ)
جوتاج الحکماء کے لقب سے ملقب تھا،عربی زبان کا نغز گوشاعر اور
اپنے عہد میں شام کا زبردست طنز نگار تھا۔ وہ فلسفہ اورطبعیات سے
زبردست شغف رکھتا تھا۔ ہندسہ اور ریاضیات کا عالم تھااورفن طب
کا ماہر۔ پیش نظر مضمون میں اس کی آخری حیثیت سے بحث کی گئ
ہے۔اس کی زندگی کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔مضمون
نگار نے محنت وتلاش سے موجودہ مصادر کی مدد سے ان کے حالات
وکوائف زندگی لکھے ہیں۔

ابوالعتاہیہ کے کچھ غیر مطبوعہ اشعار،مجلۂ علوم اسلامیہ(علی گڑھ)،جلد۹،نمبر۱،۲، جون۔دسمبر
۱۹٦۸

مسلم بن محمود الشیز ری کی نایاب کتاب'جمہر ۃ الاسلام ذات النثر
والنظام' سے جس کا واحد نسخہ لائیڈن میں موجود ہے،ابوالعتاہیہ ک
دوقطعات جو دیوان طبع بیروت سے غیر حاضر ہیں۔

ابوالعتاہیہ کی زہدیہ شاعری۔مشمولہ'ابوالعتاہیہ کی زہدیہ شاعری' مصنفہ عبدالجبار قاسمی،۱۹۹۸
عباسی عہد کا مشہور عربی شاعر ابوالعتاہیہ(۱۳۰ھ۔۲۱۰ھ) کی زہدیہ شاعری پر تعارفی کلمات جس
کے ذیل میں ابوالعتاہیہ کے اشعار کے قلمی نسخے کی تفصیل اوردوسری معلومات پیش کی گئی ہیں۔

اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار اور دوسری تصانیف: معارف (اعظم گڑھ)؛ دسمبر ۱۹۹۰

اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار کے علاوہ دیگر دستیاب شدہ اور نایاب تصانیف مثلاً تجرید مناقب امیر المومنین عمر بن الخطاب، تجرید مناقب عمر بن عبدالعزیز، کتاب البدیع فی البدیع، کتاب العصا، کتاب المنازل والدیار، لباب الآداب، التاریخ البدری وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ۔

اسامہ بن منقذ کے حالات کا ایک اہم مآخذ معارف (اعظم گڑھ)، جنوری ۱۹۹۱
کتاب المقفیٰ الکبیر

علامہ مقریزی (متوفی ۸۴۵ھ) کی کتاب المقفیٰ الکبیر کے تعارف کے بعد اسامہ بن منقذ کی ان ۲۵ تصنیفات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ جن کا ذکر المقریزی نے کیا ہے اور جن کا ذکر دوسرے مآخذ میں نہیں ہے۔

کلام اقبال کے عربی تراجم۔ مشمولہ 'اقبال۔ فکر و فن' مرتبہ سید اطہر شیر، پٹنہ، ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، ۱۹۸۸

ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ کی طرف سے ۱۹۸۷ میں علامہ اقبال پر منعقدہ سمینار میں پڑھا گیا مقالہ۔ خوشی کی بات ہے کہ اب یہ مقالات کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

دیوان شعر بشّار بُرد مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۶، نمبر ۱۔۲، جون۔ دسمبر ۱۹۶۵

عباسی عہد کا ایک مشہور شاعر بشّار بن بُرد (۹۵۔۱۶۷ھ) کے دیوان کا تعارف وتبصرہ جسے مولانا سید بدرالدین العلوی نے ایڈٹ

کیااور دارالثقالۃ، بیروت (لبنان) سے ۱۹۶۵ میں شائع کرایا۔

ابوریحان البیرونی کی ایک گمشدہ تصنیف (۱) مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۱۳، نمبر ۱۔۲ ۷۶۔۱۹۷۹

ابوریحان البیرونی کی ایک گمشدہ تصنیف (بعد نظر ثانی) ۲) مشمولہ 'نذرزیدی'۔مرتبہ مالک رام، نئی دہلی، مجلس نذرزیدی ۱۹۸۰

البیرونی کی ایک گمشدہ تصنیف 'کتاب المسامرۃ فی اخبار خوارزم' کا تعارف۔ یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن اس کے کچھ اجزاء ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی میں نقل ہوئے ہیں۔ مقالہ نگار نے تاریخ بیہقی کے ہی حوالے سے اس گمشدہ تصنیف کا تعارف پیش کیا ہے۔

صدرالدین علی ابن ابی الفرج البصری۔مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۵، نمبر ۱۔۲، جون۔دسمبر ۱۹۶۴

'الماسۃ البصریۂ کے مؤلف صدرالدین علی بن ابی الفرج البصری کے حالات نیز اس کے حماسہ کا تعارف۔ مقالے کی تمہید میں عربی کے تمام معروف حماسوں اور عربی اشعار کے قدیم مجموعوں کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

صلاح الدین الصفدی جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی، لاہور۔

فلسطین کے شہر صفد کے آٹھویں صدی ہجری کے ایک مشہور مصنف کا تذکرہ۔

رسالۃ ابی العباس محمد بن یزید المبرّد والنحوی، مشمولہ نذرذاکر۔مرتبہ مالک رام، نئی دہلی، مجلس

نذرِ ذاکر ۱۹۶۸

مشہور نحوی محمد بن یزید المبرّد (متوفی ۲۸۵ھ) کی متعدد تصانیف مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ رسالۃ المبرّد الی احمد بن الواثق کا نایاب مخطوطہ مختار الدین احمد صاحب کو جرمنی میں ۱۹۵۵ میں ملا تھا جسے انہوں نے مرتب کر کے اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ مشہور بغدادی خطاط ابن البواب (متوفی ۴۱۳ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی اہمیت کی بنیاد پر پوری کتاب کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔ مقدمے میں ابن البواب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جتنے نسخے شرق اوسط اور یورپ میں ملتے ہیں، ان کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔

امیر قابوس بن دشمگیر (۱) مشمولہ یادگار نامۂ فخر الدین علی احمد، مرتبین: پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر شریف حسین قاسمی، نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۴

(۲) تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۲۔۱۳، ۹۸۔۱۹۹

مع اضافات و استدراک امیر قابوس بن وشمگیر کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی تمام منتشر نثری و شعری تحریروں کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔

فارابی کی ایک تصنیف۔ فصوص الحکم ہماری زبان (دہلی) ۸/ستمبر ۱۹۹۴

محمود بن علی الاستاد الظاہری مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۱، نمبر، دسمبر ۱۹۶۰

مصر کے آٹھویں صدی ہجری کا ایک علم دوست، مدبر اور سیاست

داں محمود بن علی الاستادالظاہری (م ۷۹۹ھ) کا تذکرہ حیات، جس
نے مدرسۂ محمودیہ اور کتب خانۂ محمودیہ قائم کیا۔ مقالے کے آخر میں
کتب خانۂ محمودیہ کی ان بچی کھچی کتابوں کی فہرست پیش کی ہے
جو دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں بکھری پڑی ہیں۔

کچھ محمود الأ ستاد دار کے متعلق (استدراک) مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۳، نمبر ۱، جون
۱۹۶۲

محمود الأ ستاد دار کے متعلق پچھلے مضمون (مجلۂ علوم اسلامیہ، دسمبر
۱۹۶۰) میں اضافے کے تحت مقدمہ ابن خلدون کی ایک ایسی
عبارت سے جو دوسرے متداول نسخوں سے غیر حاضر ہے، مزید
اطلاعات حاصل کی گئی ہیں۔ نیز کتب خانۂ محمودیہ کی مِلک ایک
اور قلمی نسخہ ''کتاب الصناعتین'' لابی ھلال العسکری (م تقریبا
۳۹۵ھ) کا تعارف جواب کتب خانۂ کوپرولو، ترکیہ میں محفوظ
ہے۔

محمود بن الاستادار اردو دائرہ معارف اسلامیہ جامعہ عثمانیہ پنجاب لاہور۔

المقریزی کی ایک نادر غیر مطبوعہ تصنیف ۱) مشمولہ ''ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ یادگاری
مجلّہ؛ کراچی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اکادمی، ۱۹۸۶
(۲) مجلّہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۱۷، نمبر ۱۔۲، ۱۹۹۲

تقی الدین احمد القریزی (م ۸۴۵ھ) کی تصنیف 'المقفیٰ الکبیر'
کا تعارف۔ یہ کتاب مصر کے مشاہیر کی ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے
جو ۱۶؍جلدوں پر مشتمل ہے۔ مکمل جلدیں کہیں بھی دستیاب نہیں۔

تمہید میں مقالہ نگار نے المقریزی کے حالات کے ضمن میں اس کی
مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی بھی تفصیلی فہرست درج کر دی گئی
ہے مقریزی کی یہ کتاب ان کی تصنیف کردہ کتابوں میں اہم ترین
مقام رکھتی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مقریزی پر کام کرنے
والوں کے لیے ایک ہی جگہ اتنی معلومات فراہم ہونا کام میں آسانی
کا باعث ہے۔

نورالقبس للغیموری ، مجلّہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۶، نمبر ۱۔۲، جون۔ دسمبر ۱۹۶۵

ابوعبیداللہ محمد المرزبانی (۲۹۶۔۳۸۴ھ) کی ۱۸ جلدوں پر مشتمل
تصنیف المقتبس کی تلخیص الحافظ الغیموری (م ۶۷۳ھ) نے کی
جسے مفید حواشی اور عربی و جرمن مقدمہ کے ساتھ پروفیسر رودلف
زلہایم نے جرمنی سے ۱۹۶۴ میں شائع کیا۔ اسی مطبوعہ نسخے کا
تعارف و تبصرہ۔

پروفیسر مختارالدین احمد کا مکتوب معارف (اعظم گڈھ) دسمبر ۱۹۹۲
(بنام ضیاءالدین اصلاحی مدیر معارف)

انساب عرب پر مصعب بن عبداللہ الزبیری کی دو کتابوں، الزبیر بن بکّار کی کتاب 'نسب قریش واخبارہم' اور ابن الکلبی کی 'الجمہرۃ فی النسب' کا تعارف۔ یہ دونوں کتابیں انساب پر کام کے والوں کے کئے (طلباء و اساتذہ) یکساں مفید ہیں۔ انساب عرب پر عربی میں بہت کتابیں ہیں لیکن اردو میں کم ملتی ہیں اس حیثیت سے بھی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کچھ زیادہ ہے۔

کتب خانے و تعارف مخطوطات

برٹش میوزیم میں کتب مشرقیہ کی نمائش معارف (اعظم گڑھ)؛ اپریل ۱۹۵۴

برٹش میوزیم میں منعقدہ مشرقی زبانوں کے مخطوطات و مطبوعات کی نمائش (۱۹۵۴) کی روداد جس میں نمائش میں رکھے گئے کچھ مخطوطات و مطبوعات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

کتاب خانۂ مانچسٹر کے بعض مخطوطات معاصر (پٹنہ) اگست ۱۹۵۷، حصہ ا

جون ریلینڈ لائبریری مانچسٹر کے دس فارسی اور بیس اردو مخطوطات کا مختصر تعارف۔

مانچسٹر میں اردو کے کچھ قدیم رقعات آجکل (دہلی) مارچ ۱۹۵۶

سید انشا کی ایک نادر تصنیف مشمولہ 'ارمغان مالک' مرتبہ گوپی چند نارنگ، نئی دہلی مجلس ارمغان مالک ۱۹۷۱

سید انشاء اللہ خاں انشاء (م ۱۲۳۲ھ) کی ایک نادر تصنیف 'مطرالمرام' (فارسی) کا تعارف جس کا واحد نسخہ جون ریلینڈ لائبریری، مانچسٹر میں ہے۔ یہ کتاب دراصل انشاء کا حضرت علی کی شان میں لکھا اردو قصیدہ 'طورالکلام' کی جو صنعت مہملہ (غیر منقوط) میں ہے، شرح ہے۔

آبرو کے دو مخمس معاصر (پٹنہ) حصہ ۹، جنوری ۱۹۵۶

کیمبرج یونیورسٹی میں موجود دیوان آبرو کے نسخے سے دو مخمس، نسخے کے تعارف کے ساتھ۔

کتب خانہ ابن العلقمی کا ایک مخطوطہ، مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ا، نمبر ا، جون، ۱۹۶۰

ابوعبیداللہ محمد المرزبانی (م ۳۸۴ھ) کی کتاب الموشح (مکتوبہ ۶۳۷ھ) کے ایک قلمی نسخے کا تعارف جو ابن العلقمی (م ۶۵۶ھ) کے کتاب خانے کی زینت تھا اور جس پر ابن العلقمی کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ نسخہ اب کتاب خانۂ ینی جامع، استانبول میں محفوظ ہے۔ نسخے کے سرورق کا عکس بھی شریک اشاعت ہے یہ خط نسخ میں عمدہ مکتوب ہے۔

محمود بن علی الأستاد الظاہری، مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد۔ا، نمبر ا، دسمبر ۱۹۶۰

مصر کے آٹھویں صدی ہجری کے ایک عظیم عالم، مدبر اور سیاست داں محمود بن علی الأستاد الظاہری (م ۷۹۹ھ) کا تذکرہ جس نے مدرسۂ محمودیہ اور کتب خانۂ محمودیہ قائم کیا۔ جب ابن حجر عسقلانی کتب خانے کے ناظم تھے اس وقت نفائس مخطوطات اس کتبخانے میں موجود تھے جن میں بیشتر مصنفین کے خودنوشت نسخے تھے۔ مقالے کے آخری حصے میں کتب خانہ محمودیہ کی ان کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جو دنیا کے مختلف کتبخانوں میں اب محفوظ ہیں۔

کچھ محمود الأستادار کے متعلق، مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۳، نمبر ا جون ۱۹۶۲

محمود الأستادار کے متعلق پچھلے مضمون (مجلۂ علوم اسلامیہ، دسمبر
۱۹۶۰) میں استدراک کے بطور اضافے کے تحت مقدمہ ابن
خلدون کے ایک نسخے کے انگریزی ترجمہ سے مزید اطلاعات درج
کی گئی ہیں نیز کتب خانۂ محمودیہ کی ملک 'کتاب الصناعتین' لابی
ھلال العسکری (م۳۹۵ھ) کے ایک نسخے کا تعارف جواب
کتب خانۂ کوپرولو، ترکیہ میں موجود ہے۔

کیٹلاگ آف عربک مینسکرپٹس ان مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۶، نمبر ۱-۲، جون۔
رضا لائبریری، دسمبر ۱۹۶۵

رام پور رضا لائبریری کے عربی مخطوطات کی دستی فہرست) ہینڈ لسٹ
کی پہلی جلد مرتبہ امتیاز علی عرشی پر تبصرہ۔ اس جلد میں علوم قرآن
اور علوم حدیث سے متعلق مخطوطات کا ذکر ہے۔

مشرقی کتب خانہ بانکی پور، پٹنہ اور ۱) آجکل (دہلی) اکتوبر ۱۹۴۸
اس کے چند نوادر ۲) ایشیا (میرٹھ) مرتبۂ ساغر نظامی ۱۹۳۹

کتب خانۂ خدا بخش، پٹنہ اور اس کے کچھ نوادر کا تعارف

کلیات ولی کا ایک نایاب نسخہ معاصر (پٹنہ) مئی۔ جون ۱۹۴۳

خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ کلیات ولی کے ایک قدیم
اور نادر نسخے کا تعارف جس میں متداول مطبوعہ دیوان سے زائد
اشعار ملتے ہیں۔

دیوان حفظ اور تفاؤل ۱) ایشیا (میرٹھ) مرتبہ ساغر نظامی، ۳۹
۲) سرسید ہال میگزین (علی گڑھ)، ۱۹۵۱

ایڈیٹر مسعود صدیقی

کتب خانہ محمد حسین آزاد دہلوی ۱) قومی زبان (کراچی) جنوری ۱۹۹۷

(۲) دائرۃ المعارف فارسی، مرتبہ شریف حسین قاسمی، تہران، جلد اول، ۲۰۰۱

کتب خانہ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ آجکل (دہلی) دسمبر ۱۹۵۴

نوادر مخطوطات وغیر ہادر دانش گاہ علی گڑھ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۱۹۵۴

(ایڈیٹر؛ پروفیسر محمد شفیع)

۱۹۵۲ میں جب مختار الدین احمد صاحب لٹن لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات کے ناظم تھے، سلطان جہاں منزل میں مخطوطات ونوادر کی ایک علمی نمائش کا انتظام کیا تھا جس کا افتتاح برطانوی مسورخ اور مشہور مستشرق پروفیسر برناڈ لوئیس نے کیا تھا۔ اس وقت اہم مخطوطات کی ایک فہرست سائیکلو اسٹایل کرادی گئی تھی ۔ یہ فہرست علی گڑھ میگزین کے اس شمارے میں چھپی جسے خلیل الرحمٰن اعظمی اور آفتاب زبیری نے مرتب کیا تھا۔ سید بشیر الدین (یونیورسٹی لائبریرین) نے بعد کو اسے کتابی شکل میں لائبریری کی طرف سے شائع کر دیا تھا۔

فہرست مخطوطات عربی فارسی و اردو: اورینٹل کالج میگزین (لاہور) جلد ۲۳، عدد ا، عدد مسلسل ۱۲۳، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نومبر ۱۹۵۵

لٹن لائبریری (موجود نام مولانا آزاد لائبریری) میں موجود احسن مارہروی کلکشن کی ۲۶ عربی، ۱۷۶ فارسی اور ۱۲۰ اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ۔ فاضل مقالہ نگار نے ۱۹۵۱ء میں لٹن لائبریری

میں دوران ملازمت اس ذخیرہ کے تمام مخطوطات کے کچھ نوٹس
لیے تھے اسی دوران اپنی ریسرچ کے سلسلے میں انھیں انگلستان جانا
پڑا۔انھیں نوٹس کی بنیاد پر وہاں سے فہرست تیار کر کے انھوں نے
پروفیسر محمد شفیع کو اورینٹل کالج میگزین میں اشاعت کے لیے لاہور
بھیجا۔ یہ فہرست میگزین میں ۱۹۵۵ میں شائع ہوئی۔

اور دوسرے نوادر غالب نمبر اڈیٹر بشیر بدر

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود غالب کے
نوادر کا تعارف بعض نوادر کے عکس بھی شائع کیے گئے ہیں۔

علی گڑھ میں تصانیف خسرو کے قلمی نسخے بازیافت ،مجلہ ٔ شعبہ ٔ اردو اورینٹل
کالج ،لاہور،۲۰۰۲

جلد۱/نمبر۱/اڈیٹر رفیع الدین ہاشمی

مولانا آزادلائبریری،علی گڑھ میں امیر خسرو کی تصانیف کے قلمی نسخوں کا تعارف ۔

جہانگیر کے کتاب خانے کی دو کتابیں،مجلہ ٔ علوم اسلامیہ(علی گڑھ) جلد ۸،نمبر ۱۔۲ جون۔دسمبر
۱۹۶۷

مولانا آزاد لائبریری،علی گڑھ میں موجود سعد الدین تفتازانی کی
'المطوّل' اور ایک ترکی دیوان کے سرورق پر جہانگیر کی تحریر کا
تعارف۔ان تحریروں کے عکس بھی شامل مضمون ہیں۔

دیوان حاتم مکتوبہ مکند سنگھ فارغ،مجلہ ٔ علوم اسلامیہ(علی گڑھ) جلد ۱،نمبر ۱۔۲،جون۔دسمبر ۱۹۶۹

مولانا آزاد لائبریری،علی گڑھ کے ذخیرہ ٔ منیر عالم میں محفوظ شاہ
حاتم دہلوی (م ۱۱۹۷ھ) کے فارسی دیوان کا مفصل تعارف۔اس

نسخے کی کتابت حاتم کے شاگرد مکند سنگھ فارغ نے کی ہے۔

شاہ حاتم کا فارسی دیوان معاصر (پٹنہ) حصہ۲، ۱۹۵۲

مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود شاہ حاتم کے فارسی دیوان مکتوبہ مکند سنگھ فارغ کا مختصر تعارف۔

میر علی الکاتب کا ایک شاہ کار مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ا، نمبر۲، دسمبر ۱۹۶۰

خط نستعلیق کا مشہور خوش نویس میر علی الکاتب کی کتابت شدہ ملا عارفی کی مثنوی 'گوی و چوگان' کے نسخے کا تعارف۔ یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ کے ذخیرۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ تمہید میں مقالہ نگار موصوف نے میر علی الکاتب کے حالات کے ذیل میں اس کی خوش نویسی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لکھے ہوئے ان نسخوں کی فہرست پیش کی ہے جو انھیں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں ملے۔

شہزادی جہاں آرا کی موجودہ تحریریں، مجلۂ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) جلد ۶، نمبر ا-۲، جون ۱۹۶۵

بنارس ہندو یونیورسٹی کے 'کلا بھون' میں موجود ایک قدیم فارسی بیاض اور کتب خانہ رضائیہ، رام پور میں 'صد پند لقمان' کے ایک قلمی نسخے پر شہزادی جہاں آرا کی تحریر نیز مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ کے حبیب گنج کلکشن میں شہزادی جہاں آرا کے تحریر کردہ ادعیہ پر مشتمل ایک رسالہ بعنوان 'آیات بیّنات' کا تعارف مع عکس۔ خدا بخش لائبریری میں موجود شہزادی جہاں آرا کی ایک مہر کا بھی عکس اس مضمون میں شامل ہے۔

فیضی کی دو تحریریں　　　آجکل (دہلی) اکتوبر ۱۹۵۶ء

کتب خانہ برلین میں موجود فیضی کی تصنیف 'موارد الکلم' اور مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود خواجہ حمد اللہ مستوفی کی تصنیف 'تاریخ گزیدہ' پر موجود ابوالفیض فیضی کی تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے عکس بھی چھاپے گئے ہیں۔

جان گلکرسٹ کے عہد کی ایک گمنام بہاری کتاب　　　ندیم (گیا) اکتوبر ۱۹۳۹ء

سید حمید الدین بہاری نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی کتاب 'خوان الوان' کا ترجمہ 'خوان نعمت' کے نام سے کیا جو شائع نہ ہوسکا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ اور دوسرا برٹش میوزیم، لندن میں موجود ہے۔ پیش نظر مقالے میں ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

خالق باری کے طرز کے تین بہاری مخطوطات　　　اردو (دہلی) جنوری ۱۹۴۳ء

نصاب طفلاں مصنفہ ملا سعد پٹنوی، خوشحال صبیاں مصنفہ جگجول داس اور نصاب ہندی مصنف نامعلوم کا تعارف۔

عالم عظیم آبادی اور اس کی تصنیفات　　　ندیم (گیا) جولائی ۱۹۴۰ء

عالم عظیم آبادی کی دو تصنیفات 'زبدۃ الخیال' اور 'وہ مجلس' کا تعارف۔

شاہ قلندر عظیم آبادی۔ بہار کا ایک گمنام مصنف، زبان و ادب (پٹنہ) جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۳ء

شاہ غلام قلندر عظیم آبادی اور ان کے مجموعۂ مکاتیب فارسی مخزونۂ انڈیا آفس لائبریری، لندن

کا تعارف۔

رسالۂ قافیہ از جوشش عظیم آبادی — تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر۱۴ (زیر طبع)

جوشش اوران کے رسالہ کا جواب تک شائع نہیں ہوا ہے، تعارف کرایا گیا ہے۔

منتخب القوافی از عشق عظیم آبادی — (۱) معاصر (پٹنہ) حصہ ۳،

(۲) تحقیق (حیدرآباد، سندھ) نمبر ۴ (زیر طبع)

عشق عظیم آبادی کی فارسی تصنیف 'منتخب القوافی' کے قلمی نسخے کا تعارف۔ رسالہ تحقیق میں شامل مضمون اضافہ شدہ ہے۔

چند مثنویاں اوران کے نمونے — ندیم (گیا) نومبر و دسمبر ۱۹۳۸

پانچ دکنی مثنویوں کا تعارف

(۱) مثنوی چندر بدن مہیار مصنفۂ مقیمی (۲) مثنوی چندر بدن مصنفۂ بابا حسینی واقف دکنی (۳) تن لگن مصنفۂ خواجہ محمود بحری (۴) علی نامہ مصنفۂ نصرت (۵) لعل و گہر مصنفۂ عارف الدین خاں عاجز۔

فارسی کی ایک نادر بیاض — (۱) رسالہ سفینہ (پٹنہ)؛ شمارہ ۸۔

(۲) معاصر (پٹنہ) شمارہ ۳

(۳) دانش (اسلام آباد)

کتب خانۂ مدرسۂ محمدیہ، مدراس میں موجود بارہویں صدی ہجری کی ایک قلمی، بیاض کا تعارف جس میں صاحب بیاض نے اپنے معاصر شعرا سے انھی کے قلم سے غزلیں تحریر کرائی ہیں۔

کربل کتھا۔ نقوش (لاہور)؛ اپریل۔ جون ۱۹۶۶

یہ مضمون دراصل مختارالدین احمد اور مالک رام کی مرتب کردہ کربل کتھا کا دیباچہ ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔

قدیم اردو

اردو کا ایک قدیم رقعہ (۱) مریخ (پٹنہ) فروری ۱۹۸۴

(۲) صحیفہ (لاہور) اپریل۔جون ۱۹۸۴

(۳) تحقیق (حیدر آباد، سندھ) نمبر ۱۲۔۱۳، ۹۸۔۱۹۹۹

مرزا مغل اور مرزا طغل کی بڑی بہن فقیرہ بیگم کا ایک اردو رقعہ (۱۲۱۸ھ) جو مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت اظفری دہلوی (م ۱۲۳۴ھ) کے نام ہے۔ یہ رقعہ 'واقعات اظفری' (۱۲۲۱ھ) نسخۂ ٹیوبنگن (جرمنی) سے ماخوذ ہے۔

انور علی یاس کا اردو خط — معاصر (پٹنہ) حصہ ۲

انور علی یاس آوری (م ۱۲۶۲ھ) شاگرد راسخ عظیم آبادی کا ایک اردو خط جو ان کے مجموعۂ مکاتیب فارسی (قلمی مملوکہ خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف) میں موجود ہے۔

راجا رام موہن رائے کا ایک اردو رقعہ گارساں دتاسی کے نام — آجکل (دہلی) جنوری ۱۹۵۶

مانچسٹر میں اردو کے کچھ قدیم رقعات — آجکل (دہلی) مارچ ۱۹۵۶

تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ — ادبی دنیا (لاہور) دسمبر ۱۹۴۰

جان گلکرسٹ کے عہد کی ایک گمنام — ندیم (گیا) اکتوبر ۱۹۳۹

بہاری کتاب

سید حمید الدین بہاری نے جان گلکرسٹ کی فرمایش پر فارسی کتاب
'خوان الوان' کا ترجمہ 'خوان نعمت' کے نام سے کیا جواب تک شائع
نہ ہوسکا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ اور دوسرا برٹش
میوزیم ،لندن میں موجود ہے ۔ پیش نظر مقالے میں ایشیاٹک
سوسائٹی کے نسخے کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

خالق باری کے طرز کے تین بہاری مخطوطات اردو (دہلی) جنوری ۱۹۴۳

نصاب طفلاں ملا سعد پٹنوی، خوشحال صبیاں مصنفۂ جگجول داس اور نصاب ہندی مصنف نامعلوم
کا تعارف۔

عالم عظیم آبادی اور اس کی تصنیفات ندیم (گیا)؛ جولائی ۱۹۴۰ء

عالم علی عظیم آبادی (م بعد ۱۲۶۵ھ) کی دو اردو تصنیفات 'زبدۃ الخیال' اور 'دہ مجلس' کا تعارف۔

کربل کتھا نقوش (لاہور) اپریل۔جون، ۱۹۶۶

یہ مضمون دراصل مختار الدین احمد اور مالک رام کی مرتب کردہ 'کربل
کتھا' کا دیباچہ ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ 'کربل کتھا' کے
متعلق تفصیلی گفتگو پچھلے صفحات میں ہو چکی ہے۔ اس لیے مزید
معلومات کے لیے ان اوراق کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے

مغز مرغوب و چہار شہادت ہماری زبان (دہلی)

میرانجی شمس العشاق کی تصنیف 'مغز مرغوب و چہار شہادت'
مرتبہ محمد ہاشم علی پر تبصرہ۔

چند دکنی مثنویاں اور ان کے نمونے ندیم (گیا) نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۸

پانچ دکنی مثنویوں کا مختصر تعارف:

(۱) مثنوی چندر بدن مہیار مصنفۂ مقیمی (۲) مثنوی چندر بدن مصنفۂ بابا حسینی واقف دکنی (۳) تن لگن مصنفۂ خواجہ محمود بحری (۴) علی نامہ مصنفۂ نصرتی (۵) لعل و گہر مصنفۂ عارف الدین خاں عاجزؔ۔

سلاطین مغلیہ کی اردو نوازی روزنامہ احسان (لاہور) ۱۹۳۷

مغل شہزادیوں کی ادب نوازی روزنامہ احسان (لاہور) ۱۹۳۷

حواشی

۱۔ تاریخ جدید بہار واڑیسہ از فوق بلگرامی، مطبع اکبری 1915، پٹنہ، ص۔۳

۲۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ از دانشگاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۸، ص۔۱۱۱

۳۔ عہد اسلامی کا بنگال از محمد یحی ندوی، خدابخش لائبریری، ۲۰۰۵، ص۔۳۰

۴۔ نذر خدابخش اشاعت ۲۰۰۱، ص۔۱۳۸۔۱۳۹

۵۔ ایضاً

۷۔ تاریخ جدید بہار واڑیسہ از فوق بلگرامی، مطبع اکبری ۱۹۱۵، پٹنہ، ص۔۳

۸۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں از ابوالحسنات ندوی، معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۶، ص۴۰۔۴۳

۹۔ آئین اکبری جلد دوم، ص۔۶۷/ بحوالہ نذر خدابخش

۱۰۔ مقدمہ اعیان وطن/ مرتب سید شاہ محمد شعیب بحوالہ نذر خدابخش

۱۱۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں از ابوالحسنات ندوی، معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۶، ص۴۰۔۴۳

۱۲۔ سبحہ الجرجان بحوالہ نذر خدابخش ص۱۴۰

۱۳۔ نذر خدابخش اشاعت ۲۰۰۱، ص۔۱۳۸۔۱۳۹

۱۴۔ مختار نامہ/ ڈاکٹر عطا خورشید/ مہر الٰہی ندیم/ علی گڑھ ہیریٹج پبلیکیشنز/ علی گڑھ/ ۲۰۰۲، ص۱۵۔۱۸

۱۵۔ پروفیسر قمر الہدیٰ سے انٹرویو جواب تک غیر مطبوعہ ہے

۱۶۔ مختار نامہ/ ص۱۳/ مرتبین ڈاکٹر عطا خورشید/ مہر الٰہی ندیم/ علی گڑھ ہیریٹیج پبلیکیشنز علی گڑھ 2002

۱۷۔ انکان رممبئی رص ر۳۲ر۱۹۹۰

۱۸۔ رسالہ تحقیقی حیدر آباد سندھ شمارہ نمبر۱۲۔۱۳

۱۹۔ نقوش لاہور، ۱۹۶۵

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ پروفیسر مختار: محقق ودانشور ر مرتب شاہد ماہلی رص ۱۴رغالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۵

۳۱۔ ایضاً ص ۱۸

۳۲۔ ایضاً ص ۲۹

۳۳۔ نذر مختار رمجلس مختار نئی دہلی رص ۲۶۔۲۹

۳۴۔ ایضاً ص ۲۰۔۲۲

۳۵۔ آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب رڈاکٹر محمد ارشاد نوگانوی ندوی رص را ایچ۔ ایس پریس دہلی ۲۰۰۹

۳۶۔ طبقات شعراہند، عچا کاکوی ص ۷۵۔۸۱ طباعت پٹنہ ر۱۷۹۱

۳۷۔ فضلی اوران کی کربل کتھا: مرتبہ حنیف نقوی غالب نامہ جنوری ۱۹۸۴

۳۸۔ مقدمہ کربل کتھا: مرتبہ مختار و مالک رام ص ۱۶/ اشاعت پٹنہ ۱۹۶۵

۳۹۔ مختار نامہ/ ص ۷۔۴۲/ مرتبین ڈاکٹر عطا خورشید/ مہر الہی ندیم/ علی گڑھ ہیریٹیج پبلیکیشنز علی گڑھ ۲۰۰۲

۴۰۔ آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب/ ڈاکٹر محمد ارشاد نوگانوی ندوی/ ص/ ایچ۔ ایس پریس دہلی

۴۱۔ مقدمہ دیوان الشعر الحادرة (ف) رضا لائبریری رام پور ۲۰۱۲

۴۲۔ مختار نامہ/ ص ۷۔۴۲/ مرتبین ڈاکٹر عطا خورشید/ مہر الہی ندیم/ علی گڑھ ہیریٹیج پبلیکیشنز علی گڑھ ۲۰۰۲

باب چہار: مختارالدین آرزو کا تحقیقی فن

(الف) مختارالدین آرزو کا طرز تحقیق

(ب) مختارالدین آرزو اور معاصرین محققین

(ج) فن تحقیق میں مختارالدین آرزو کا مرتبہ

مختارالدین آرزو کا طرز تحقیق

پروفیسر مختارالدین آرزو کا شمار اردو کے اہم و مستند محققین میں ہوتا ہے۔اردو کے علاوہ وہ عربی میں بھی ان کی خدمات کا اعتراف اندرون ملک ہی نہیں بلکہ عرب مما لک میں بھی بڑی کشادہ دلی سے کیا گیا ہے۔عرب مما لک میں ان کی تحقیقی خدمات کا اعتراف جس طور پر ہوا ہے یقیناً وہ ہمارے لئے باعث فخر ہے۔اردو میں ان کی تحقیق کا دارومدار کتابوں کے خطی ذخیروں سے ہے جو ہندوستان سے غائب ہو چکے تھے۔ان مخطوطات کو نہ صرف پروفیسر مختارالدین آرزو نے ڈھونڈ نکالا بل کہ اس کی ترتیب وتدوین کے مشکل ترین مراحل سے گزر کر قارئین حضرات کے سامنے پیش کیا میرا۔اپنا خیال ہے کہ یہ وہ خاردار وادی ہے جس سے اکثر لوگ بچتے ہیں اوراس میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتے لیکن پروفیسر مختارالدین آرزو نے اسے بصد شوق قبول کیا اور پھر وہ کارہائے نمایاں انجام دیا جو نا قابل فراموش ہے بلکہ انھوں نے تحقیق وتدوین کے فن میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جو طلباء،اساتذہ اوراسکالروں کے لئے قابل رشک ہی نہیں لائق عمل بھی ہے۔اس سے ان کی محققانہ نصیرت، تحقیقی شعور، دقت نظر، تبحر علمی، ذوق وشوق اور مہارت تامہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں چند ایسے افراد ہیں جو تحقیق کے فن میں اعلی منازل پر فائز ہیں جن کا تحقیقی شعور اور فن تحقیق میں ان کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ان معتبر و مستند لوگوں میں امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر نذیر احمد، مالک رام، تنویر احمد علوی، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر عبدالستار دلوی، عبدالقوی دسنوی، پروفیسر رشید حسن خان، شمس بدایونی اور پروفیسر مسعود حسن خان شامل ہیں۔ پروفیسر مختارالدین آرزو کی تحقیقی خدمات کا دائرہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔

حقیقت میں تحقیقی کوشعبوں میں تدوین وفن تحقیق ایک نہایت دشوار ومشکل کام ہے۔ پروفیسر مختارالدین آرزو نے اسی راہ کو اپنایا ہے۔انہوں نے بہت سے ایسے متون مدون کئے ہیں جن کی دریافت کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے یا جنھیں انھوں نے کتابوں سے مستخرج کیا ہے۔ان سے پہلے دوسروں نے بھی یہ کام کیا ہے مثلاً عرشی صاحب نے تذکرۂ دستور الفصاحت اور مسعود حسن رضوی صاحب نے تذکرۂ نادر تعمیر کئے۔لیکن مختار صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے ایسا متن نہیں کیا جو عام طور سے دستیاب ہوا۔

میں ذیل میں صرف تین مثالیں پیش کروں گا جس سے مختارالدین احمد کی تحقیقی فن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔قتیل شفائی بارہویں صدی ہجری کے آواخر میں ایک بہت بڑا شاعر واہم مصنف گزرا ہے لیکن ان کی پیدائش، جائے پیدائش،سن پیدائش میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ادباء ودانشوراں میں ان کے تعلق سے مختلف باتیں سامنے آتی ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اپنی بات رکھتا ہے لیکن پروفیسر مختارالدین آرزو صاحب بغیر تحقیق و چھان بین کے کوئی بات نہیں کہتے۔چنانچہ قتیل دہلوی کے متعلق فرماتے ہیں۔

> ''بارہویں صدی ہجری کے آواخر اور تیرہویں صدی کی ابتدا میں مرزا قتیل کی ذات بھی بڑی عجیب وغریب گزری ہے۔فارسی زبان کا مشہور مصنف و شاعر،متعدد اردو شعرا کا استاذ۔لیکن آج تک اس کے نام کے متعلق جھگڑا ہے، اس کی وطنیت مشتبہ ہے۔اس کی عمر کا پتہ نہیں، کہاں کہاں رہا نہیں معلوم،کیا کیا کرتا رہا نہیں کہا جا سکتا۔کب وفات پائی،اس میں اختلاف کب پیدا ہوا یقیناً اس کی تحقیق نہیں''۔
>
> ''مسلمان ہونے کے بعد اس کا نام تبدیل ہوا۔نام کیا رکھا گیا۔مختلف اصحاب مختلف نام بتاتے ہیں۔اس کا نام ابوطالب نے محمد قتیل رکھا،نواب صدیق حسن خان بھوپالی،حکیم عبدالغنی،صاحب ریاض الفردوس مصحفی اور عبرتی نے محمد حسین، ڈاکٹر عبدالحق اور پنڈت کیفی نے محمد حسین۔بعض تذکرہ نگاروں نے عبرتی کا ایک بھی ایک جگہ یہی بیان ہے۔محمد حسن اور صاحب

قاموس المشاہیر نے احمد حسن لکھا ہے'' (۱)

مرزا کی پیدائش کہاں ہوئی، اس مسئلہ میں ادباء و مصنفین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس تعلق سے پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب نے تمام اہم اور مستند کتابوں کا حوالہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر مختار الدین آرزو نے اس حوالے سے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اس طرح ہیں۔

(۱) تذکرہ سفینۂ ہندی/مرتبہ بھگوان دان

(۲) نشتر عشق/عاشق عظیم آبادی

(۳) عیار الشعراء/خوب چند ذکاء

(۴) تذکرۂ معراج الخیال/عبرتی عظیم آبادی

(۵) ریاض الافکار/عبری عظیم آبادی

(۶) خلاصۃ الافکار/ابوطالب اصفہانی

(۷) قاموس المشاہیر/نظامی بدایونی

(۸) بیاض تمنا/خواجہ محمد علی تمنا خلف عبداللہ تائید

(۹) اورینٹل بائی گرافیکل ڈکشنری (۲)

پروفیسر مختار الدین آرزو ان کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر مذکورہ اہم کتابوں کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں مرزا قتیل کے احوال وکوائف کا پوری طرح جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد مرزا قتیل کے تعلق سے اپنے تجربات ومشاہدات ومطالعہ کی روشنی میں جامع ومفید ومستند باتیں حیات و جائے پیدائش کے متعلق پر بھرپور تحریر کرتے ہیں اور ہونا بھی یہی چاہئے کہ کسی پہلو پر بات کرنے کے لئے سارے مستند مواد /کتابیں جمع ہوں تب اس کی روشنی میں کچھ تحریر کیا جائے اور اپنی رائے قائم کی جاسکے۔ ان کی زبانی مرزا قتیل کے وطن اور جائے پیدائش ملاحظہ ہو۔

> ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ قتیل کا وطن دہلی تھا۔ جو اصحاب اس بات کے مدعی ہوں کہ وہ فرید آبادی تھا، انہیں اس بات کا ثبوت معتبر معاصرین کے بیانات سے دینا چاہئے، مجھے تو تذکرہ و

تاریخ کا کوئی بیان ایسا نہیں مل سکا جس سے اس کی وطنیت فرید آباد ثابت
ہو سکے ۔ وطنیت تو بعد کی چیز ہے، میری خیال میں قتیل کا قیام فرید آباد بھی
محقق نہیں ۔ تاریخ وتذکرہ روزنامہ، مکاتیب اور بیاضوں کے مطالعے سے
ہمیں قتیل کے مختلف شہروں میں رہنے اور آنے جانے کی بیسیوں مثالیں
ملتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی فرید آباد میں
قیام ثابت نہیں ہوتا۔'' (۳)

دوسری مثال عرب کے ایک نہایت معتبر مصنف وشاعر صلاح الدین الصفدی جو آٹھویں صدی ہجری کا ہے اس کے احوال وکوائف جب بیان کرتے ہیں تو ان کی تعلیم تربیت خاندانی پس منظر کے ساتھ ساتھ مصر، شام لبنان، فلسطین ۔ اردن وغیرہ کی قدیم وجدید اہمیت وافادیت کے علاوہ وہاں ادباء وشعراء ان کی خصوصیات، حدود اربعہ، معروف اشخاص واشیاء، اس وقت کے سماجی، تہذیبی، معاشی، اور معاشرتی احوال ۔ اس دور کے امراء ووزرا کے اوصاف حمیدہ واخلاق فاضلہ، رعایہ پروری، دینی وادبی امور میں ان کی دلچسپی وغیرہ امور مع دلیل زیر بحث لاتے ہیں ۔ اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے متعدد مستند مآخذ بھی پیش کرتے ہیں ۔ (۴)

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی تصانیف تو کافی ہیں لیکن ان پر بہت کم مواد دستیاب ہے ۔ نیز ان کی ، تاریخ پیدائش، تعلیم مقام پیدائش میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے ان سب کے اشکالات کو نہایت احسن طریقے سے رفع کیا ہے ۔ دراصل ہوا یہ کہ آپ نے ان کے تعلق سے پرانے رسائل، کتابیں، معاصرین کی تحریروں کی خاک چھاننے کے بعد پھر قلم اٹھایا ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں کیونکہ تحقیق میں ان کا جو فن ہے وہ اوروں سے مختلف ہے ۔ پروفیسر مختار الدین آرزو کچھ کہتے سے قبل بہت ساری معلومات حاصل کرتے ہیں کئی کتابیں اس موضوع پر پڑھتے ہیں اس کے علاوہ خارجی معلومات بھی حاصل کرتے ہیں پھر جا کر اپنی بات سامعین کے روبرو پیش کرتے ہیں ۔ آج کل کے محققین کی طرح نہیں کہ بنا پڑھے کچھ کہنے لگتے ہیں ۔ دراصل گفتگو میں اسی وقت وزن پیدا ہوتا ہے جب انسان کا مطالعہ نہایت وسیع ہوتا ہے، معلومات میں کافی گیرائی ہوتی

ہے، مصادر و مراجع پر اچھی پکڑ ہوتی ہے اور معاصر ادباء و شعراء، مصنفین و محققین کی تحریں بھی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور میرا اپنا خیال ہے کہ پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب میں یہ ساری باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان سب باتوں سے ان کے تحقیقی فن اور محققانہ شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میمن صاحب نے ممتاز حسن، شان الحق حقی، ڈاکٹر سید محمد یوسف اور بعض دوسرے شائقین کے اصرار پر ترقی بورڈ کراچی کے زیر اہتمام عربی زبان و ادب پر اردو میں تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان تقریروں کو ٹیپ کر لیا گیا تھا بعد کو انہیں سن کر کاغذ پر منتقل کیا گیا۔ یہ تقریریں بالاقساط ''اردو نامہ'' کے آٹھ دس شماروں میں شائع ہوئیں لیکن ٹیپ سے کاغذ پر منتقل کرنے میں کافی احتیاط نہیں برتی گئی ''اردو نامہ'' میں اشاعت کے وقت ٹیپ پر بھی توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی انہیں احتیاط کے ساتھ پڑھا گیا۔ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے کراچی کے مطبوعہ اوراق کی زیراکس کاپی منگوائی اور ان کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ متعدد مقامات پر عبارتیں گنجلک ہیں، کہیں کہیں مفہوم بھی غیر واضح ہے۔ جا بجا سماعت اور قرأت اور بعد کو طباعت کے مراحل میں الفاظ اور فقرے کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔

انھوں نے کراچی جا کر ترقی اردو بورڈ کے سابق ڈائرکٹر شان الحق حقی اور اس وقت کے ڈائرکٹر پروفیسر ابو اللیث صدیقی سے مل کر اصل ٹیپ حاصل کرنے کی کوشش کی اس لئے بھی کہ انہیں معلوم تھا کہ ان تقاریر کی آخری قسطیں شائع نہیں ہو سکی تھیں اور وہ مکمل متن شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی نہ ٹیپ کا پتا چل سکا نہ ان اوراق کا جو غیر مطبوعہ رہ گئے تھے۔ بہر حال علی گڑھ واپس آ کر انھوں نے زیراکس کاپی سے ایک نقل تیار کی اس لئے کہ عکس واضح نہیں تھا اور طباعت جس ٹائپ میں ہوئی تھی وہ بہت باریک تھا۔ انھوں نے پہلے نقل شدہ اجزاء کا ''اردو نامہ'' کے مطبوعہ اوراق سے مقابلہ کیا پھر انھیں اپنے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کر کے ان کا عربی میں ترجمہ کرایا، ترجمے کو خود پوری توجہ اور احتیاط سے دیکھا۔

دراصل ترجمے مختلف اصحاب نے کئے تھے اور ہر ایک کا اپنا انداز تھا، لہذا ترجمے میں یکسانی پیدا کی، بعض مقامات پر غلط تعبیر سے معنی میں فرق پیدا ہو گیا تھا اسے درست کیا انہوں نے ابتدا میں ایک تمہید لکھی اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان تقاریر پر بہت مفید اور پر از معلومات تعلیقات قلمبند کیں۔ ابتدائی

تقریر چونکہ لکھی ہوئی نہیں تھی اور میمن صاحب کے سامنے غالباً نوٹس بھی نہیں تھے۔ وہ اپنے حافظے کی مدد سے تقریر کر رہے تھے جب کہ ان کی عمر ۸۰ر کے لگ بھگ ہوگی،اس لئے بعض مسامحات کا وقوع پزیر ہو جانا مستبعد نہ تھا،ایسے مقامات کی مختار الدین صاحب نے تصحیح کی اور بعض کی اپنے حواشی میں نشاندہی کر دی۔ان سب مرحلوں کے بعد پروف ریڈنگ اور طباعت کی سنگلاخ وادی انہوں نے طے کی۔انہوں نے بعض اجزاء کے متعدد بار پروف دیکھے اس کے باوجود صحت طباعت کی طرف سی شاید اب بھی وہ مطمئن نہیں ہیں۔تقریباً ۱۰۰ر صفحات پر مشتمل یہ مضمون ''محاضرات میمنی'' کے عنوان سے مجلۃ المجمع العلمی الہندی کے مخصوص شمارے کے دوسرے حصے کی ابتداء میں دیکھا جا سکتا ہے۔(۵)

پروفیسر آرزو کا تحقیق و تدوین کا یہ طریق کا کم وبیش میمن صاحب کی جملہ تحریرات کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر تصنیفات و تالیفات رمضامین ریسرچ پیپر وغیرہ کے ساتھ بھی عمل میں آیا۔واقعہ یہ ہے کہ جب انسان اپنی بات مدلل حوالوں کی روشنی میں کہتا ہے تو اس میں وزن پایا جاتا ہے ورنہ آج کل کے تحقیقی کام کی نوعیت کیا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے طالب علم محنت کم کرتا ہے اور ناموری کا طالب زیادہ ہوتا ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب تحقیقی فن کا شاندار شاہکار تذکرۂ آزردہ مولفہ مفتی صدرالدین آزردہ اس کتاب کی تحقیق و تدوین میں جو محنت و مشقت آپ نے اٹھائی ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔مفتی صدرالدین آزردہ (۱۷۸۹ء۔۱۸۶۸ء) کا مرتب کردہ تذکرہ شعرائے اردو،جس کے ایک ناقص الآخر نسخے کے فقط ابتدائی ۴۴صفحات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہوکر کورپس کرسٹی کالج،کیمبرج (انگلستان) میں محفوظ ہیں۔آپ نے اس کا عکس حاصل کیا اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کیا۔اس تذکرے میں حرف ق تک کے ۱۰۶ شعراء کا مختصر تذکرہ مع انتخابِ کلام درج ہے۔میرا اپنا خیال ہے کہ ان شعراء کے حالات بیک وقت جمع کر دئے گئے ہیں اور بڑے اختصار کے ساتھ معلومات کو فراہم کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔یہ بھی ایک اہم ترین کام ہے۔مرتب کے حواشی بہت قیمتی اور بیحد مفید ہیں۔طلباء و اسکالروں کے لئے یقیناً یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کی ایک اہم کتاب گلشن ہند (جو دراصل تذکرہ شعرائے اردو) ہے۔ بالٹین لائبریری اور برٹش میوزیم کے نسخوں کی مدد سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔مزید یہ کہ جدید اصولوں کے مطابق اس کو ایڈٹ کیا گیا ہے خاص بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اردو کے ۲۸۹ شعرائے کرام احوال وکوائف کے ساتھ ساتھ ان کے نمونۂ کلام بھی مندرج کر دئے گئے ہیں ۔جویان علم وادب کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ احوال وکوائف کے لئے طلباء بہت زیادہ پریشان ہو نے ہیں۔یہاں اس کتاب میں بیک وقت اتنے لوگوں کے احوال ملتے ہیں جس سے طلباء کرام کے لئے آسانی کے ساتھ ساتھ ان کا قیمتی وقت بھی بچ جاتا ہے۔میری اپنے خیال کے مطابق کتاب تو اہم ہے ہی لیکن اس کتاب کے حواشی بھی بہت معلومات افزا ہیں جو پروفیسر مختارالدین آرزو کے تبحر علمی اوران کے تحقیقی ذوق وشوق کی اعلی مثال ہیں۔

ان کے معرکۃ الآراء کاموں میں کربل کتھا بہت اہمیت وافادیت کا حامل ہے۔کربل کتھا اب تک کی تحقیق کے مطابق شمالی ہند میں اردو نثر کی قدیم ترین کتاب ہے۔اس کے مصنف کا نام فضل علی اور تخلص فضلی ہے۔تصنیف کا سنہ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲۔۱۷۳۳ء) اور نظر ثانی کا سنہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) ہے۔یہ عجیب بات ہے کہ اپنے زمانی تقدم اور تاریخی اہمیت کے باوجود عرصۂ دراز تک یہ کتاب اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل رہی۔فضلی کے معاصرین اور زمانہ مابعد کے تذکرہ نگاروں نے نہ فضلی کا ذکر کیا اور نہ ان کی اس اہم کتاب کا۔ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے ے بعد سب سے پہلے مولوی کریم الدین نے طبقات شعرائے ہند (طبع اول ۱۸۴۸ء) کے ذریعے اس کتاب کو اہل علم کے درمیان متعارف کرایا۔وہ مذکورۃ الصدر کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''فضل علی نام، تخلص فضلی، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وہ موجود تھا۔اس نے ایک کتاب ''دہ مجلس'' اردو زبان میں قدما کے محاورات پر لکھی ہے۔وہ خود کہتا ہے کہ ان ایام میں میری عمر بائیس برس کی تھی۔اس کتاب کا نام اس نے ''کربل کتھا'' رکھا ہے۔سبب تصنیف اس کتاب کا جو اس نے بیان کیا

ہے۔ بعینہٖ اس کی عبارت بے کم وکاست لکھتا ہوں۔‘‘(۶)

کریم الدین کے تعارف اور اصل کتاب کے طویل اقتباس نقل کر دینے کا فائدہ یہ ہوا کہ زمانۂ مابعد کے مصنّفین اس کتاب سے واقف ہوگئے۔ چنانچہ گارسان دتاسی نے تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی ہیں (۱۸۷۰ء) محمد حسین آزاد نے آب حیات میں (۱۸۸۷ء) فرزند احمد صفیر بلگرامی نے جلوۂ خصر میں (۱۸۸۵ء)، احسن مارہروی نے تاریخ نثر اردو (۱۹۳۰ء) نصیر حسین خیال نے مغل اور اردو میں (۱۹۳۳ء) اور حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں (۱۹۵۷ء) اردو نثر کی ایک قدیم کتاب کے طور پر کربل کتھا کا ذکر کیا۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی یہ کتاب دستیاب نہ ہوسکی۔ ان سب کا ماخذ کریم الدین کی طبقات شعرائے ہند تھی۔

دراصل ہوا یہ کہ کریم الدین نے کربل کتھا کا اپنا اکلوتا قلمی نسخہ مشہور جرمن مستشرق، ڈاکٹر الواس اشپرنگر (۱۸۱۳۔۱۸۹۳ء) کی نذر کر دیا۔ کیونکہ وہ ان کے محسنوں میں تھے اور انھوں نے آڑے وقتوں میں کریم الدین کی مدد کی تھی۔ اشپرنگر نادر و نایاب کتابوں کے نہایت قدرداں بلکہ عاشق تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ملازمت سے سبک دوش ہوکر وہ ہندوستان سے یورپ کے لیے روانہ ہوئے تو عربی و فارسی اور اردو کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ کتابوں میں کربل کتھا کا قلمی نسخہ بھی شامل تھا۔ جو ان کے ساتھ جرمنی پہنچ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کریم الدین کے تعارف کے بعد بھی عام اہل علم حضرات کی اصل کتاب تک رسائی نہ ہوسکی اور طبقات شعرائے ہند میں منقول اقتباس کے علاوہ کربل کتھا کا کوئی حصہ زیور اشاعت سے آراستہ نہ ہوسکا۔

پروفیسر مختار الدین احمد نے ٹوبنگن سے اس کا عکس حاصل کیا اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے مارچ ۱۹۶۱ء میں اسے شائع کر دیا۔ لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اس کے نسخے منظر عام پر نہ لائے جاسکے۔ اسی دوران جناب مالک رام اور پروفیسر مختار الدین احمد نے ترتیب و تدوین کے جدید اصولوں کے تحت اسے مرتب کیا اس کتاب میں حواشی بھی بہت قیمتی بے حد مفید ہیں اور اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ادارۂ تحقیقاتِ اردو پٹنہ کی جانب سے چھاپ کر علمی و ادبی حلقوں میں عام کر دیا۔ کربک کتھا کی تاریخی و ادبی اہمیت محتاج تعارف نہیں شمالی اردو نثر کی تاریخ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ

میں مثالی اہمیت رکھتی ہے اس کتاب کی اشاعت سے طلباء، اساتذہ اور تشنگان علم وعرفاں کو بے انتہا فائدہ ہوا اس کتاب کی عدم حصولیابی کی شکل میں اردو نثر کی اہم تاریخ سے ہم محروم رہتے ۔ میرا اپنا خیال ہے کہ پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کی متنوع سرگرمیاں متعدد خدمات ان کے بے شمار کارنامے کو ہم الگ کر دیں تب بھی یہ کتاب تن تنہا اس کی ان کے شہرت دوام و نیک نامی کے لئے کافی ہے۔اور پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔اور آنے والے طلباء و اسکالرس ان کے اس اہم کام کو اپنے لئے مشعل راہ تصور کرینگے اور فائدہ بھی اٹھائینگے (۷)

مختارالدین آرزواور معاصر محققین

اردو میں تحقیق کا آغاز مستشرقین کے محققانہ مساعی کا رہین منت ہے۔۱۸۴۶ء میں الواس اسپرنگر کوشان اودھ کے کتب خانہ کی فہرست مرتب کرنے پر مامور کیا گیا جس کی اشاعت ۱۸۵۰ء میں ایک عمل میں آئی تھی۔گارساں دسائی کی تاریخ ادبیات ہندوستان کی پہلی جلد ۱۸۳۵ء میں اور دوسری ۱۸۷ء میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔اردوادب کا آغاز دکن میں ہوا اور باقاعدہ ادبی تحقیق کا آغاز بھی سرزمین دکن ہی سے ہوا شمس الدین قادری،عبدالجبار ملکاپوری،ڈاکٹر زور،عبدالقادر سرداری اورنصیر الدین ہاشمی نے دکنی ادب پاروں کی بازیافت،ان کی ترتیب اور تحقیق سے دلچسپی لی اور تاریخ ادب کو ماضی میں ایک صدی آگے بڑھایا اور مرور زمانہ کی گردوغبار میں جواہر ریزے ہماری نظر سے اوجھل ہوگئے انھیں اہل زبان سے روشناس کرا کے بڑا کارنامہ انجام دیا اور اس طرح محققین نے کھویا ہوا ادبی خزانہ تلاش کیا اورادب کو مالا مال کیا''فردوس گم شدہ'' کی بازیافت کی مہم دکنی محققین نے سر کی۔

شمالی ہند میں محققین نے ادبی تحقیق میں گرانقدر اضافے کئے ہیں۔قاضی عبدالودود کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔وہ عربی،فارسی،انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں تاریخ سے لگاؤ ہے نیز قانون سے واقفیت نے نتائج کے استخراج اور دلائل و براہین کی اہمیت ان پر واضح کردی ہے۔دراصل قانون کے مطالعہ نے انہیں تحقیق میں لفظوں کے صحیح استعمال کا سلیقہ سکھایا ہے۔عبدالودود مالہ وماعلیہ پر نظر رکھتے ہیں۔وہ اردو کے ایسے محقق تصور کئے جاتے ہیں جو اغلاط اور تسامحات کی نشاندہی میں شخصی تعلقات ،مروت اور رعایت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''میر تقی میر حیات وشاعری'' نورالحسن

ہاشمی کی کتاب ''لکھنؤ کا دبستان'' وغیرہ اس کی اعلی مثال ہیں۔ اردو میں تحقیق کا ذکر عبدالحق کی نشان دہی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے تذکرے سے بھی دلچسپی لی اور سوانح نثر و نظم کے نمونوں کو بھی مرتب کے تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ ان کے مرتب کردہ کتابوں رتذکروں میں کچھ اہم حسب ذیل ہیں

(۱) نکات الشعراء (۱۹۳۵ء)

(۲) تذکرہ ریختہ گویان (۱۹۳۳ء)

(۳) مخزن نکات (۱۹۲۹ء)

(۳) چمنستان شعراء (۱۹۲۸ء)

(۴) گل عجائب (۱۹۳۴ء)

(۵) مخزن نکات (۱۹۳۳ء)

مذکورہ کتابیں اپنی جگہ بہت اہم ہیں اس کے علاوہ ایک وقیع کارنامہ وجہی کی ''سب رس'' کی ترتیب وتدوین'، وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری''، سید محمد اثری کی ''خواب وخیال'' میرامن کی ''باغ و بہار'' وغیرہ جیسی اہم ترین کتابیں بھی شامل ہیں۔(۱)

عبدالحق نے مختلف موضوعات پر تحقیقی کام ہے اور اردو میں ہمہ جہتی تحقیق کی روایت کی قائم کردہ اور پروردہ ہے۔ اردو کے ایک اور سربرآوردہ مرتب متن ایک ممتاز نقاد اور ڈرامے کے ایک بلند پایہ محقق کی حیثیت سے مسعود حسن رضوی کا نام بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مسعود حسن رضوی نے میرانیس کے فن کی تفہیم وتحسین اور قدر شناسی کا حق ادا کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ لکھنؤ کی تہذیب اور یہاں کے تخلیق کاروں کے ادبی کارناموں کو متعارف کروانے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ مسعود حسن رضوی کا اردو کے بلند پایہ محققین میں شمار ہوتا ہے ان کے تحقیقی انکشافات و دریافتوں نے اردو ادب کے سرمایۂ میں گرانقدر اضافے کئے ہیں۔ متعدد متون ایسے ہیں جنہیں مسعود صب نے پہلی بار اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ جیسے'' فیض میر'' ''دیوان فائز'' ''تذکرہ گلشن سخن'' ''تذکرہ نادر'' ''متفرقات غالب'' وغیری تحقیقی کارنامے ہیں۔ اس کے علاوہ ''مثنوی بادمخالف'' ''غالب کا اردو سلام'' ''فسانۂ عبرت'' ''روح

انیس''،''گلشن سخن'' ''مجالس رنگین''وغیرہ بھی بہت اہم ہیں۔دراصل آرزو کے یہاں تحقیقی وتنقیدی دونوں صلاحیتیں موجود تھیں میرا اپنا خیال ہے یہ دونوں صلاحیتیں بہت کم ادیبوں کے حصہ میں آتی ہیں اور جن میں یہ دونوں چیزیں یکجا ہو جائیں اس کی عظمت وانفرادیت یقینی طور پر مسلم ہو جاتی ہے۔(۲)

ہم ہندوستان کے چندان اہم افراد کا ذکر کریں گے جو پروفیسر مختارالدین آرزو کے معاصرین میں ہیں اور جنھوں نے تحقیق کے فن میں اعلی منازل پر طے کئے ہیں اور جو برصغیر میں اپنے تحقیقی شعور اور فن تحقیق میں ان کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ان معتبر ومستند لوگوں میں پروفیسر عرشی، پروفیسر نذیر احمد، مالک رام، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر عبدالستار دلوی، عبدالقوی دسنوی، پروفیسر رشید حسن خان، شمس بدایونی، اور پروفیسر مسعود حسن خان شامل ہیں۔پروفیسر مختارالدین آرزو کی تحقیقی خدمات کا دائرہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بزرگ افغانستان کے علاقہ صوات کے رہنے والے تھے۔اس علاقے میں سوات اور بنیر کی سرحد پر ایک قصبہ مٹا باجکئے ہے۔اس میں حاجی خیل نام سے ایک خاندان آباد تھا جو یوسف زئی قبیلے کی ایک شاخ اکوزئی کی شاخ تھا۔مشرف خان نام کے ایک صاحب مٹا باجکئے خان تھے ان کے پوتے رحم باز خاں نواب سید فیض اللہ بہادر والی رام پور کے عہد میں وارد رام پور ہوئے خان قبیلے کے بیٹے ہونے کے سبب یہ خان زادے کہلاتے تھے اس لیے صاحب عزت بھی تھے (۳)

امتیاز علی خان عرشی صاحب کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو تحقیق کے آداب و رموز سے آشنا کیا۔تحشیہ و تدوین کا معیار اور اپنی تحقیقی کاوشوں کو بیش بہا تصانیف سے روشناس کروایا۔ان کی تدوین و تحقیق کے تعلق سے کتابیں ہماری رہبری اور رہنمائی کرتی ہیں اور ہمیں اس فن کے اصولوں سے آگاہ کرتی ہے۔بہت سی کتابوں کو جو ''نقش نگار طاق نسیاں'' ہو چکی تھیں تلاش و جستجو کے بعد عرشی صاحب نے نئی زندگی عطا کی اور اردو تحقیق و تدوین کو اعتبار بخشا۔امتیاز علی عرشی کے جدامجد حاجی خلیل خاندان کے رئیس تھے۔عرشی کے دادا کا نام اکبر علی خان تھا وہ رام پور میں اکبر علی خان محدث کے نام سے مشہور تھے۔ (۴) اکبر علی خان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مختار عرشی کے والد تھے۔امتیاز علی عرشی جمعرات کے دن ۲۹ر رمضان ۱۳۲۲ھ مطابق ۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو اپنے آبائی مکان واقع محلّہ پھلواڑ رام پور کے ایک دین دار خاندان میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کی ابتدا مدرسہ ''مطلع العلوم'' سے ہوئی جہاں عربی اور فارسی کی متداول درسی کتابوں کا

مطالعہ کیا۔۱۹۲۲میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کی سند لی اوراورینٹل کالج میں داخلہ لے کرمولوی فاضل کا امتحان دینے لاہور آئے اور درجۂ اول میں یہ امتحان کامیاب کیا۔ملازمت بھی کی تو علم وادب سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ندوۃ العلماء کے سفیر مقرر ہوئے ۔۱۹۳۲میں ناظم کتب خانہ رام پور مقرر ہوئے اوراسی سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے وابستہ کرلیااورزندگی کی آخری سانس تک یہیں رہ کرعلم وادب کی ترویج واشاعت میں لگے رہے۔آپ نےعلم ادب کے میدان میں وہ شمع روشن کی جس کی آب وتاب آج بھی قائم ودائم ہےاور مستقبل مین بھی طلباءواسکالر برابراس سے فائدہ مستفید ہوتے رہینگے۔آپ نے اپنی تحقیقی کاوشوں سےادب کوبیش بہا تصانیف سے روشناس کرایا۔اورتدوین وتحشیہ کاایک بلندوبالا معیار قائم کیا آپ کی حیثیت تنتے تنہا ایک انجمن کی تھی جس کے کئی رنگ تھے اور ہر ایک دوسرے سے جدا خصوصیت کا حامل تھا آپ کی چند اہم کتابیں مندرجی ذیل ہیں۔

(۱) مکاتیب غالب ۱۹۳۷

(۲) نظام غالب ۱۹۴۰

(۴) ترجمہ مجالس رنگین ۱۹۴۲

(۵) انتخاب غالب ۱۹۴۲

(۶) نادرات شاہی از شاہ عالم ۱۹۴۴

(۷) سلک گوہراز انشاء ۱۹۴۸

(۸) کہانی رانی کیتکی از انشاء

(۹) محاورات بیگمات از رنگین ۱۹۵۲

(۱۰) دیوان غالب نسخۂ عرشی ۱۹۵۸

(۱۱) تاج التواریخ

(۱۲) کتاب المقطوع والموصول ۱۹۸۰

(۱۳) تاریخ اکبری معروف بہ تاریخ قندھاری ۱۹۶۲

(۱۴) تاریخ محمدی ۱۹۶۰

(۱۵) سیر المتأخرین

(۱۶) کتاب مرسوم الخط ۱۹۷۷

(۱۷) تفسیر سفیان الثوری

(۱۸) نظام نامہ ۱۹۴۰

(۱۹) مفتاح التواریخ

(۲۰) دیوان ریختی (۵)

تحقیق میں امتیاز علی خان عرشی کا خاص مقام و مرتبہ ہے دراصل ان کا خاص کارنامہ ان کی قابل قدر تدوین و ترتیب ہے۔ اختلاف نسخ، جعلی نسخوں، تصحیح متن، حوالوں کی جانچ پڑ تال اور تحقیقی مواد کی فراہمی کا ان میں ایک خاص سلیقہ موجود ہے۔ غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کے تحقیقی اور علمی کارنامے نا قابل فراموش ہیں۔

''مکاتیب غالب'' میں وہ خطوط نہایت محققانہ دیدہ وری کے ساتھ یکجا کر دئے گئے ہیں جو غالب نے نواب کلب علی خان وغیرہ کے نام لکھے تھے اس پر مفصل اور عالمانہ حواشی موجود ہیں۔ مکاتیب غالب کے سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب سے عرشی صاحب کی تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے خطوط غالب کو بڑی احتیاط سے جانچنا اور پرکھا ہے اور بڑے حزم و احتیاط سے انہیں مرتب کر کے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ یہ خطوط ۱۲۱/صفحات پر محیط ہیں اور ان پر عرشی نے ۱۸۳/صفحوں کا معلومات آفریں مقدمہ درج کر کے اس کی تحقیقی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ خطوط رام پور داد الانشاء میں کاغزات کے انبار میں دبے ہوئے تھے۔ ان خطوط سے عرشی نے غالب کی زندگی کے بعض نئے پہلو ڈھونڈ نکالے ہیں اور تحقیق کرنے والوں کے سامنے بعض نئے گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔

مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب کے دیباچے میں غالب کی مکتوب نگاری پر اظہار خیال ضرور کیا ہے لیکن اس میں جن پہلوؤں پر خاطر خواہ زور نہیں دیا گیا تھا یا جو نظر انداز ہو گئے تھے انہیں عرشی صاحب نے منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے ''محمد شاہی طرز مراسلت'' سے انحراف کر کے اپنی نئی راہ تراشی تھی۔ خطوط میں رنگارنگی اور دلچسپی پیدا کرنے کے گر سے وہ

خوب واقف تھے۔نوابوں کے نام خطوط کا طرز عام خطوط سے کسی حد تک مختلف ہے لیکن ان میں بھی شوخی اور ظرافت کے عناصر موجود ہیں۔''انشائے غالب''اور متعلقات انشاء'' کے زیر عنوان عرشی نے نہایت اہم ادبی نکات پیش کیے ہیں۔

امتیاز علی خان عرشی کو غالب کی ذات اور اس کے فن سے جو غیر معمولی وابستگی تھی اس کا اندازہ کلام غالب کے دیدہ زیب اور معیاری انتخاب سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔کتب خانہ رام پور کے ردی گھر میں غالب کا کلام بے التفاتی کی نذر ہو چکا تھا امتیاز علی خان عرشی نے اس دولت بے بہاء کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور بڑی محققانہ بصیرت کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔یہ امتیاز علی خان عرشی کا ایک شاندار ادبی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔''انتخاب غالب'' کئی اعتبار سے لائق توجہ ہے۔''دیوان غالب''۱۹۵۸ تین حصوں پر مشتمل ہے۔حصہ اول کو''گنجینۂ معنی'' سے موسوم کیا گیا ہے۔اس میں غالب کے ابتدائی کلام نے جگہ پائی ہے اس میں کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو غالب نے ۱۹۵۱ کے ایڈیشن میں شامل نہیں کئے تھے۔ دوسرے حصے کا نام''نوائے سروش'' ہے اس میں غالب کا وہ کلام ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں شائع کروا دیا تھا۔آخری تیسری حصے کا نام''یادگار نالہ'' ہے اس میں ایسا کلام جمع کیا گیا ہے جو ان کے دیوان کے کسی حاشیے ،خط یا کسی بیاض سے دستیاب ہوا ہے۔اس طرح امتیاز علی خان عرشی نے تلاش بسیار کے بعد غالب کے تمام کلام یکجا کر کے شائع کرنے کوشش کی ہے۔

امتیاز علی خان عرشی اس سلسلے میں نے بڑی عرق ریزی اور جگر کاری سے کام لیا ہے۔انھوں نے تمام مطبوعہ نسخوں کا بغور مطالعہ کیا اور نسخوں کی بھی جانچ پڑتال کی ہے۔ان میں جو اختلاف پائے (بہتر ۷۲)صفحات میں اس کی وضاحت کر دی ہے اس میں غالب سے متعلق ایسی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں جن سے ہم ناواقف تھے''طرز سخن'' ''تعریف سخن'' ''تعریف شعر''اور عیوب شعر'' کے عنوان سے عنوانات کے تحت خود غالب کے ان موضوعات سے متعلق افکار کی تشریح کی گئی ہے۔''دیوان غالب '' امتیاز علی خان عرشی کا تحقیقی شاہکار تصور کیا جاتا ہے اس میں انہوں نے غالب سے متعلق عقیدت اور تحقیق سے وابستگی کا حق ادا کیا ہے۔اس کتاب میں غالب کا کلام تاریخی ترتیب سے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اس کی بنیاد نسخہ عرشی ہے۔۱۸۵۷ میں غالب نے اپنا کلام بقلم خود لکھ کر نواب ناظم علی خان کی خدمت

میں پیش کیا تھا۔ دیوان غالب کا مقدمہ نہایت وقیع اور تحقیقی آگہی کا آئینہ دار ہے۔اس کے حواشی معنی خیز اور مبسوط ہیں۔ساہتیہ اکیڈمی نے دیوان غالب پر ۱۹۶۱ میں امتیاز علی خان عرشی کو انعام سے نوازا تھا۔

غالبیات کے ماہر ہونے کے علاوہ امتیاز علی خان عرشی نے دوسرے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے انشاء کی تخلیق ''کہانی رانی کیتکی کی'' رام پور رضا لائبرریری رام پور کے دو مخطوطوں کی مدد سے مرتب کر کے صحیح متن کو منظر عام لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کی ہے اور اس پر غلطی سے عبدالحق کا نام شائع ہو گیا ہے۔انشا کی ''سلک گوہر'' نسخہ رام پور رضا لائبریری کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ امتیاز علی خان عرشی نے اسے ۱۹۴۸ میں شائع کر دیا ہے۔دراصل یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں انشا نے اپنی عبارت آرائی اور زبان و بیان پر قدرت کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے اور اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو بے نقطہ ہیں۔اس کتاب کے دیباچے میں عرشی نے انشاء کی شخصیت کے بعض اہم خدوخال بڑی تحقیقی بصیرت کے ساتھ اجاگر کئے ہیں۔(۶)

غالب کے علاوہ عرشی صاحب نے انشاء اور سعادت یار خان رنگین کے کلام اور ان کے ادبی اکتسابات سے بھی دلچسپی لی ہے۔رنگین کی ''مجالس رنگین'' کو اردو میں منتقل کر کے ایک ناقابل قدر اور اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ہے۔اس کے حواشی اور اس کا مقدمہ تحقیقی اعتبار سے بہت گرانقدر ہے رام پور کے اخبار ''ناظم'' میں اسے قسط وار شائع کیا گیا تھا۔سعادت یار خان رنگین کے دیوان ریختی کے آخر میں خواتین کے مخصوص محاورات اور ان کے استعمال کے مخصوص الفاظ کی فہرست ہے۔رضا لائبریری میں خان آرزو کی ''نوادرالالفاظ'' اور ''دیوان ریختی'' کی تشریحات کا مقابلہ کر کے اختلافات نسخ بیان کئے ہیں۔اور اس تصنیف کو مفید حواشی سے آراستہ کیا ہے۔''محاورات'' بیگمات'' کی ادبی و تاریخی اور لسانی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

عرشی کے علم کا دائرہ بہت وسیع تھا انہوں نے تاریخ سے بھی دلچسپی لی اور اس کے پس منظر میں ادب کی نشو نما کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔عرشی نے ''شاہ عالم نامہ'' وقائع شاہی'' تاج التواریخ'' مرأۃ الاشیاء'' سیر المتأخرین'' جام جہاں نما'' مفتاح التواریخ اور'' تاریخ تیمور'' کے علاوہ بعض اور مآخذ وں کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہ عالم کی شخصیت، ان کے دور حکومت، شعری ذوق اور ان کی سخن سنجی اور سخن

فہمی سے مفصل بحث کی ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیموری خاندان کے حکمراں کتنے علم دوست، ہنرمند اور ادب نواز تھے۔''نوادر اشاہی'' ۱۹۴۴ میں شائع ہوئی۔اس میں شاہ ثانی کے اردو فارسی ہندی اور پنجابی کلام کو جمع کرایا گیا ہے۔جو ایک نہایت دقت طلب تحقیقی کام تھا۔اس میں تحقیق سے کما حقہ آگہی ضروری تھی ورنہ گہر ریزوں کے ساتھ حذف بھی شامل ہو جاتے اور کتاب ملحقات کا مجموعہ ہو کر رہ جاتی۔اس بادشاہ کے کلام سے عرشی نے ہمیں پہلی بار روشناس کروایا ہے یہ ان کا ایک بڑا شاندار علمی وادبی کارنامہ ہے۔بالآخر علم وعرفاں کا یہ متلاشی ۱۹۹۱ میں آسودۂ خوان ابدی ہوا۔

مالک رام

مالک رام کا شمار اردو کے تحقیق کے ''چارستونوں'' میں ہوتا ہے۔انہوں نے تحقیق کی روایت کو استحکام عطا کیا۔ ماہر غالبیات، محقق، خاکہ نگار، اور اسلامیات کی آگہی سے بہرور مصنف کی حیثیت سے مالک رام کی علمی اور ادبی کاوشوں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ مالک رام بویجا یعنی اوڑہ کھتری تھے اور انگریزی خط و کتابت میں وہ اپنا نام مالک رام ''بویجا'' تحریر کرتے تھے۔ان کے والد لالہ سوداگرمل متوفی ۱۹۰۷ انگریزوں کے عہد میں فوج میں ملازم تھے۔ مالک رام ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ کو پھالیہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے تھے اور صرف بارہ دن کے تھے کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ابتدائی تعلیم گورمکھی رسم الخط کے ذریعہ سے مقامی گردوارہ میں حاصل کی۔

۱۹۱۲ میں ڈسٹرکٹ بورڈ منڈل اسکول میں داخلہ لیا اور یہیں سے ۱۹۲۰ میں مڈل امتحان کامیاب کیا اس کے بعد جوبلی ہائی اسکول وزیرآباد میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۴ میں دسویں جماعت (H.S.L.C) کی سند حاصل کی۔ ۱۹۳۶ میں ایم۔اے (تاریخ) میں کامیابی حاصل کی۔اس کے بعد شبینہ کالج سے ایل۔ایل۔بی امتحان پاس کیا۔ ۱۸ر مئی ۱۹۳۱ میں ودیاوتی رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے جن سے تین بیٹیاں اوشا، اوشا، ارونا اور بشتی اور دو فرزند آفتاب اور سلمان پیدا ہوئے۔

ملازمت کا آغاز صحافت سے کیا اور ''آریہ گزٹ'' لاہور (۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵) ''نیرنگ خیال'' لاہور اور ''بھارت ماتا'' لاہور میں کام کیا۔ ۱۹۳۹ میں حکومت ہند نے ٹریڈ کمشنر کے دفتر اسکندریہ (مصر) میں سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں آزاد ہندوستان میں انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو مالک

رام کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ ان کی آخری ملازمت وزارت دفاع حکومت ہند کی تھی جس سے وہ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۵ تک وابستہ رہے اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ اس زمانے میں ذاکر حسین صاحب ساہتیہ اکیڈمی کے صدر تھے انہوں نے اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ۱۹۶۵ آپ کو طلب کیا۔ مالک رام یہاں ۱۹۶۷ تک کام کرتے رہے آپ نے یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف کو جدید طریقے سے مرتب کر کے شائع کیا اور خوب خوب داد حاصل کی۔ ''ترجمان القرآن''، ''غبار خاطر''، خطبات آزاد'' کی طباعت کا کام بھی مکمل کیا۔ ۱۹۶۷ میں ایک تجارتی فرم کی آسامی قبول کر لی لیکن ساہتیہ اکیڈمی سے وابستہ رہے۔ مالک رام جب تک زندہ رہے علم و عرفان کی ترویج و اشاعت میں برابر لگے رہے۔ اردو ادب کو آپ سے کافی فائدہ پہنچا نئی نسل کے لیے مالک رام ایک نمونہ ہیں آپ نے ۱۹۹۳ میں انتقال کیا۔ آپ کی مشہور و معروف کتابیں حسب ذیل ہیں۔ (۷)

(۱) ذکر غالب (غالب کی سوانح عمری) ۱۹۳۸

(۲) عورت اور اسلامی تعلیم/ ۱۹۵۱

(۳) تلامذہ غالب/ ۱۹۵۸

(۴) تذکرہ معاصرین/ ۱۹۷۶

(۵) وہ صورتیں الٰہی/ ۱۹۷۴

(۶) گفتار غالب/ ۱۹۸۵

(۷) قدیم دلی کالج/ ۱۹۷۵

(۸) فسانۂ غالب/ ۱۹۷۷

(۹) اسلامیات، حالی، (انگریزی) ۱۹۸۲

(۱۰) رموز غالب/ ۱۹۸۵

(۱۱) مرزا غالب (انگریزی) ۱۹۶۸

(۱۲) تذکرہ ماہ و سال/ ۲۰۱۱

(۱۴) گفتار غالب/ ۱۹۸۵

(۱۵)ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال/۱۹۷۱

اس کے علاوہ مالک رام کی مرتب کردہ کتابیں بھی ہیں جس کی اہمیت وافادیت مسلم ہے اور جن سے طلباء واسکارلوں کو کافی فائدہ پہنچتا ہے۔

(۱) سبد چین (فراسی)/۱۹۳۸

(۲) دیوان اردو (غالب)/۱۹۵۷

(۳) خطوط غالب/۱۹۶۲

(۴) گل رعنا

(۵) نذر عرشی/۱۹۶۵

(۶) نذر ذاکر ۱۹۵۷

(۷) نذر حمید/۱۹۸۱

(۸) خطبات آزاد ۱۹۷۴

(۹) نذر زیدی (اردو انگریزی) ۱۹۸۰

(۱۰) غبار خاطر ۱۹۶۷

(۱۱) تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد/۱۹۶۷

(۱۲) نذر عابد/ (اردو انگریزی) ۱۹۶۵

(۱۳) خطوط الب (منشی مہیش پرشاد) ۱۹۶۲ (۸)

مالک رام کے کم وبیش دوسو مقالات مختلف موقر جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے کیا گیا ہے۔ یوپی اردو اکیڈمی یوپی حکومت، میر اکیڈمی، بہار اردو اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی اور اردو اکیڈمی دہلی، ساہتیہ کلا پریشد دہلی، حکومت یوپی (گل رعنا پر) نے انہیں انعامات عطا کئے اور قومی یکجہتی کے لیے ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین عالمی انعام دیا گیا۔ وہ انگلستان کی ایشیاٹک سوسائٹی اور جامعہ اردو کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ ۱۹۷۷ء میں جامعہ اردو کے پرو چانسلر مقرر ہوئے۔ وہ غالب اکیڈمی کے ممبر اور اردو انجمن کے ممبر اور انجمن ترقی اردو کے صدر بھی

تھے۔۱۹۸۳ء میں فخر غالب ایوارڈ، غالب میموریل سوسائٹی دہلی سے حاصل کیا اور ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کورٹ کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔اس کے علاوہ بھی متعدد اداروں/اکیڈمیوں کے بھی اعزازی ممبر بنائے گئے۔

تحقیق میں مالک رام کی دلچسپی کا خاص موضوع غالبیات ہے اور غالبیات کے محقق کی فہرست میں مالک رام کا نام نمایاں مقام رکھتا ہے۔غلام رسول مہر، محمد اکرام، امتیاز علی عرشی، مہیش پرشاد اور قاضی عبدالودود کے علاوہ مالک رام نے غالبیات میں گرانقدر اضافے کئے ہیں۔''ذکر غالب''، فسانۂ غالب ''، اور تلامذۂ غالب میں مالک رام کی تحقیق کا وزن و وقار دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے غالب کی سوانح کو محققانہ شان کے ساتھ مرتب کر کے ایک اور اہم خدمت انجام دی ہے۔اس سلسلے میں سبد چین، دستنبو، کلیات نظم غالب (فارسی)، گل رعنا، خطوط غالب اور یادگار غالب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔مالک رام نے''عیار غالب'' کی ادارت کے وسیلے سے بھی اپنے مضامین کے ذریعے سے ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔

یہ عجب بات ہے کہ مالک رام کی غالب سے محبت کا آغاز ان پر نقد و تنقید سے شروع ہوا تھا۔اور مالک رام نے''نگار'' میں غالب اور ذوق کا موازنہ کرتے ہوئے غالب پر ذوق کو ترجیح دی تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے غالب سے وابستگی کا حق ادا کر دیا اور غالبیات کو اپنی تحقیق کا مرکز قرار دیا۔میرا اپنا خیال ہے کہ''ذکر غالب'' کے بغیر غالبیات کا ذکر مکمل نہیں ہوسکتا۔اس کتاب کو تین حصوں مین تقسیم کیا گیا ہے۔غالب کی سوانح محققانہ ذمہ داری کے ساتھ مرتب کی گئی تھی۔یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں مکمل کی گئی تھے۔اس کے دوسرے حصہ میں اردو اور فارسی تصانیف کا جامع تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور تیسرے باب کا عنوان عادات واخلاق ہے۔اردو تحقیق میں مالک رام کی حیثیت واہمیت ادباءوشعراء کے مابین مسلم ہے جو ناقابل فراموش ہے۔

مالک رام کی اس کتاب''اردو تحقیق اور مالک رام'' پر قاضی عبدالودود نے جو اعتراضات کئے ہیں ان میں بعض کا شمار اردو تحقیق کے لطائف میں ہوتا ہے اور وہ اتنے قابل قبول نہیں جتنے کہ وہ اہم تحقیقی معلومات اور انکشافات ہیں جو مالک رام نے پیش کر دئے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ''ذکر غالب'' کی ایک

مستند سوانح حیات تصور کی جاتی ہے۔ مالک رام کے بیانات قابل اعتماد اور مستند ہیں نیز ان کی دوسری شہادتوں سے تصدیق بھی ہوتی ہے۔ ''فسانۂ غالب'' (۱۹۷۷ء) غالب پر مالک رام کے پندرہ منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان سے مالک رام کی محققانہ نصیرت و کاوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''توقیت غالب'' ایک نہایت عالمانہ مضمون ہے اور اس میں غالب کے واقعات زندگی اور ادبی اکتسابات کی مستند تاریخیں فراہم کی گئی ہیں۔ کسی ادیب پر اعتراض کرنا بہت آسان ہے لیکن اسے معلومات کی فراہمی میں جو ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں ان پر توجہ نہیں کی جاتی۔ مالک رام نے ایک ایک سنہ کے تعین میں کئی مستند حوالوں سے مدد لی ہے۔ ایک مضمون میں غالب کے سنہ ولادت سے بحث کی گئی ہے۔

غالب کے کلیات نظم فارسی میں ان کا ایک زائچہ دیا گیا جس میں ہجری تاریخ موجود ہے لیکن عیسوی سنہ سے مطابقت میں شبہ ہوتا تھا۔ چنانچہ امتیاز علی عرشی نے ایک طرف اشارہ کیا تھا لیکن مالک رام نے مستحکم استدلال سے اسے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ ایک مضمون غالب کے بھائی مرزا یوسف سے متعلق ہے اس کا تمام مواد مالک رام نے نیشنل آرکائیوز سے حاصل کیا ہے۔ نواب شمس الدین احمد خان کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کا مآخذ سرکاری مراسلات سے بھی فراہم کئے گئے ہیں۔'' کارنامۂ سروری'' اور ''مرقع انوار'' جیسی تصانیف سے بھی ثبوت فراہم کئے گئے ہیں۔ ''فسانۂ غالب'' کا ایک مشہور اور دلچسپ مضمون عبد الصمد سے متعلق ہے۔ قاضی عبد الودود نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ عبد الصمد دراصل ایک خیالی پیکر ہے جس کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ غالب کو بعض لوگ بے استناد کہہ کر طعنہ دیتے تھے اس لیے اشخاص کی زبان بندی کے لیے غالب نے استاد کی حیثیت سے عبد الصمد کو تخلیق کیا لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ مالک رام قاضی عبد الودود کا جواب اس طرح نہ دے سکے کہ عبد الصمد کے ایک زندہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آتا۔ (۹)

''غالب کی مہریں'' میں ان کے چھ مہروں کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے غالب سے منسوب مضمون'' دوسرا سکہ'' میں مالک رام نے خواجہ احمد فاروقی اور خلیق انجم کے بیانات کی مدلل تردید کی ہے۔ ''تلازمذۂ غالب'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے غالب کے شاگردوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ ''تلامذۂ غالب'' میں ان کی نایاب تصاویر بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ مالک رام نے اپنے بیانات کو مستند حوالوں سے تقویت

پہنچائی ہے۔ وہ باقر علی کامل، نظام رام پوری، بنواری لال شعلہ اور سید محمد آزاد کو غالب کا شاگرد تصور نہیں کرتے۔ اس اہم مسئلہ پر دوسرے معاصر محققین (نثار احمد فاروقی، مغیث الدین فریدی وغیرہ) نے اپنی اپنی آراء پیش فرمائی ہیں۔

''سبد چین'' غالب کے فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ اسے غالب نے ۱۸۶۳ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب ناپید ہوگئی تھی۔ مالک رام نے اسے ۱۹۳۸ء میں شائع کر دیا لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ''سبد چین'' کے علاوہ بھی غالب کا فارسی کلام دستیاب ہے۔ غالب کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر مالک رام نے دستنبو شائع کی تھی۔ لیکن اس پر مقدمہ نہیں تھا۔ اس لیے مالک رام نے انکساری سے کام لیتے ہوئے اپنا نام نہیں لکھا حالانکہ متن کی تصحیح میں انہیں بڑی محنت کرنی پڑی تھی یہاں دیوان غالب کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو ایک غزل پر بڑی تنقید کی گئی جس کا مقطع تھا۔

پیرانہ سالی غالب میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

گیان چند جین نے اپنے مضمون ''غالب اور بھوپال'' میں رقمطراز ہیں کہ یہ غزل سب سے پہلے ماڈل اسکول بھوپال کے رسالہ ''گوہر تعلیم'' (اپریل ۱۹۳۷ء) میں شائع ہوئی تھی جس کا مقصد اپریل فول بنانا تھا۔ اسے رسالہ ''ہمایوں'' نے بھی شائع کیا تھا اور خواجہ حسن نظامی نے بھی ''منادی'' میں طبع کیا تھا۔ اس طرح اپریل فول کے چکر نے ایک بڑی غلط فہمی پھیلا دی تھی۔

دوسرے ایڈیشن میں مالک رام نے اس غزل کو شامل نہیں کیا۔ رشید حسن خان نے اس پر معترضانہ تبصرہ لکھا تھا۔ جو ''تحریک غالب نمبر'' ۱۹۶۹ میں شامل ہے۔ دیوان غالب کے احمدی ایڈیشن میں اغلاط نے جگہ پائی تھی۔ غالب نے اس کی تصحیح کے کے ایک ایڈیشن شائع کیا تھا۔ غالب کی درست کردہ کاپی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود تھی۔ جس میں کاتب تمام اصلاحات کو بنایا نہیں تھا۔ مالک رام نے اپنے نسخے کا مقابلہ نصیر الدین ہاشمی سے کرایا تھا۔ لیکن وہ دکنیات کے ماہر تھے غالبیات کے نہیں، اور کوشش کے باوجود تصحیح کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ اس پر بعض محققین نے اعتراضات کئے ہیں۔ گیان چند جین کے بیان سے سب اتفاق نہیں کرتے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایڈیشن عام قاری کے لیے چھاپا

تھا محققین کے لیے نہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عام قاری کے لیے جو متن تیار کیا جائے اس میں غلطیاں راہ پا سکتی ہیں۔(۱۰)

بہر حال کلکتہ میں غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ''گل رعنا'' کے نام سے شائع کیا تھا۔لیکن وہ گم ہو گیا تھا۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد مالک رام کو حیدر آباد میں اس کا مکمل نسخہ دستیاب ہوا۔اور انہوں نے ''نگار'' میں اس کے فارسی حصے سے اردو والوں کو روشناس کر دیا اور ۱۹۶۸ء میں ''نذر ذاکر'' میں اردو کے حصے کو پیش کیا تھا۔گل رعنا کے دو نسخے ۱۹۶۹ء میں دریافت ہوئے جن میں ایک خود غالب کا تحریر کردہ تھا۔گل رعنا مالک رام بڑی دقت کے ساتھ مرتب کیا اور ابتداء میں ۳۵ رصفحات کا مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔''خطوط غالب'' ہندوستانی اکیڈمی سے شائع ہوئی۔جیسے مہیش پرشاد نے اکٹھا کیا اور عبدالستار صدیقی نے نظر ثانی کے بعد شائع کیا تھا۔ جب ہندوستانی اکیڈمی انجمن کے حق میں دستبردار ہو گئی تو اس کتاب کو دوبارہ مرتب کرنے کا کام مالک رام کے سپرد ہوا چنانچہ جلد اول ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آئی ۔ یہ کتاب شائع ہوئی تو اس پر صرف مالک رام کا نام لکھا تھا اور مہیش پرشاد کا نام حذف کر دیا تھا۔جس معترضین نے مالک رام کو ہدف تنقید بنانا شروع کیا کہ مالک رام نے مہیش پرشاد کے اثاثے کو اپنا سرمایہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس بات میں مالک رام کا کوئی قصور نہیں تھا۔مالک رام سہ ماہی تحقیق رسالہ ''تحریر'' کے ایڈیٹر تھے۔فروری ۱۹۶۹ء میں انہوں نے غالب نمبر مرتب کر کے شائع کیا جسے بعد میں کتابی شکل دی گئی اس میں مالک رام کے دو اہم تحقیقی مضامین ''توقیت غالب'' اور غالب شناسی جب اور اب'' شامل ہیں۔

اس کے علاوہ مالک رام نے غالب پر چیدہ چیدہ مضامین بھی سپرد قلم کئے ہیں ۔''عورت اور اسلامی تعلیم'' اور اسلامیات جیسی تصانیف اندازہ ہوتا ہے کہ مالک رام کی اسلامیات سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کا انہوں نے کتنا گہرا مطالعہ کیا ہوگا نیز اسلامی تعلیمات اس کے ابدی اصول و پیغامات سے بھی متأثر دکھائی دیتے ہیں۔غالب صدی تقاریب میں مالک رام نے انگریزی کے قارئین سے غالب کو روشناس کرایا۔''مرزا غالب'' نیشنل بک ٹرسٹ سے انگریزی میں شائع ہوئی اس کتاب کا ترجمہ ہندی، پنجابی، گجراتی ،مراٹھی ، بنگالی ،اور اڑیا میں ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ مالک

رام نے حالی پر۱۹۸۲ میں انگریزی زبان میں کتاب شائع کی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ مالک رام کی خدمات نصف صدی پر محیط ہے اردو ادب کی ترویج واشاعت کے تعلق سے ان کی گرانقدر خدمات نا قابل فراموش ہیں اور وہ اپنی گراں قدر خدمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جائینگے موجودہ نسل کے لیے مالک رام کی شخصیت ایک بہترین نمونہ ہے وران کے کارنامے قابل صدستائش ہی نہیں لائق عمل بھی ہیں۔اس مایۂ ناز ادیب ومفکر کا انتقال ۱۶/اپریل ۱۹۹۳ میں ہوا۔(۱۱)

گیان چند جین

تحقیق بڑی عرق ریزی اور جگر کاوی کا کام ہے اس میں ذرا سی بھی چوک رسوائی کا باعث ہوتی ہے۔ گیان چند جین ایک طویل عرصہ سے اسی دشت کی سیاحی میں مصروف عمل ہیں ان کے یہاں تحقیق شرط زندگی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو تحقیقی کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ تسامحات کی نشاندہی، تحقیقی کارناموں کا احتساب، نتائج کا استنباط، دلائل کے استناد، شہادتوں کی جانچ پڑتال اور صحت کے متعلق رائے قائم کرنا بڑی سوجھ بوجھ اور دقت نظر کے مقتضی ہیں۔ ادبی تحقیق بڑے حزم اور احتیاط کا کام ہے۔ گیان چند جین اس سمندر کے شناور اور غواص ہیں اور انہوں نے اردو ادب کا دامن انمول موتیوں سے بھر دیا ہے جس کے لیے اہل اردو ان کے ہمیشہ ممنون رہینگے۔ گیان چند جین ذات کے جین اور ویش یعنی بنئے ہیں ان کے والد کا نام لالہ بحال سنگھ تھا۔ گیان چند جین کا مولد سیوہارہ بجنور یوپی ہے اور ۱۹ر ستمبر ۱۹۲۳ ان کی تاریخ پیدائش ہے۔

گیان چند جین کے بھائی پرکاش مونس اردو کے بڑے مشہور ادیب ہیں۔ ان کی تصنیف ''اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر'' کی علمی و ادبی حلقے میں کافی پزیرائی ہوئی ہے۔ گیان چند جین نے ابتدائی تعلیم سیوہار میں حاصل کی اور آٹھویں جمات کا امتحان مسلم قدر اللہ اسکول سے کامیاب کیا۔ پارکر ہائی اسکول مراداآباد سے ۱۹۳۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد سے ۱۹۴۱ میں ''انٹر'' کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یہیں سے ۱۹۴۳ میں بی۔اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ایم، اے کی تعلیم حاصل کی۔ ایم۔اے میں اختیاری مضمون اردو

تھا ایم اے کا امتحان ۱۹۴۵ میں درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔ اور امتیازی نشانات کی وجہ سے تمام طلباء میں سبقت حاصل کی۔ ڈی فل کے لیے۔ گیان چند جین کا مقالہ ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی میں داخل کیا گیا تھا اور اس اس طرح ۱۹۴۸ میں انہیں ڈگری عطا کی گئی۔

اردو کے علاوہ سوشیالوجی میں بھی ۱۹۵۴ میں ایم۔ اے کیا اور سکنڈ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ آگرہ میں ڈی لٹ کی ڈگری لی اور لسانیات کے لیے ساگر (مدھیہ پردیش) میں منعقد ہونے والے لسانیات کے گرمائی اسکول سے ۱۹۶۱ میں سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا اور دوسرے سال یعنی ۱۹۶۲ میں دھارواڑ کے اسکول میں بھی شرکت کی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۵۰ میں حمیدیہ کالج بھوپال میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ اگست ۱۹۵۶ میں صدر شعبۂ اردو حمیدیہ لالج مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ میں جموں یونیورسٹی چلے گئے اور یہاں ۱۹۷۶ تک برسر کار رہے۔ جب ۷۷/اکتوبر میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا تو وہ جموں سے الہ آباد منتقل ہو گئے اور وہاں علم وعرفاں کی آبیاری میں سرگرداں ہو گئے۔ ۲۶, مارچ ۱۹۷۹ میں سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پروفیسر مقرر ہوئے اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش بھی ہوئے ان کی متنوع موضوعات پر تصانیف بہت معرکۃ الآراء ہیں می ان میں چند مشہور حسب ذیل ہیں۔

(۱) اردو نثر کی داستانیں ۱۹۵۴/

(۲) اردو مثنوی شمالی ہند میں ۱۹۶۹/

(۳) تفسیر غالب ۱۹۷۲/

(۴) تحریریں ۱۹۶۴/

(۵) لسانی مطالعے ۱۹۷۳/

(۶) رموز غالب ۱۹۷۶/

(۷) حقائق ۱۹۷۸/

(۸) ذکر وفکر ۱۹۸۰/

(۹) تحقیق کا فن ۱۹۹۰/

(۱۰) قاضی عبدالودود بحثیت محقق

گیان چند جین کی کتاب ''تحقیق کا فن'' سے ان کے تحقیقی نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ در اصل وہ ایک بلند پایہ محقق اور تخلیق کار کی ادبی بصیرت وذکاوت کے حامل ہیں۔ اردو میں تحقیق اور اس کے مسائل پر بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے بھی گیان چند جین کی کتاب ''تحقیق کا فن'' کی اہمیت اور بڑھ گئی اسے مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں تحقیق کے موضوع، خاکہ مواد کی فراہمی، مواد کی پرکھ، حزم واحتیاط اور تسوید جیسے موضوعات سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب محقق کی رہبری اور رہ نمائی کے لیے ایک مفید دستاویز ہے۔ گیان چند جین نے تحقیق سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اور مثالوں سے وضاحت کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب طلباء واساتذہ کے لیے یکساں استفادہ کے لیے اہم تصور کی جاتی ہے۔ آج جب کی تحقیق وتدوین کا معیار بلند ہوا ہے تو نئے نئے مباحث کی تلاش بھی شروع ہو گئی ہے اور اس تعلق سے یہ کتاب اہم ومفید ہے۔ گیان چند جین کی ایک کتاب ''کھوج'' ہے اس کتاب میں ایک بہت ہی اہم مضمون ''اخلاقیات تحقیق ہے'' جس میں تحقیق کے مختلف موضوعات پر بالواسطہ یا بلا واسطہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیان چند جین تحقیق کو ایک ذمہ دارانہ فن تصور کرتے ہیں اورر اس میں تساحمات اور فروگزاشت کو راہ دینے کے روادار نہیں ''کھوج'' کے مضمون '' اخلاقیات تحقیق'' کے مطالعے سے ان کے تحقیقی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ مضمون محققین کے لیے دعوت فکر ہے اور اس میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ دوسروں کی پیش کردہ معلومات کو بغیر حوالہ دئے پیش نہیں کرنا چاہئے یہ ایک ادبی بددیانتی بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے جذباتیت تحقیق کو کمزور بنادیتی ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے غیر جانبداری اور مختلف تعصّبات سے بلند ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

''حقائق'' گیان چند جین کی ایک وقیع کتاب ہے اور اس سے ان کے تحقیقی انداز کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ ایسے محققین سے زیادہ خوش نہیں ہیں جنہوں نے معترضانہ تحقیق کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ وہ اس خیال کے حامل ہیں کہ تحقیق کا کام محض خردہ گیری والزام تراشی اور بت شکنی نہیں اس کا تعمیری پہلو بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ''حقائق'' میں اپنے مضمون ''بت شکن'' محقق میں گیان چند جین نے قاضی

عبدالودود پر یہ تنقید کی ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں چبھتے ہوئے فقرے استعمال کئے ہیں۔ دراصل گیان چند جین ایک معیار پرست محقق ہیں ان کی محققانہ عظمت کا اعتراف ضروری ہے۔''ذکر وفکر'' گیان چند جین کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔''ذکر'' میں اعجاز حسین، احتشام حسین، سنتی کمار چٹرجی، کرشن چندر اور مسعود حسن رضوی کے بارے میں اپنے تأثرات کا ہلکے پھلکے انداز میں اظہار کیا گیا ہے۔ تیسرا عنوان ''تحقیق'' ہے اس میں بعض مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور تحقیقی مساعی پر بھی اچھی بحث کی گئی ہے۔

لسانیات سے گیان چند جین کو خاص شغف ہے اور اس سلسلے میں ''عام لسانیات'' اور لسانی مطالعے'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ محمود شیرانی، مسعود حسین خان، اور ڈاکٹر زور کی طرح گیان چند جین بھی اردو کے آغاز سے متعلق اپنے مخصوص نظریے کے حامل ہیں ان کا خیال ہے کہ اردو کھڑی کی بولی ہے۔ اس کے علاوہ گیان چند جین نے اردو کے لسانی خدوخال اور دوسرے مسائل سے بھی بحث کی ہے لیکن لسانیات سے ان کی دلچسپی ان کی پہلی محبت نہیں۔ وہ ماہر لسانیات ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر محقق ہیں گیان چند جین کا تحقیقی کارنامہ ''تاریخ ادب اردو'' (بہ اشتراک سیدہ جعفر) ہے اس کتاب کی جلد اول میں انہوں نے ''اردو زبان کا آغاز وارتقاء) کے زیر عنوان اپنے لسانی مفروضے کا اعادہ کیا ہے۔ اس کھڑی بولی، ہندوستانی اور ہندی کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اردو زبان کے آغاز سے مختلف نظریات پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے یہ بات لسانیات سے ان کی دلچسپی کا عظیم مظہر ہے۔

جلد اول کا تیسرا باب ''شمالی ہند میں اردو شاعری ۱۶۰۰ تک'' کے تحت مسعود سعد سلمان اور فرید الدین گنج شکر اور یحیی منیری جیسے قدیم شعرائے کرام کی ادبی خدمات اور احوال وکوائف کا عالمانہ اور محققانہ انداز میں جائزہ لیا گیا ہے اور مستند حوالوں سے اپنے بیان کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اس میں میں ۴۱ رشعرائے کرام شامل ہیں۔ جلد دوئم کے پانچویں باب گجرات میں اردو شاعری ۱۶۰۰ تک اور چھٹا باب اردو نثر ۱۶۰۰ تک ہے۔ یہ دونوں ابواب گیان چند جین کے وسیع مطالعہ اور تحقیقی ذوق کی عکاسی کرتے ہیں اور ان سے مصنف کی علمیت، تحقیقی ذوق، کام کے تئیں محنت ولگن کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ پانچویں جلد میں گیارہواں باب ''شمالی ہند میں اردو شاعری سترہویں صدی میں'' ہے اور بارہواں باب قدیم اردو کی اہم

ادبی اصناف وموضوعات سے متعلق ہے۔ یہ دونوں باب بھی بڑی محنت کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں۔ ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ تک'' کا آخری باب ''قدیم اردو میں ہندی اور فارسی آویزش'' تھا جسے ضمیمہ کی حیثیت سے بعد میں شائع کیا گیا ہے۔

اس باب میں قدیم اردو میں ہندی اور فارسی کی آویزش کا ذکر کرتے ہوئے ان محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے جو اردو ادب پر اثر انداز ہوئے تھے اور جن سے اردو نے اپنا رنگ وآہنگ پایا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فارسی روایات کی پذیرائی نے اردو کی شیرنی اور اس کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ گیان چند جین اردو کے چھٹے نمبر کے (اسکالر) پی۔ایچ۔ڈی ہیں انہوں نے اپنے تحقیق کا موضوع ''اردو کی نثری داستانیں'' منتخب کیا تھا۔ آج ہمارے کتب خانوں میں وضاحتی فہرستیں، رسائل۔حولوں کی کتابوں اور مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی تصانیف مل جاتی ہیں، جن سے تحقیق میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں صورت حال اس کے بالکل مختلف تھی۔ گیان چند جین کو تحقیق میں اپنی راہ آپ تراشنی پڑی۔ تحقیق میں گیان چند جین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بڑے ناموں سے محقق کو مرعوب نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر تحقیق کے دوران کسی کم معروف محقق کو ایسی معلومات دستیاب ہوئی ہیں جن سے کسی بلند پایہ محقق کے مفروضات اور تحقیقی نتائج رد ہوتے ہیں تو محقق کو چاہیئے کہ وہ ان کا اظہار کرے۔

''پرکھ اور پہچان'' (۱۹۹۰) ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ پرکھ کے زیر عنوان گیارہ مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اور پہچان میں انیس مختلف مضامین جمع کر دئے ہیں۔ ان مضامین میں کچھ تنقیدی نوعیت کے حامل ہیں لیکن ان سے بھی گیان چند جین کی محققانہ حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ ''اقبال کا منسوخ اردو کلام''، ''اقبال کے ایک ہم نشیں'' ''جلیل مانک پوری'' ''مسائل اردو زبان'' ''خانہ جنگی'' ''ایک سیاسی مثنوی'' اور ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری میں تحقیق وتنقید شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ تحقیق کے لیے طبعی مناسبت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کلیم الدین احمد کی مثال دی جاتی ہے جنہوں نے شورش اور عشق کے تذکروں کو خلط ملط کر کے شائع کیا ہے۔ اس طرح کی بات وہی کہہ سکتا ہے جس کا علم وسیع، مطالعہ اہم، تحقیق وتنقید میں اچھی گرفت ہو ورنہ آج کل جس طرح کی تحقیق منظر عام پر آ رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہیں۔

اپنی کتاب ''تجزئے'' کے ایک مضمون ''تحقیق کے مسائل'' میں گیان چند جین نے محقق کے لیے ایک خاص قسم کے مزاج اور ایک خاص قسم کے علمی پس منظر اور تربیت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ادب میں تحقیق اور تحقیق اور تنقید کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''میں تحقیق کی افضلیت کا قائل ہوں'' گیان چند جین ایک صداقت پسند انسان ہیں انہوں نے نہایت اعلی ظرفی اور کھلے ذہن سے ساتھ اپنی بعض تحقیقی کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے۔اس طرح کے اعتراضات وہی کرسکتا ہے جسے اپنی ذات اور اپنے ادبی اکتسابات پر اعتماد ہو یہ بڑے حوصلے اور ظرف کی اعلی مثال ہے اس طرح کے لوگ اب کم نظر آتے ہیں۔

تنویراحمد علوی

آزادی کے بعد جن ادیبوں نے اردو میں اہم اضافے کئے ہیں ان میں تنویر احمد علوی کا نام شامل ہے۔ وہ ۱۶/جولائی ۱۹۲۳ کو پیدا ہوئے۔ ضلع مظفرنگران کا مولد ہے۔ تنویر احمد علوی کے دادا الٰہی بخش تھے۔ تنویر احمد علوی کے والد صدیق احمد علوی اپنے وقت کے حاذق حکیم، حافظ قرآن اور مذہب پرست شخص تھے۔ انہوں نے مئی ۱۹۲۸ میں انتقال کیا۔ تنویر احمد علوی کے نانا حافظ عبدالعزیز شکار کے شوقین تھے۔ اسی لیے ''شکاری'' کہلاتے تھے۔ تنویر احمد علوی کی والدہ کا نام صغرا بیگم تھا۔ تنویر احمد علوی نے ابتداء میں فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ میرٹھ میں تعلیم حاصل کی۔ بھوپیندرا طبیہ کالج پٹیالہ میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے اور ایم۔اے امتحان کی تکمیل کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ میں پی۔ایچ ڈی اور ۱۹۶۷ میں ڈی لٹ کی ڈگری لی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پہلی بار ڈی لٹ کی ڈگری تنویر احمد علوی عطا کی تھی یقیناً یہ ہم سب کے لیے بڑی اہمیت اور فخر کی بات ہے۔

تنویر احمد علوی نے ملازمت کا آغاز ضلع میرٹھ میں ٹیچر کی حیثیت سے شروع کیا۔ ۱۹۴۹ میں نثر نگاری کا آغاز کیا اور ''الجمعیۃ'' میں لکھنے لگے۔ اس کے علاوہ سہارن پور کے ''بیباک'' میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۵۰ میں اپنی چچا زاد بہن محمودہ سے شادی کی۔ ۱۹۷۲ سے ۱۹۷۴ تک ہندوستان کی اہم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر شعبہ اردو رہے۔ تنویر احمد علوی بہت مشہور مصنف و مؤلف ہیں اور ادبی و علمی حلقے میں کافی اہمیت کے حامل ہیں تنویر احمد علوی کی مشہور تصانیف اس طرح ہیں

کلیات شاہ نصیر/ ۱۹۶۷

رسالہ تذکرات/ ۱۹۶۷

تاریخ محمودی (کتاب الشہادت) ۱۹۷۰

ذوق سوانح اور انتقاد/ ۱۹۶۳

کلیات ذوق/ ۱۹۸۰

صحیفہ ابرار/ (ترجمہ خیر البیان، بحر الابرار و ملفوظات رزاقیہ) ۱۹۷۳

اصول تحقیق اور ترتیب متن/ ۲۰۰۹

نوبت پنج روزہ یعنی وداع ظفر/ ۱۹۸۹

انتخاب ذوق/ ۱۹۷۹

صحائف معرفت/ ۱۹۸۹

مکتوبات عالیہ/ ۱۹۸۹

جنوبی مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی روشہ تاریخ و روایت کی روشنی میں/ ۲۰۰۰

آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق ۱۹۹۰۔ طبع ثانی ۲۰۰۱

سفر ناموں میں دہلی ۱۹۹۴

انتخاب ذوق ۱۹۷۲

اوراق معانی (غالب کے فارسی خطوط مشمولہ پنج آہنگ اردو ترجمہ) ۱۹۹۲

انتخاب دواوین/ ۱۹۸۷

نقش نیم رخ (ترجمہ نامہ ہائے فارسی غالب) ۲۰۰۲ (۱۲)

تنویر احمد علوی نے شاہ نصیر الدین کے حالات بڑی زندگی بڑی تحقیق کے بعد فراہم کئے تھے انھوں نے مستند حوالوں کی مدد سے شاہ نصیر کے صحیح حالات ترتیب دئے ہیں۔ انھوں نے نسخہ آصفیہ (حیدر آباد) رضا لائبریری (رام پور) کتب خانہ آصفیہ، سالار جنگ میوزیم (حیدر آباد) اور پٹیالہ کی لائبریری اور دیگر جگہوں سے فراہم ہونے والی معلومات کو جانچا اور پرکھا اور تحقیق کو اصولوں کو مد نظر رکھتے

ہوئے ان کے استناد سے بحث کی ہے اور باہم مقابلہ کر کے مستند معلومات فراہم کی ہیں۔

بعض محققین جن میں سخاوت مرزا کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے غلط فہمی کا شکار تھے۔تنویر احمد علوی نے تاریخی شواہد سے ان کی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔کلیات نصیر میں قدیم نسخے کو بنیادی نسخہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ بعد کے دور کے لکھے ہوئے نسخوں میں تبدیلی اور الحاق وتصرف کے امکانات بڑھ جاتے ہیں ۔تنویر احمد علوی نے انصار اللہ نظر کے تسامح کو بھی دور کیا ہے اور ان کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ ۱۲۱۵ء سے پہلے شاہ نصیر نے لکھنؤ کا سفر کیا تھا اور لکھتے ہیں کہ شاہ نصیر نے لکھنؤ کا سفر حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد ۱۲۲۵ھ میں کیا تھا۔(۹)

''ذوق سوانح اور انتقاد'' نویر احمد علوی کی تحقیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ذوق کا شجرہ نسب انھوں نے بڑی صحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔تنویر احمد علوی نے بتایا کہ بہادر شاہ ظفر کے دیوان میں ذوق کی وہ غزلیں شامل ہیں جو انہوں نے بادشاہ کو دی تھیں۔ یہ غزلیں انہوں نے ذوق کے قلمی ذخیرے اور دوسرے مآخذوں سے حاصل کر کے اپنے بیان کو تقویت پہنچائی ہے۔محمود شیرانی نے اس کی نشان دہی بھی کی تھی کہ ''دیوان ذوق'' میں محمد حسین آزاد کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ یہ مضمون رسالہ ''ہندوستانی'' الہ آباد جنوری ۱۹۷۶ء میں شامل تھا لیکن تنویر احمد علوی نے ایک طویل محنت اور جد و جہد کے بعد متعدد مستند حوالوں کی مدد سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ غزلیں محمد حسین آزاد کی نہیں ہیں بلکہ خود ذوق کا نتیجۂ فکر ہیں۔

اردو میں اصول تحقیق پر کتابیں لکھنے کی طرف بہت کم مصنفین نے توجہ کی ہے تنویر احمد علوی کی کتاب ''اصول تحقیق وترتیب متن'' اس کی عمدہ مثال ہے اس میں تحقیق کے مختلف مراحل اور مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔مواد سے لے کر تحشیہ، ترتیب، تدوین، صحت متن اور استناد کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اپنے موضوع کے اعتبار سے کتاب اردو میں ایک اچھا اور عمدہ اضافہ ہے اس کتاب میں تحقیق کے دوران ان بنیادی اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن سے آگہی محققین کے لیے ضروری ہے انہوں نے مآخذوں کو چار اساسی، ذیلی، ضمنی اور اصناف میں تقسیم کر کے ہر ایک کے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''کلیات ذوق'' کی ترتیب وتدوین بھی تحقیقی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہے اس میں ذوق کی غزلوں کے علاوہ ان کے قطعات، رباعیات، قصائد، اور مثنوی کے اشعار بھی جمع کر دئے گئے ہیں۔''اردو میں بارہ

ماسہ کی روایت'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے۔اس موضوع کا پہلی بار تنویر احمد علوی نے سنجیدگی، باقاعدگی اور عالمانہ انداز نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے انہوں نے ہندوستانی ادب میں ہندوی روایات سے بحث کرتے ہوئے اس کے مختلف مظاہرہ پر روشنی ڈالی ہے۔بارہ ماسہ لکھنے والے شعراء کی مساعی کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں اردو اکیڈمی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔افضل کی بکٹ کہانی کے علاوہ عزلت کے بارہ ماسہ اور دہشت کا بارہ ماسہ اور وہاب کے بارہ ماہ وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں ان کا متن پیش کیا ہے بارہ ماسہ پر اتنا مفصل اور مبسوط کام اردو میں اس سے قبل نہیں پیش کیا گیا تھا۔(۱۳)

''نوبت پنج روزہ یا وداع ظفر'' کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے اس میں تاریخی واقعات کو افسانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو بڑے ڈرامائی اور پر اثر ہیں ۔راشد الخیری کی کتاب کو تنویر احمد علوی نے دوبارہ مرتب کیا ہے راشد الخیری نے لال قلعے کے تہذیبی ماحول اور معاشرتی فضاء کا خوش اسلوبی کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔نشست و برخاست کے طور طریق شاہی دسترخوان اور انداز گفتگو وغیرہ کی بڑی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ مقدمے میں راشد الخیری کے خاندانی حالات ،ان کی تعلیم و تربیت اور تصانیف کا تنویر احمد علوی نے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔وداع ظفر فروری ۱۹۸۷ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

تنویر احمد علوی نے امام بخش صہبائی کے انتخاب دواوین سے بھی دلچسپی لی ہے یہ کتاب شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۸۷ میں شائع کی ہے۔تنویر احمد علوی نے عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد سے نسخہ حاصل کیا تھا۔ان میں بہت قدیم شعراء کا کلام شامل ہے''اوراق معانی'' غالب کے فارسی خطوط کا جو''پنج آہنگ'' میں شامل ہیں۔خطوط غالب سے نہ صرف اس عہد کے تہذیبی و معاشرتی منظرنامے پر روشنی پڑتی ہے بلکہ غالب کے بعض نجی حالات کا بھی ہمیں پتہ چلتا ہے۔یہ کتاب اردو اکیڈمی دہلی سے ۱۹۹۳ میں شائع ہوئی۔''آزادی کے بعد دہلی میں تحقیق'' کو بڑے سلیقے سے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ حصہ (الف) میں تحقیق سے متعلق مسائل ہیں اور حصہ (ب) میں مختلف تحقیق سے متعلق مسائل جمع کر دئے گئے ہیں ''انتخاب ذوق'' اور ''نگارشات'' اہم ہیں اور بڑی توجہ، اہم انہماک، لگن انتھک کوششوں کے ساتھ مرتب کی گئی ہیں۔ان کی نگارشات کا مطالعہ کرنے سے ان کے تبحر علمی، وسیع مطالعہ، مصادر و مراجع پر مضبوط گرفت، تحقیقی ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔(۱۴)

مسعود حسین خان

مسعود حسین خان ایک نامور ماہر لسانیات، اردو تحریک کے فعال قلم کار، معتبر محقق، شاعر اور تنقید میں ایک نئے اسلوب کے بانی ہیں۔ان کی سلجھی ہوئی اور شگفتہ تحریریں اور ان کی ہمہ جہت ابدی مساعی نے اردو ادب میں ان کا تشخص قائم کیا ہے۔بعض مآخزوں سے مسعود حسین خان کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں فراہم کی جا سکتی ہیں لیکن تحقیق کے مسئلہ اصول کے اعتبار سے خود شاعر یا مصنف کا بیان دوسروں کے محاکمات اور اخذ کردہ نتائج سے زیادہ مستند اور قابل قبول ہوتا ہے اس لیے مسعود حسین خان کی خودنوشت سوانح ''ورود مسعود'' سے ان کے حالات زندگی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۸ رجنوری ۱۹۱۹ بروز شنبہ صبح میں پیدا ہوئے تھے ان کی والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا ان کے والد مظفر حسین خان چھٹی پیڑی میں حسین خان کی نسل سے ہیں۔ جو قائم جنگ فرح آباد یو پی میں اپنی علمیت اور اوصاف حمیدہ کی وجہ سے مشہور تھے۔ابھی ان کی عمر دو سال دو مہینے ہی تھی کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور والد کے انتقال کے تین سال بعد والدہ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ چھ سال کی عمر میں محلے کے میونسپل اسکول میں داخل کر دئے گئے اور اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں ان کا داخلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جماعت دوم میں ہوا۔مسعود حسین خان نے ۱۹۲۷ سے ۱۹۳۳ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی یہاں وہ چھ سال تک زیر علیم رہے اور پھر اپنے چھوٹے چچا ڈاکٹر محمود حسین خان کے ہمراہ ڈھاکہ چلے گئے اور منی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں داخلہ مل گیا یہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور امتحان میں اچھے نمبر بھی حاصل کئے جس سے ان کا عزم و حوصلہ بڑھ گیا۔انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ اول میں کامیاب

ہوئے اور ڈھاکہ کے چار سالہ قیام کے بعد دہلی تشریف لائے۔

دہلی میں اینگلو عربک کالج (قدیم دہلی کالج) میں بی اے کی کلاس میں داخلہ لیا۔ان کے مضامین اختیاری تاریخ اور فارسی تھے انگریزی اور اردو لازمی زبانیں تھیں۔بی اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ پہنچے اور ۱۹۴۱ء میں ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔علی گڑھ کے ماحول میں مسعود حسین خان کا ادبی ذوق پروان چڑھا تھا۔ ملازمت کا آغاز آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے ہوا لیکن چھ مہینے میں وہ اس کام سے اکتا گئے اور اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں نومبر ۱۹۴۳ میں جونیئر لکچرار کے طور پر عارضی تقرر عمل میں آیا علی گڑھ میں آل احمد سرور کی نگرانی میں ''اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء'' پر تحقیقی کام کا آغاز کیا اور یہ کام دو سال کے اندر مکمل کر لیا اور ۱۹۴۵ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال شعبۂ اردو میں لکچرار کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔فروری ۱۹۴۸ میں ان کی شادی ان کی چچا زاد بہن نجمہ سے ہوئی۔ ۱۹۵۰ سے ۱۹۰۳ تک یورپ میں قیام کیا اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے شعبہ لسانیات میں داخلہ لیا اور پھر اکتوبر ۱۹۵۱ میں پیرس منتقل ہو گئے یہاں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور محنت شاقہ کے بعد فروری ۱۹۰۳ میں ڈی لٹ کی عظیم ڈگری حاصل کی جو اس وقت ادبی دنیا کے لیے بہت بڑے فخر کی بات تصور کی جاتی تھی۔

ہندوستان واپس ہوئے تو ۱۹۵۴ میں شعبۂ اردو میں ریڈر بنادئے گئے ۔۱۹۶۰ میں آسٹن (ٹکساس) کا سفر کیا اور یہاں دو سال گزارے اس کے بعد برکلے کا رخ کیا اور پھر علی گڑھ واپس ہوئے یہاں بعض وجوہات کی بنا پر فوری طور پر ترقی کا امکان نہیں تھا اور جون ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد پہنچ کر عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو اور پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور حیدرآباد میں ۱۹۶۸ تک قیام کیا۔انہوں نے شعبہ اُردو کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں'' اردو قدیم'' کے تحقیقی مجلّے کا اجراء بھی ان ہی کا کارنامہ تھا۔اگست ۱۹۶۸ میں علی گڑھ کے شعبہ لسانیات سے وابستہ ہو گئے جنوری ۱۹۷۳ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انتخاب ہو گیا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ۱۹۷۳۔۱۹۷۸ تک گزارا ہے اور جامعہ کی تنظیم نو میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ان کے اس عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے یہ یونیورسٹی

ایک ڈیمڈ یونیورسٹی کی طرح کام کرتی تھی مسعود حسین خان کے آنے کے بعد ایک طویل جدو جہد ہوئی۔ ان کے جان توڑ محنت کے اور توجہ کے بعد یو جی سی نے اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا پھر کیا تھا یونیورسٹی ترقی کی طرف گامزن ہوگئی اور اس کی شہرت و ناموری میں چار چاند لگ گئے۔(۱۵)

۱۹۷۸ میں مسعود حسین خان کو ترقی اردو بیرو کے اعزازی نائب صدر بنائے گئے یہاں بھی آپ نے اصلاحات سازی کا اہم کارنامہ انجام دیا اور اردو لغت کی ایک جلد کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے۔۱۹۷۳ تک مسلسل وہی منتخب ہوتے رہے۔علی گڑھ کے شعبہ اردو میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے اور کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں بھی وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔مسعود حسین خان ہندوستان کے ان اہم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی نگارشات اہل علم کے مابین اہمیت ووقعت کی نگاہ سے جاتی ہیں اور جو طلباء و اسکالروں کے لیے یکساں اسفتادہ کا باعث ہیں۔کتابوں کے مطالعہ سے مسعود حسین خان کے تحقیق ذوق، تبحر علمی، وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے دراصل پرانی کتابوں اور مخطوطات کے متون کی تدوین اور تحقیق ان کے اصل اہم کارنامے ہیں جس کی وجہ سے جنہیں شہرت دوام حاصل ہوا اور علمی وادبی حلقے میں انہیں کافی سراہا گیا نیز ان کے کاموں کو استحسان کی نگاہ سے دیکھا گیا ان کی کچھ کتابیں اس طرح ہیں۔

(۱) قصہ مہرافروز دلبر ۱۹۸۹

(۲) پرت نامہ

(۳) بحث نامہ

(۳) ابراہیم نامہ/۱۹۶۹

(۴) مقدمہ تاریخ زابن اردو ۱۹۵۸

(۵) مقالات مسعود

(۶) عاشور نامہ/۱۹۷۲

(۷) تلاش وتعبیر(۱۶)

عیسوی خان کے "قصۂ مہرافروز ودلبر" کا واحد نسخہ آغا حیدر حسن کے کتب خانہ کا مخزونہ تھا۔ یہ

شمالی ہند کی ایک قدیم داستان ہے اس کے دیباچے میں مسعود حسین خان نے بتایا ہے کہ انہیں عیسوی خان کے حالات زندگی معلوم نہیں ہو سکے پر کاش مونس نے عیسوی خان کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں وہ گوالیار کے قریب ریاست نرور کے راجہ چھتر سنگھ کے دربار کے ایک امیر تھے۔ انہوں نے ہندی کے مشہور شاعر بہاری کی ''ست سئی'' کی شرح قلمبند کی تھی۔ مسعود حسین کان نے'' مہرافروز و دلبر'' کے دوسرے ایڈیشن میں پر کاش مونس کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا ہے اور وہ اس خیال کے حامل ہیں کہ ٹیکم گڑھ مدھیہ پردیش کی راج لائبریری میں موجود ''راس چندریکا'' کا اردو نسخہ بچشم خود دیکھ کر ہی فیصلہ کریں گے اور قصہ مہرافروز و دلبر سے اس کا موزنہ کرین گے۔ مسعود حسین خان اس داستان کے بارے میں کہتے ہیں کہ عیسوی خان نے دلی کے لال قعلے کی تصور کشی کی ہے انہوں نے قصے کے دوسرے حصے میں یعنی ''نصیحت نامے'' کے جو فارسی ماخذ دریافت کئے ہیں اس سے ان کی تحقیقی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور ان کی محنت و مشقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مسعود حسین خان'' بکٹ کہانی' کو مرتب کر کے قدیم اردو جلد اول میں شائع کیا یہ تحقیقی کام انہوں نے نورالحسن کے اشتراک سے انجام دیا ہے۔ نورالحسن نے چھ قلمی نسخوں کی مدد سے اس کا متن تیار کیا تھا۔ مسعود حسین خان نے حیدرآباد میں موجود چار قلمی نسخوں سے اس کا موازنہ کیا اور اس کا متن تیار کر لیا اس پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا اور اختلاف نسخ کو واضح کر کے ۱۹۶۵ میں زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اتنا اہم نسخہ محققین کی نظر سے کس طرح بچ گیا۔ محمود شیرانی نے ۱۹۲۶ میں ایک مضمون'' بکٹ قصہ محمد افضل جھنجھانوی'' کے زیر عنوان'' اورینٹل کالج میگزین'' میں شائع کیا تھا۔ مسعود حسین خان نے محمود شیرانی سے اتفاق کرتے ہوئے والہ داغستانی کے تذکرہ ریاض الشعراء کے افضل اور بکٹ کہانی کے مصنف کو ایک شخصیت قرار دیا ہے'' ریاض الشعراء'' میں جس افضل کا ذکر ہے وہ فارسی گو تھا۔ اردو تحقیق کے دامن پر یہ تاریخی غلطی ہمیشہ ایک بدنما داغ کی صورت میں نمایاں رہے گی کہ بغیر کسی شہادت کے بغیر بکٹ کہانی کا مصنف ایک غیر متعلق شخصیت کو قرار دیا گیا۔ (۱۷)

''پرت نامہ'' فیروز بیدری کی ایک مختصر سی مثنوی ہے ادبی اہمیت سے زیادہ اس کی لسانی اور تاریخی اہمیت قابل توجہ ہے۔ یہ سولہویں صدی عیسوی کی مثنوی ہے جس میں فیروز نے اپنے پیر مخدوم جی کی مدح

کی ہے۔ مسعود حسین خان نے صحیح لکھا ہے کہ یہ ایک مرید کا اپنے پیر کی خدمت میں نذرانہ عقیدت ہے۔ مسعود حسین خان نے ''پرت نامہ'' کے دو نسخوں کا موازنہ کر کے متن تیار کیا تھا اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد اور دوسرے انجمن ترقی اردو ہند میں محفوظ ہے۔ جون ۱۹۷۵ء میں نذیر احمد نے انجمن کے نسخے کو جوں کا توں چھاپ دیا لیکن مسعود حسین خان نے تمام مواد اور ضروری معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے متن مرتب کیا ہے اس کی تدوین مرتب نے بڑی دقت نظر اور تحقیقی دیدہ دری کے ساتھ کی ہے۔ مسعود حسین خان نے بیجاپور کے شاعر کا ''ابراہیم نامہ'' بھی مرتب کر کے اپنے بیش قیمت مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابراہیم نامہ کا مقدمہ تحقیقی نقطۂ نظر سے وقیع ہے اس سے مرتب کی ذہانت اور علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسعود حسین خان کے پیش نظر دو نسخے تھے اس میں سے ایک ریاست روندھ مہاراشٹرا میں موجود تھا جس کا ذکر سب سے پہلے بھگوت دیال روما (پونا) نے کیا تھا دوسرا نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں تھا نصیر الدین ہاشمی نے اپنی وضاحتی فہرست میں اس کا بھی تعارف کروایا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں اس پر مفصل بحث کی ہے ابراہیم نامہ کو مسعود حسین خان کی دکنی تحقیق کا شاہکار اور گل سرسبد تصور کی جاتی ہے بلاشبہ مقدمہ میں اچھا لسانی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

مسعود حسین خان نے ابراہیم نامہ کا سنہ تصنیف متعین کرنے میں بڑی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے انہوں نے محکمہ آثار قدیمہ کے ضیاء الدین ڈسائی کی سند پر ''مشہور'' کو ہجری فصل اور عیسوی سے علیحدہ سنہ بتایا ہے اور اس کی بناء پر ''ابراہیم نامہ'' کو بیجاپور کا پہلا ابدی نقش بتایا ہے۔ مسعود حسین خان نے ''عاشور نامہ'' کی آٹھ صوتی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔ مسعود حسین خان نے جب ''عاشور نامہ'' کی تدوین کی شاعر اور ادیب دونوں کی غلطیوں کی نشان دہی کی ''عاشور نامہ'' کی اشاعت قدیم ادبی سرمائے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ دراصل ''عاشور نامہ'' سفارش حسین کی دریافت ہے اس کا واحد نسخہ رام پور رضا لائبریری رام پور میں موجود تھا۔ سفارش حسین نے ''اردو ادب میں'' میں اس پر ایک مضمون ۱۹۷۱ء میں شائع کیا تھا۔

''رقعات رشید احمد صدیقی'' میں مسعود حسین خان نے وہ خطوط جمع کر دئے ہیں جو رشید احمد صدیقی نے انہیں لکھے تھے اس سے اردو دنیا کو یہ فائدہ پہنچا کہ ایک صاحب طرز انشا پرداز کی تحریروں کے

نایاب نمونے منظر عام پر آ سکے۔ ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' کا موضوع دراصل تاریخ لسانیات ہے اس میں انہوں نے تفصیل سے اردو کے ماخذوں پر روشنی ڈالی ہے اور مختلف ہندوستانی زبانوں سے اس کا موازنہ کر کے اس کے انفرادی خدوخال نمایاں کئے ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے اور مختلف یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے مسعود حسین کان نے اس کتاب میں لسانیات سے متعلق اپنی نوعیت الگ کتاب ہے جس میں بڑے عالمانہ انداز میں اظہار کیا ہے یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں ہندستان کی آریائی کے تیسرے دور کی لسانی خصوصیات پر اچھا تبصرہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں عنوان اردو کے ارتقاء کا تحقیقی مواد ہے جس میں اردو کی جنم بھومی پر تحقیقی مباحث سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں یہ ۸۰۰ تا ۱۳۰۰ تک کے عرصے پر محیط ہے۔ چوتھے باب میں مسعود حسین خان نے اردو سے متعلق مختلف نظریات کا تنقیدی نظریے سے جائزہ لیا ہے اور اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے مسعود حسین خان نے محمود شیرانی کے اس نظرئے کی جانچ بھی کی ہے جس میں انہوں نے پنجابی کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے۔ پانچویں باب میں ''اردو کی ابتداء کے بارے میں نئے نظرئے کا خاکہ'' کے عنوان سے مسعود حسین خان نے اپنے لسانی تصورات کی تشریحات کی ہیں۔ مسعود حسیں خان نے اپنی اس کتاب کے لیے مختلف ماخذوں سے استفادہ کیا ہے اور کتنی بالغ نظری کے ساتھ لسانیات کے نقطۂ نظر سے یہ کام انجام دیا ہے اس کا اندازہ کتابیات سے لگایا جا سکتا ہے اس کا تعلق صرف مطالعہ سے ہی ہے۔

مسعود حسین خان نے نسخہ بخط غالب اور نسخۂ رام پور رضا لائبریری (نسخہ عرشی) کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کا کلام ایک اچھا انتخاب شائع کیا ہے جس کی انفرادیت اور اہمیت یہ ہے کہ غالب کا کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ ردیف وار پیش کیا گیا ہے۔ تاریخی ترتیب کی وجہ سے فکر غالب کے تاریخی ارتقاء کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور غالب کے طرز ترسیل میں جو تبدیلی ہوئے ہے اس کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے اس پر ظہور احمد نے اعتراض بھی کیا ہے کہ مسعود حسین خان نے غالب کے بعض اچھے اشعار سے صرف نظر کیا ہے۔ دراصل انتخاب میں کاما اور اعراب وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے قرأت

میں آسانی پیدا ہوگئی ہے اوراس کے مطلب کو سمجھنے میں بھی اس سے طلبائے کرام کو کافی سہولت ہوتی ہے۔

مسعود حسین خان نے جدید لسانیاتی مطالعے کو فروغ دیا اور یورپ اور امریکہ کے لسانی نظریات کو اردو والوں سے روشناس کروایا۔انہوں نے لسانیات کی اعلیٰ تعلیم انگلستان ،فرانس اور امریکہ میں حاصل کی تھی ان سے پہلے صرف ڈاکٹر زور کو یہ شرف تھا جومسکی (Noam chan sky) کی کتاب (Syntactive Stricture) اور بلوم فیلڈ کی تصنیف ''language'' (نیو یارک ۱۹۳۳) نے لسانیات کی دنیا میں ایک زبردست تہلکہ مچا دیا تھا۔اور ادب ولسانیات کے رشتے پر لوگ نئے زاوئے سے غور کرنے لگے تھے۔مسعود حسین خان کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے لسانیات کی مدد سے اسلوب کا نیا مواد فراہم کیا اسلوبیات ،لسانیات اور ادب کے رشتے کی مظہر ہے۔ امریکی ماہر اسلوبیات آر کی بالڈاے اور پروفیسر ہل کی تصنیف کا اثر مضامین میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو'' شعروزبان'' (۱۹۶۶) میں شامل ہیں۔

مسعود حسین خان نے خود عملی طور پر اقبال ،غالب اور فانی کے کلام کا تجزیہ پیش کیا ہے۔مسعود حسین خان نے ۱۹۶۹ء میں ''دکنی اردو لغت'' بھی مرتب کی ہے اس میں انہیں جن تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کی تفصیل انہوں نے'' ودور مسعود'' میں بھی بڑی وضاحت سے بیان کر دی ہے۔ یہ دکنی کی ایک اہم اور اچھی لغت بن سکتی تھے لیکن بعض وجوہات کی بناء پر ایسا نہیں ہوسکا۔اس لغت میں سات آٹھ ہزار الفاظ کے معنی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ لغت ۱۹۶۹ء میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوئی تھی۔اس کا شمار اہم لغات میں ہوتا ہے اور خاص طور پر طلباء کے لیے یہ لغت بے حد مقبول ومفید ہے۔ (۱۸)

مسعود حسین خان شاعری بھی کرتے تھے اور ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے بھی لوگوں میں روشناس تھے ان کی شاعری میں سلاست وروانی بھی پائی جاتی تھی۔انہوں نے کشمیر کی دلکش اور فرحت بخش ماحول کو بھی اپنی شاعری کا محرک قرار دیا ہے اور یہ یقیناً صحیح ہے دو اصل وادی کشمیر ایسا دلکش و پر مسرت مقام ہے کہ شاعروادیب کا قلم جنبش کرنے لگتا ہے۔ادیب وشاعر کے دل میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے بہر کچھ ایسا ہی مسعود حسین خان کے ساتھ بھی ہوا ہے حال ان کا مجموعۂ کلام'' دو نیم'' شائع ہو چکا ہے

اور شعراء واد باء کے حلقے میں ان کے اس مجموعہ کی کافی پزیرائی بھی ہوئی ہے اور شاعری میں بھی ان کا مقام ومرتبہ مسلم ہو چکا ہے ان کا یہ مجموعہ بھی ایک اہم یادگار ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کی وفات پر انہوں نے جو نظم کہی تھی اس کے صرف دو شعر ملاحظہ فرمائیں اس سے ان کی وسعت و دسترس کا پتہ چلتا ہے اور ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کا احساس بھی دلاتا ہے:

کون ہوتا ہے حریف مرگ افگن علم
کس کے سر جائے گا اب بار گران اردب
شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
اب فقط رہ گئے ہم پیشہ وارانہ اردو

مسعود حسین خان نے شاعری کی طرف بہت زیادہ متوجہ نہیں ہوئے حالانکہ ان میں شعر گوئی کی اچھی صلاحیت موجود تھی نیز شاعری کے تمام اوصاف وکمالات پائے جاتے تھے اس کا جیتا جاگتا نمونہ ان کا شعری مجموعہ ''دونیم'' ہے۔ مسعود حسین خان خان علم لسانیات سے اپنی واقفیت، اپنی لسانی تحقیق اور قدیم متون کے مرتب کی حیثیت سے اور نثر میں منفرد مقام واہمیت رکھتے ہیں۔

رشید حسن خان

تدوین متن کے تقاضوں کی تکمیل اور تحقیق کے آداب سے آگہی کے سلسلے میں رشید حسن خان کا نام اردو ادب میں سرفہرست آتا ہے۔ گیان چند جین نے انہیں ''خدائے تدوین'' سے موسوم کیا ہے۔ اردو تحقیق کو اعتبار عطا کرنے اور اس کی ادبی اہمیت تسلیم کروانے میں جن محققین نے نمایاں حصہ لیا ہے ان میں میں رشید حسن خان کا نام بھی شامل ہے۔ میں رشید حسن خان کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی سوجھ بوجھ اور ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا ہے جس کی علمی حلقے میں بڑی اہمیت وافادیت ہے۔

رشید حسن خان کی پیدائش ۱۰ ای رجنوری ۱۹۳۰ کو شاہ جہان پور میں ہوئی۔ نسبی طور پر خالص پٹھان ہیں جس کا اثر یقینی طور پر ان کی روزمرہ کی زندگی صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ رشید حسن خان عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے السنہ مشرقیہ کے امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے کامیاب کیئے کچھ دنوں شاہ جہاں پور کے اسکول میں تدوین کے فرائض انجام دئے اس کے بعد دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اینڈ ریفرنس اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف مختلف اداروں اور اکیڈمیوں نے بھرپور انداز میں کیا ہے کیا ہے ان کی تحقیقی کاوشوں میں ترتیب و تدوین کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کے علاوہ کتابیں بھی اہم ہیں۔ کچھ اہم تصانیف اس طرح ہیں۔

(۱) فسانۂ عجائب ر۱۹۹۰

(۲) مثنوی گلزار نسیم ر۲۰۰۷

(۳) باغ و بہار ۲۰۰۹/

(۴) مثنویات شوق ۱۹۹۸

(۵) ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ ۱۹۷۹/

(۶) انتخاب سودا ۲۰۰۴/

(۷) انتخاب ناسخ ۱۹۷۲/

(۸) مراثی انیس و دبیر ۲۰۰۲

(۹) مثنوی میر حسن ۱۹۶۶/

(۱۰) تدوین تحقیق روایت

(۱۱) تلاش و تعبیر ۱۹۹۰/

(۱۲) تدوین متن کے مسائل ۱۹۸۲

(۱۳) اشاریہ کلام غالب : کلام غالب میں فارسی ترکیبیں ۱۹۷۰

(۱۴) انشائے غالب ۱۹۹۴ (۱۹)

''تدوین تحقیق روایت'' رشید حسن خان کے گیارہ مضامین پر مشمل ہے ان میں سے تین مضامین اصول تحقیق و ترتیب تدوین سے متعلق ہیں۔ دراصل رشید حسن خان نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اصل ماخذ کی جگہ ثانوی ماخذ کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے ''مثنوی زہر عشق'' کی تاریخ تصنیف ''غم دلربا'' (۱۲۷۷ء) کی دریافت کا سہرا سر راس مسعود کے سر باندھا جاتا ہے انہوں نے اسے ''انتخاب زریں'' میں پیش کیا تھا ۔رشید حسن خان نے اپنی محنت، کوشش، جستجو اور تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ نظامی بدایونی نے پہلی مرتبہ مثنوی زہر عشق کے دیباچے میں اس کی نشاندہی کی ہے اور اسکو مسعود نے بغیر حوالہ دئے اس کو پیش کر کے ایک غلط فہمی پیدا کی ہے رشید حسن خان نے ادبی دیانت داری اور حزم واحتیاط پر زور دیا ہے۔

''اردو املا'' بھی رشید حسن خان کی تحقیق اور ادبی دلچسپی کا ایک موضوع رہا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے وسیع مطالعے کے بعد نتائج اخذ کئے ہیں اور مسائل و مباحث کو دقت نظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔اردو زبان میں لفظوں کی تراش خراش اور صورت گری کے عمل کو انہوں نے ادبی تاریخ کے پس منظر

میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ ''رواج عام'' کو سند تصور کرتے ہیں املا کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ صوتی کیفیت مدنظر رکھ کر الفاظ کا املا تحریر کیا جائے جیسے بوالہوس کو بل ہوس کا حالانکہ کو حال آن کہ وغیرہ۔ رشید حسن خان کی آسان املا کی تحریک سے بعض وقت مصنوعی مسائل پیدا ہونے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔۔ رشید حسن خان نے ادبی تحقیق کے اصول وضوابط اور نظریات کو مرتب و مدون کر نے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اپنی کتاب ''ادبی تحقیقی مسائل و تجزیہ'' میں وہ کہتے ہیں کہ تحقیق کا مقصد حقائق کی دریافت ہے اور ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل و دخل ہو تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ وہ دراصل تحقیق کے دو مختلف میدان متعین کرتے ہیں اور اس خیال کے حامل ہیں کہ ان دونوں کے دائرے عمل مختلف ہیں اس لیے خلط مباحث سے گریز ضروری ہے۔ وہ تحقیق میں نکتہ رسی، حقیقت شناسی اور معنویت کو جو استخراجی نتائج پر مبنی ہوں اہمیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔ رشید حسن خان ایک ایسے محقق ہیں جن کے نظریات میں لچکداری کو کہیں جگہ نہیں مل سکی ہے اور وہ دوٹوک فیصلوں ہی سے مطمئن ہوتے ہیں۔ کسی بیان کو قبول کرنے سے قبل اسے تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنا اور مستند ماخذوں سے ان کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور یہ عمل انتہائی ضروری بھی ہے ایسا کرنے سے بہت ساری باتیں منظر عام پر آجاتی ہیں ایک اچھے محقق و ناقد کے کئے ان سب باتوں کو مدنظر رکھنا لازم ہے ان کا ماننا ہے کہ بیاضوں میں صحت انتساب کی حیثیت ثانوی ہوا کرتی ہے۔

رشید حسن خان نے معتبر اور مشکوک حوالوں سے بحث کی ہے اور تحقیق کے سرمائے میں مفید معلومات کا اضافہ کیا ہے پہلے اور نظریاتی حصہ میں اصول سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں علمی تحقیق سے گفتگو کی گئی ہے جس میں دیوان غالب صدی ایڈیشن، اردو شاعری کا انتخاب، تاریخ ادب اردو جلد اول کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کتابوں میں مالک رام، ڈاکٹر زور، اور جمیل جالبی کی فروگزاشت کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ تاریخ ادب اردو جلد اول پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید حسن خان نے جمیل جالبی کے لسانی مغالطّوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلطیوں کی نشاندہی تحقیق کے اہم حصے کے ساتھ ساتھ اہم فرض بھی ہے لیکن اس میں محقق کا رویہ ہمدردانہ اور نرم ہونا چاہئے رشید حسن خان کی کتاب ''

فسانۂ عجائب'' ان کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے انہوں نے یہ کام ۱۹۷۸ء کے قریب شروع کیا تھا۔اس میں مشکل مرحلہ' [فسانۂ عجائب'' کے متن کی صحیح قراءت کا تھا۔اعراب اور رموز اوقاف کا کام پڑھنے والے کے لیے باعث سہولت ہوتا ہے لیکن مرتب کے لیے بڑی عرق ریزی اور محنت کا کام ثابت ہوتا ہے اس سلسلے میں مصنف کے عہد کے تلفظ اور اس کے علاقے کی زبان کی عمومی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اس لیے رشید حسن خان کی جد و جہد جو اس کتاب سے متعلق ہے وہ ہم سب پر واضح ہے۔ (۲۰)

رشید حسن خان کی جگر کاوی اور ادبی زہر گزاری کا اندازہ اس کتاب کے عنوانات (سرور کی)ولادت، وفات، تعلیم مختلف معنوں سے واقفیت، وجہ تصنیف اور زمانہ تصنیف سے لگایا جا سکتا ہے۔رشید حسن خان نے صحیح معنوں میں اہم مآخذوں تک رسائی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور مستند معلومات اکٹھا کی ہیں۔یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ رجب علی بیگ نے مختلف اوقات میں اس کتاب میں اضافے بھی کئے ہیں اور رد و بدل سے بھی کام لیا ہے اور اس کا سلسلہ ۱۲۴۰ھ سے ۱۲۸۰ھ تک جاری رہا۔رشید حسن خان نے تمام ایڈیشنوں کا بغائر مطالعہ کیا اور ہر لفظ پر غور و خوض کے بعد متن تیار کیا ہے۔ اس کتاب میں ضمیمے بھی شامل ہیں ساتواں ضمیمہ اختلاف نسخ کا ہے جو پچاس صفحات پر مشتمل ہے تدوین متن کے سلسلے میں رشید حسن خان جیسے محقق کی کوششیں اور محنت پر جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے ان کے کئے ہوئے کام کی معنویت میں آج اور اضافہ ہو گیا ہے۔

رشید حسن خان نے دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' کو بھی تحقیقی شان کے ساتھ مرتب کیا ہے۔گل بکاولی کا قصہ بنیادی طور پر ہندوستانی مزاج کا حامل ہے اور اس میں مختلف کہانیوں کے عناصر نے جگہ پائی ہے۔رشید حسن خان نے کتاب کے ابتدائی حصے میں یہ بتایا ہے کہ نہال چند لاہوری نے گل کرائسٹ کی فرمائش پر پہلی بار اس کا اردو ترجمہ ''مذہب عشق'' کے نام سے پیش کیا تھا۔کتاب کے مقدمہ میں قصہ اور شاعر کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی گئی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ قصہ کی مقبولیت سے متاثر ہو کر ۱۸۳۸/۱۹۳۹ میں دیا شنکر نسیم نے اردو نظم کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔''تمہید'' دس مختلف عنوانات پر مشتمل ہے اس میں قصے کی قدیم ترین تحریریں روایت تمثیل، قصے کے محل وقوع، نسیم کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا ذکر موجود ہے رشید حسن خان نے اس سلسلے میں مختلف محققین کے بیانات کا جائزہ بھی لیا

ہے اور اپنے اخذ کردہ نتائج سے بحث بھی ہے۔

گلزار نسیم کا مقدمہ تحقیقی اعتبار سے ایک وقیع کاوش ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں حالات زندگی بھی ہیں اور کلام پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔رشید حسن خان نے ان محققین پر اعتراض کیا ہے جو مقدمے میں ادب پارے کے تنقیدی پہلو پر روشنی ڈالنا ضروری تصور کرتے ہیں لیکن خود انہوں نے گلزار نسیم کے مقدمے میں یہی کیا ہے مقدمہ گلزار نسیم میں رعایت لفظی ،تجنیس ،تشبیہ، استعارہ اور صنائع وبدائع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔حقیقت یہ ہے مقدمہ مرتبہ متن کا تعارف ہوتا ہے اور اس میں مصنف اور اس کی ادبی تخلیقات پر تبصرہ کسی طرح غیر ضروری اور بے محل نہیں ہوتا خواہ اس کے لکھنے والے ڈاکٹر زور ہوں یا رشید حسن خان۔

رشید حسن خان کی ''مثنویات شوق'' تحقیقی نقطہ نظر سے ایک قابل قدر تصنیف ہے۔انہوں نے '' قریب عشق'' اور زہر عشق'' کا متن مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اور ان ہی تین مثنویوں کو وہ شوق کی شعری کاوشیں تسلیم کرتے ہیں۔اس کے مقدمے میں اہم معمومات اکٹھا کی گئی ہیں۔مثنویات کے زمانہ تصنیف سے مفصل بحث کی ہے انہوں نے عطاء اللہ پالوی کے تذکرہ شوق، شاہ عبدالسلام کی کتاب'' دبستان آتش '' اور سید محمد حیدر کے تحقیقی مقالے'' حیات شوق'' کا تحقیقی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے اور حیدر کے بیانات کے پرخچے اڑا دئے ہیں۔مقدمے کا آخری عنوان'' طریق کار'' ہے جس میں پیش کئے جانے والے ایڈیشن کے بارے میں بیان دیا گیا ہے۔گیان چند جین نے رشید حسن خان کی ترتیب پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے بہت سی اہم معلومات کو جنہیں متن میں جگہ ملنی چاہئے تھی، حاشیہ میں درج کیا ہے۔دوسرا اعتراض یہ ہے کہ رشید حسن خان نے اشک کی لغت کا نام'' نفس اللغۃ'' تحریر کیا ہے اس سے تاریخ برآمد ہوتی ہے لیکن یہ نام اور اس سے اخذ کی جانے والی تاریخ دونوں غلط ہیں۔

'' تلاش وتعبیر'' رشید حسن خان کی ایک اہم کتاب ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تدوین متن اور املا کے ماہر ہی نہیں تنقید کے رمز شناس بھی ہیں۔'' تلاش وتعبیر'' رشید حسن خان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنے دوٹوک فیصلے سنائے ہیں۔اس کتاب کا پہلا مضمون دوہرا کردار ہے جس میں ان کا مخصوص طنزیہ لب ولہجہ نمایاں ہے اس مضمون میں انہوں نے ان ادیبوں پر

چوٹ کی ہے جو اپنا ذہن اور قلم بیچ ڈالتے ہیں دوسرے مقالے میں رشید حسن خان نے محمد علی جوہر کی سچائی ،ایمانداری، حب الوطنی، اور بے ریائی پر روشنی ڈالی ہے۔اس مضمون میں بعض ادبی شخصیتوں کی زبان کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے'' فیض کی شاعری کے چند پہلو''اور'' جوش کی شاعری میں لفظ و معنی کا تناسب'' ان کے اچھے مضامین ہیں موخر الذکر میں رشید حسن خان نے اس پر زور دیا ہے کہ جوش کے کلام میں الفاظ زیادہ ہیں اور معنی کم۔

''جوہر کی شاعری''اور دیوان حالی'' میں ان کا تنقیدی شعور بروئے کار آیا ہے۔لیکن یہ مضامین تنقید کے اعلی نمونے نہیں کہے جا سکتے ۔ رشید حسن خان بنیادی طور پر محقق ہیں اور محقق کی حیثیت سے انہوں نے قابل قدر کارنامہ انجام دئے ہیں ۔جعفر زٹلی پر رشید حسن خان کا مضمون معنی خیز ہے اور بعض نئے پہلوؤں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔اور اس مضمون میں انہوں نے تحقیقی نتائج سے تنقید میں بھی اچھا کام لیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم نے ابھی جعفر زٹلی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور دراصل اردو ادب میں انہیں وہ مقام نہیں مل سکا ہے جس کے وہ مستحق ہیں ۔جعفر زٹلی نے فحش نگاری کی ہے اور کچھ پھوہڑ پن سے بھی کام لیا ہے لیکن اپنے عہد کے تہذیبی پہلو کی ترجمانی بھی ہے اس پر نقادوں نے کم توجہ دی ہے۔ (۲۱)

پروفیسر نثار احمد فاروقی

پروفیسر نثار احمد فاروقی برصغیر کے اہم دانشوروں ،ممتاز اہل علم ،ماہر غالبیات ،مشہور محقق و مدون ،اچھے مترجم، کی حیثیت سے معروف ہیں ۔فاروقی صاحب اپنے منفرد اسلوب، لسانی و تقابلی مطالعہ، تحقیقی وتنقیدی بصیرت میں ضرب المثل تھے۔انہیں عربی ،فارسی ،اردو،انگریزی زبانوں پر کیساں عبور تھاجس کا انہوں نے بھرپور فائدہ بھی اٹھایاپروفیسر نثار احمد فاروقی ذرہ کی طرح ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھے آسمان پر چھاگئے ۔غالبیات ومیریات میں اپنی شناخت کرانے میں وہ بے حد کامیاب رہے۔

۲۹/جون ۱۹۳۶کوضلع امروہامرادآباد کے ایک علمی خانوادے میں آپ کی ولادت ہوئی ۔۴/سال کی عمر میں حضرشاہ علاءالدین چشتی نے بسم اللہ کی رسم ادا کرائی۔اس کے بعد محلّہ پیرزادہ کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۲۔۳ سال کے بعد ابتدائی درجوں میں تعلیم حاصل کی۔چوتھی جماعت میں داخلہ امام المدارس ہائی اسکول کے پرائمری میں ہوا ۔قرآن مجید اپنے چچا مولانا نسیم احمد فریدی (م۱۹۸۸) سے پڑھا۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں جیسے پند نامہ، کریما، انوار سہیلی، اخلاق جلالی ،صفوۃ المصادر،اورمثنوی مولانا روم نیزعربی صرف ونحو کی بعض کتابیں اپنے نانا شاہ سلیمان چشتی (م۱۹۶۲) سے پڑھیں۔اس کے بعد جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل،ادیب ماہر،اورالہ آباد یونیورسٹی سے فاضل کیا۔

صدیوں سے ان کے خاندان کا معاش زمین داری تھی لیکن ۱۹۵۲میں جب زمینداری کا خاتمہ ہوگیااور گھر کا سارانظام درہم برہم ہوگیا تو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی اور مجبوراًانہیں دہلی کا رخ کرنا پڑا۔ چنانچہ۶۰ روپیہ ماہ وار پرایک پرائیویٹ دفتر میں ملازمت شروع کر دی۔۱۹۵۷میں دہلی یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے شعبہ میں ملازمت کر لی اوراسی سال انٹر بھی پاس کرلیا۔۱۹۶۲میں بی اے پاس کیا اور

۱۹۶۴ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی پھر اسی سال دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گئے ۔ ۱۹۷۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ ۔ ۱۹۷۸ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں موڈرن عربک میں ریڈر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۸۵ء میں صدر شعبۂ عربی ہوئے اور بحسن خوبی اپنی مدت پوری کر کے ۲۰۰۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ۔ وہ ترقی کے اعلی منازل طے کئے ۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی ہندوستان کے ان خوش قسمت ادیبوں میں ہیں جنہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اللہ تعالی نے انہیں عزت، دولت ،شہرت، علم سب سے نوازا تھا (۲۲)

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ۱۲؍سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور زندگی کی آخری سانس تک لکھتے رہے ۔ اردو، انگریزی، عربی، فارسی میں تقریباً ۵۰؍کتابیں اور بے شمار مقالات و مضامین ان کی یادگار ہیں جو آج بھی کے تبحر علمی، تحقیقی ذوق وشوق کی غماض ہیں ۔ اور طلباء و اساتذہ کے یکساں استفادہ کا باعث بھی ہیں ۔ دراصل پروفیسر نثار احمد فاروقی ان لوگوں میں تھے جو ہوا میں باتیں کرنے کے قائل نہ تھا کسی موضوع پر کچھ کہنے یا لکھنے سے قبل اس کے متعلق تمام معلومات (مخطوطات و مطبوعات) اکٹھا کرتے ،سب کا بغائر مطالعہ کرتے اور جب خود سے مطمئن ہو جاتے تب جا کے اپنی بات پیش کرتے ۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تمام کتابیں اپنے موضوع پر بہت اہم مانی جاتی ہیں خاص طور پر ان کی دو مشہور کتابیں ''تلاچ میر'' اور ''تلاش غالب'' جدید اردو تنقیدی ادب میں گراں بہا اضافہ ہیں ۔ ان کا وسیع مطالعہ، اردو، فارسی ،انگریزی اور عربی زبان و ادب پر ان کا غیر معمولی عبور، ان کی تحقیق و تنقید کی قابل تحسین صلاحیت،، ان کی نگارشات کا حسن معنی اور حسن صورت غرض کس کس کی تعریف کی جائے ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے ۔ اس پر مستزاد ان کا اسلوب بیان جس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ عالمانہ وقار کے ساتھ ساتھ عام فہم سادہ اور آسان ہے ۔ ان کی تنقیدی تحریریں آج کل کے سکۂ رائج الوقت سے قطعاً پاک ہیں ۔ ان کا میدان اختصاص شعراء کے تذکرے، میر مصحفی، غالب، اور مولانا ابوالکلام آزاد ہیں اور اس تعلق سے ان کی نگارشات بے حد وقیع ہیں ۔ (۲۳)

ان کی دلچسپی کے موضوعات میں اردو ادب، ہندوستانی فارسی ادب، عربی ادب، ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافت ،تصوف، سیرت، تقابلی مذاہب کا مطالعہ، تاریخ نویسی، تذکرہ نویسی وغیرہ شامل

ہیں۔آپ کی نگارشات منطقی استدلال کے ساتھ گہرے مطالعہ کی گواہی دیتی ہیں۔مرزا غالب سے متعلق فاروقی صاحب کا غالباً پہلا مضمون ''غالب کا اسلوب'' جومہر نیم روز کراچی ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ پھر غالب پر سکہ کا الزام'' معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۵۹۔نقوش دسمبر ۱۹۵۹۔ مالک رام کی کتاب'' تلامذۂ غالب'' پر تفصیلی تبصرہ،۔غالب کے متعلق اشاریہ ''غالب نما'' برہان جنوری ۱۹۶۱۔ غالب کی ایک غیر مطبوعہ رباعی'' صبح دہلی'' ۱۹۶۲۔ ایک غیر مطبوعہ خط'' آج کل'' دہلی فروری ۱۹۶۴۔مطالعۂ غالب واثر (مطالعۂ غالب سے متعلق اثر کے خطوط) اردو کراچی جنوری، مارچ ۱۹۶۹/ یہ وہ سب اہم مقالات تھے جن کی وجہ سے فاروقی صاحب کا نام غالب شناسوں میں شمار کیا جاتے لگا اور اہل علم وادب کے حلقوں میں وہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ان کی کچھ مشہور اہم کتابیں اس طرح ہیں۔

تدوین وتحقیق

(۱) میر کی آپ بیتی (فارسی ذکر میر کا ترجمہ)۱۹۵۷

(۲)طبقات الشعرا۔قدرت اللہ شوق/۱۹۶۵

(۳)امداد المشتاق/۱۹۶۹

(۴)مقاصد العارفین (شاہ عضد الدین جعفری)۱۹۸۴

(۵)مفتاح الخزائن (نثار علی بخاری)۱۹۸۹

(۶)مرقومات امدادیہ (مرتبہ اشرف علی تھانوی)۱۹۸۰

(۷)شفاء العلیل (عربی/غلام علی آزاد بلگرامی)۱۹۹۰

(۸)مقالات الشعراء۱۹۶۸

(۹)روضۃ الأولیاء(غلام علی آزاد بلگرامی)۱۹۹۲

Early MslimHistoriography 1978

تالیفات

(۱۰)میر تقی میر۱۹۶۴

(۱۱) میر تقی میر انتخاب کلام ۱۹۸۴

(۱۲) غالب کی آپ بیتی ۱۹۶۹

(۱۳) تلاش غالب/ ۱۹۶۹

(۱۴) دراسات ۱۹۷۸

(۱۵) تلاش میر ۱۹۷۴

مجموعہ ہائے مضامین

(۱۶) دید و دریافت (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۴

(۱۷) تلاش غالب (غالبیات پر مضامین) ۱۹۶۹

(۱۸) نقد ملفوظات (تصوف) ۱۹۸۹ (۲۴)

پروفیسر نثار احمد فاروقی کی علمی سرگرمیاں ادبیات عربی و فارسی کی حدود سے باہر قدم بڑھا کر محض اردو زبان پر ہی نہیں جاری رہیں، ان کے کئی مقالات انگریزی زبان میں بھی شائع ہوئے ہیں جس سے ان کی براعت علمی کی گواہی دے رہے ہیں۔ ہندوستان میں کہیں کسی علمی، ادبی، تاریخی و تہذیبی موضوع پر سیمنار رہو اور ان کی شرکت نہ ہو تو وہ ادھورا معلوم ہوتا تھا۔ انگریزی میں ان کا ایک بیش بہا مقالہ گرودوارہ پر بندھک کمیٹی کے زیر اہتمام ایک سیمنار میں پڑھا گیا تھا ایک پمفلیٹ کی صورت میں شائع ہوا اور اس کا عنوان تھا۔ Guru Nanak Dev In islamic Perspective۔ یہ مقالہ موضوع کے علاوہ دوسرے مذاہب سے واقفیت اور استدلال کی قوت کا اہم نمونہ ہے میرے اپنے خیال میں اس طرح کا مقالہ ترتیب دینا کسی سطحی صلاحیت والے عالم کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی عمر عزیز کو علم و ادب کے کوچے میں کس طرح مشغول رکھا۔ اور بالآخر ۲۸/ نومبر ۲۰۰۴ کو وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے امروہہ میں آسودۂ خواب ابدی ہو گئے اور اپنے پیچھے جویان علم و ادب کے لیے علم و ادب کا ایک سمندر چھوڑ گئے۔

پروفیسر نذیر احمد

برصغیر میں فارسی زبان وادب کے حوالے سے پروفیسر نذیر احمد کا شمار ایک اہم ترین اسکالروں میں ہوتا ہے۔جن کی فارسی گراں قدر خدمات سے علمی وادبی دنیا واقف ہے نیز فارسی زبان وادب پر ان کی تحریریں/مقالات/کتابیں سند کا درجہ رکھتی ہیں اور غالبیات میں ایک الگ شناخت رکھتی ہیں۔پروفیسر نذیر احمد کا شمار بھی ماہر غالبیات میں کیا جاتا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد یوں تو بنیادی طور پر فارسی کی لسانی،علمی،اورادبی کاوشوں کے باعث عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔لیکن غالب کے معاملے میں انھوں نے فارسی اور اردو،دونوں زبانوں میں غالب کی نثری کاوشوں کے ساتھ منظوم کلام پر بھی یکساں توجہ صرف کی ہے۔تاہم دوسرے غالب شناسوں سے پروفیسر نذیر احمد اس اعتبار سے ممتاز ومنفرد نظر آتے ہیں کہ انھوں نے شعروادب سے متعلق مسائل کو اپنے لیے مخصوص کرلیا ہے۔مثلاً لسانی نقطۂ نظر سے قصائد غالب کا مطالعہ، غالب فرہنگ نگار کی حیثیت سے، غالب کے اردو اور فارسی مکتوبات کے لغوی مسائل، غالب کی تلمیحات، دستنبو اور دساتیر اور ان جیسے دیگر اہم موضوعات کے انتخاب سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے لیے غالب کی علمی،لغوی، اصطلاحی اور تحقیقی خدمات کسی بھی طرح کی ان کی شاعرانہ اورادبی خدمات سے کم اہمیت کی حامل نہیں۔بہ الفاظ دیگر اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب کی تخلیقی صلاحیت اور شاعرانہ ہنرمندی اور دانش وری سے ان کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اس کی رنگ آمیزی صحیح معنوں میں غالب کی نثر و نظم یا مکتوبات میں کہیں واضح اور کہیں غیر واضح دکھائی دینے والے علمی مسائل اور فارسی و اردو کے لسانی

مباحث سے ہوتی ہے۔اس حوالے سے پروفیسر نذیر احمد کی خاص کر نگارشات بڑی اہمیت و افادیت کی حامل ہیں اور طلباء و اساتذہ کے لیے استفادہ کا عث ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد کی اہم کتابیں اس طرح ہیں۔

(۱) مکاتیب سنائی ۱۹۶۲

(۲) دیوان سراجی ۱۹۷۲

(۳) دیوان عبید لو یکی ۱۹۸۵

(۴) قند پارسی (مجموعہ مقالات نذیر احمد) ۱۹۹۴

(۵) نقد قاطع برہان مع ضمایم ۱۹۵۸

(۶) فرہنگ قواس ۱۹۷۴

(۷) دستور الافاضل ۱۹۷۴

(۸) فرہنگ زفان گویا ۱۹۸۹

(۹) فرہنگ لسان الشعراء ۱۹۹۵

مقالات کے مجموعے

(۱۰) تحقیقی مطالعے ۱۹۵۴

(۱۱) کتاب نورس ۱۹۵۵

(۱۲) تاریخی و علمی مقالات ۱۹۷۶

(۱۳) تذکرہ علمائے بلخ ۱۹۸۹

(۱۴) فارسی قصیدہ نگاری ۱۹۹۱

(۱۵) مومن خان حیات و شاعری

(۱۶) غالب پر چند تحقیقی مطالعے

(۱۷) مقالات نذیر

(۱۸) سید مسعود حسین رضوی ادیب: حیات اور کارنامے

(۱۹) حافظ محمود شیرانی: تحقیقی مطالعے

انگریزی زبان

(۲۰) ظہوری ہز لائف اینڈ ورکس

(۲۱) ترجمہ اعجاز خسروی

(۲۲) انگریزی مقالات کا مجموعہ ۲۰۰۵

پروفیسر نذیر احمد ۳ جنوری ر ۱۹۱۵ کو موضع کوٹھئ غریب، پوسٹ آفس ۔بنگواں ضلع گونڈہ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے ۔ابتدائی تعلیم کا آغاز گاؤں کے عیدگاہ سے ہوا۔ باقاعدہ ابتدائی تعلیم بنگواں کے گرونمنٹ پرائمری اسکول میں ہوئی ۔۱۹۲۶ میں انھوں نے مسکنواں کے اسکول میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۹ تک وہاں زیر تعلیم رہے۔ ساتویں جماعت تک مسکنواں میں تعلیم حاصل کی ۔اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر شمبھو دیال شرمانے ان کا داخلہ گونڈہ کے گرنمنٹ اسکول میں ساتویں جماعت میں کرایا۔ ۱۹۳۰ میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۴ میں اسی اسکول سے دسویں کلاس فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

اعلی تعلیم کے لیے ان کا داخلہ کرسچن کالج لکھنؤ میں ہوا ۱۹۳۶ میں کرسچن کالج سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ میں بی، اے کیا۔ ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم، اے کیا۔ ۱۹۴۵ میں پی ایچ ڈی کی اعلی ڈگری حاصل کی ۔ ۱۹۵۰ میں ڈی فل کیا ۔اور تمام مصروفیات کے باوجود فارسی میں ڈی لٹ کیا۔ ۵۶۔۱۹۵۵ میں فارسی میں اعلی تعلیم کے لیے ایران تشریف لے گے اور تہران یونیورسٹی سے چار مضامین میں ڈپلوما کیا۔ میں سمجھتا ہوں یہ (چار مضامین میں ڈپلوما) اپنے آپ میں ایک الگ ریکارڈ ہے۔

۱۹۴۰ میں پروفیسر نذیر احمد نے U.PS.C. کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ دیوریا کے گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں چالیس روپئے ماہوار اردو فارسی کے ٹیچر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ ۱۹۴۳ میں بستی کے ہای اسکول میں ٹرانسفر ہوا جہاں وہ ۱۹۵۰ تک تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔ در اصل انہیں دس برسوں میں انہوں نے پی، ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اہم ترین ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ۱۹۵۰ میں ان کا تقرر فارسی لکچرر کی حیثیت سے لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوا۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۵۷ میں ان کا

انتخاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ ادب اردو کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے طور پو ہوا۔ ۱۹۵۸ اں شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۶۰ میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر وصدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ میں فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کے اہم عہدے پر بھی فاز ہوے۔ ۱۹۷۷ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی کا علمی مجلّہ ''فکر ونظر'' جب نکلنا شروع ہوا تو پروفیسر نذیر احمد کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔

پروفیسر نذیر احمد کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں متعدد انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں ۱۹۷۸ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ، ۱۹۷۹ ہی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ۱۹۷۶ کے فخر الدین علی احمد ایوارڈ، ۱۹۸۰ میں انجمن استادان فارسی ہند کی طرف سے ''استاذ ممتاز'' ایوارڈ، ۱۹۸۷ میں حکومت ہند کی طرف سے پدم شری کا خطاب، ۱۹۸۷ میں امیر خسر وایوارڈ، ۱۹۸۹ میں ایران کی طرف سے پہلا عالمی، ادبی، اور تاریخی ایوارڈ ''محمود افشا ایوارڈ'' وغیرہ اہم اعزازات شامل ہیں۔ (۲۵)

پروفیسر نذیر احمد ''انجمن اساتزۂ ہند'' کے بانیوں میں ہیں۔ آپ کو دوبارہ ''انجمن اساتزۂ ہند'' کا صدر منتخب کیا گیا۔ ایک بار '' آل انڈیا اورینٹل کانفرنس عربی وفارسی'' کے صدر رہے ''غالب نامہ'' کے مدیر اعلی، غالب انٹرنیشنل سیمنا کمیٹی کے چئر مین، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی اور ۱۹۹۱ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ ایران شناسی (تہران) انڈوایرانیکا (کلکتہ)، معارف (اعظم گڈھ) قند فارسی خانۂ فرہنگ (ایران) اور ہسٹری آف سائنس اینڈ میڈیسن (نئی دہلی) وغیرہ کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر بھی تھے۔

پروفیسر نذیر احمد پوری زندگی علم وادب کی ترویج واشاعت میں لگے رہے وہ اپنے بیش بہا علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جائیگے۔ یقیناً ان کی اہم نگارشات طلباء کے استفادہ کا باعث ہیں۔ علم وادب کا یہ چراغ ۱۹/اکتوبر ۲۰۰۸ میں آسودۂ خواب ابدی ہوا۔

پروفیسر حنیف نقوی

پروفیسر سید حنیف نقوی ہمارے عہد کے ممتاز محقق اور دانشور ہیں۔ ان کا شمار نہایت محتاط محققین میں ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع، حافظہ قوی اور نظر بڑی دور بیں ہے وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین نے ان کے تحقیقی کاموں کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کے طریقۂ استدلال اور استنباط نتائج کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے۔ بہ حیثیت محقق انہیں اس وقت اور بھی اہمیت حاصل ہوگئی جب ان کا تحقیقی مقالہ ''شعرائے اردو کے تذکرے'' کے نام سے مستقل کتاب کی صورت میں ۱۹۷۶ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا اور اس وقت سے صف اول کے محققین نے ان کے تحقیقی کام کی قدر و قیمت کا واقعی اندازہ لگایا۔

پروفیسر سید حنیف نقوی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو نہایت تابناک ہے گویا پوری شخصیت کو ایک ایسے بقعہ نور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی روشنی علم و دانش کے متلاشی لوگوں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔ نام و نمود اور ظاہری کر و فر سے انہیں کوئی لینا دینا نہیں جو چیز جیسی ہے اس کو ویسا ہی کہنے کی عادت ہے۔ اس طرح کی بے شمار صفات ہیں جو صرف پروفیسر سید حنیف نقوی کے ساتھ خاص ہیں۔ ہندوستان میں اردو تحقیق کی روایت اصل میں بڑی مضبوط و مستحکم ہے، حافظ محمود شیرانی سے لے کر قاضی عبدالودود اور پھر رشید حسن خاں تک، ہمارے برگزیدہ محققوں نے علمی تذکروں اور تحقیق کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ اس روایت کو آگے بڑھانے والوں میں پروفیسر سید حنیف نقوی کا نام بھی نمایاں ہے۔(۲۶)

پروفیسر سید حنیف نقوی ایک علمی خانوادے میں ۷ا/اکتوبر ۱۹۳۶ کو سہسوان ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ والد محترم کا نام حکیم سید عقیل احمد تھا۔ نشوونما اور تعلیم وتربیت نانا منشی شاکر حسین نکہت کے زیر سایہ پائی۔ قرآن شریف اور اردو و ریاضی کی ابتدائی کتابیں مدرسہ اسلامیہ، ملاٹولہ میں پڑھیں۔ عربی صرف ونحو کی تعلیم مدرسہ فیض عام میں حاصل کی۔ نانا مرحوم کی حیثیت ایک مکمل استاد کی تھی جنہوں نے بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ عربی کی بنیادی درسیات کو پڑھایا۔ عصری تعلیم کا باقاعدہ انتظام خالو سید عبد الملک نقوی کی توجہ سے ۱۹۵۰ میں شروع ہوا۔ ۱۹۵۵ میں پنالال میونسپل ہائی اسکول (موجودہ انٹر کالج) چھٹے درجہ میں داخلہ لیا اور اسی اسکول سے الہ آباد بورڈ کے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن اور فارسی و اردو میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔

پروفیسر سید حنیف نقوی ۱۹۵۹ میں وکرم یونیورسٹی اجین سے بی اے فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا۔ ۱۹۶۱ میں اسی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا۔ ۱۹۷۳ میں ایم اے (فارسی) بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس سے فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا اور اس طرح ایک الگ ریکارڈ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۸ میں وکرم یونیورسٹی اجین سے (اردو کے تذکروں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ) کے موضوع پر پی، ایچ، ڈی کی اہم ڈگری حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۶۱ سے ۱۹۶۲ کے تعلیمی سال کے اواخر میں چند مہینے سیفیہ انٹر کالج، بھوپال میں بطور اسسٹنٹ ٹیچر کام کیا۔ اس کے بعد ۱۴/جولائی ۱۹۶۲ سے ۱۳/دسمبر ۱۹۶۶ تک اسلامیہ انٹر کالج، بریلی میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دی۔ ۱۶/دسمبر ۱۹۶۳ سے ۱۵/دسمبر ۱۹۶۶ تک یو۔ جی۔ سی کے اولین جونیر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے گورنمنٹ حمیدیہ کالج، بھوپال سے وابستہ ہوئے۔ یکم فروری ۱۹۶۸ سے ۳۱/جولائی ۱۹۶۹ تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے فرائض انجام دئے۔ ۴/فروری ۱۹۷۰ کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی، فارسی واردو میں لکچرر مقرر ہوئے۔ ۳ فروری ۱۹۸۲ سے ۲/فروری ۱۹۹۰ تک بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بطور ریڈر کام کیا۔ ۳/فروری ۱۹۹۰ سے ۳۱/دسمبر ۲۰۰۰ تک شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں بہ حیثیت پروفیسر تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ اور اس طرح ۳۱/دسمبر ۲۰۰۰ کو درس وتدریس کی طویل

خدمات کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر حنیف نقوی تحقیق کے مرد میدان ہیں۔ان کا تحقیقی شعور نہایت پختہ ہے۔وہ ہر بات کو چھان پھٹک کر اور خوب ٹھونک بجا کر لکھتے ہیں۔کسی بھی بات کو تاریخی اور واقعاتی کسوٹی پر خوب کس کر تحریر کرتے ہیں۔کسی قلم کار کی بات یا تحریر پر آنکھ بند کر کے عمل نہیں کرتے۔ بلکہ وہ زیر بحث مسئلے کے جملہ پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرتے ہیں نیز اس تعلق سے تمام جزئیات پر مکمل یک سوئی سے ساتھ مطالعہ، محاکمہ اور تحقیق کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس کے بعد کہیں جاکے اپنے قلم کو قرطاس کے سپرد کرتے ہیں۔ایسا کرنے میں چاہے کتنا وقت لگ جائے یا کتنی ہی محنت کرنی پڑے اس کی ان کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور نہ ہی جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی باتیں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔(۲۷)

پروفیسر حنیف نقوی صاحب کی متعدد تحقیق اور تنقیدی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔اردو کے اہم محققین جن کا نام انگلیوں ں پر گنا جا سکتا ہے پروفیسر حنیف نقوی ان میں سے ایک ہیں۔ برصغیر میں ان کی نگارشات نے ان کو شہرت دوام بخشا ہے اور ارباب علم وادب میں ان کو بڑے عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے بطور خاص غالب کے حوالے سے ان کی ایک الگ شناخت ہے نیز طلباء واساتذہ میں ان کو یکساں مقبولیت حاصل ہے

پروفیسر حنیف نقوی صاحب کو ان کی نگارشات کے لیے مختلف اداروں اور اکیڈمیوں کی طرف متعدد اہم اعزازات وانعامات سے نوزا گیا ہے جن میں چند اس طرح ہیں:

۱۹۷۷ میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے آپ کی کتاب ''شعرائے اردو کے تذکرے پر ایوارڈ دیا گیا۔

۱۹۸۸ میں اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ان کی کتاب ''تلاش وتعارف'' پر ایوارڈ دیا۔

اسی اکیڈمی نے ان کی کتاب ''غالب، احوال وآثار'' پر ۱۹۹۱ میں ایوارڈ دیا۔

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال نے ۹۹۔۱۹۹۸ میں قومی سطح کا کوثر چاند پوری ایوارڈ عطا کیا۔

بہار اردو اکیڈمی پٹنہ نے 'میر و مصحفی' پر ۲۰۰۵ میں ایورڈ دیا۔

آل انڈیا میر اکیڈمی نے ۱۹۹۲ میں 'افتخار میر' کے ایوارڈ سے نوازا۔

اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ نے ۲۰۰۶ میں قومی سطح کے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ یہ ایوارڈ پوری زندگی کی ادبی خدمات کے پیش نظر دیا گیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر سید حنیف نقوی کو مختلف اعزازات ان کے ہمہ جہت کارناموں کی وجہ سے پیش کئے گئے ہیں۔

پروفیسر سید حنیف نقوی مختلف علمی، ادبی اور دانشگاہوں/اداروں کے رکن بھی رہے ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، وکرم یونیورسٹی اجین، کان پور یونیورسٹی کان پور، اودھ یونیورسٹی فیض آباد، اردو، عربی و فارسی یونیورسٹی پوروانچل یونیورسٹی جون پور، اردو ونوبا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ (جھارکھنڈ) وغیرہ اہم ہیں۔ ان کی اہم کتابیں حسب ذیل ہیں۔

تصنیفات وتالیفات

(۱) شعرائے اردو کے تذکرے: ۱۹۷۶

(۲) انتخاب کربل کتھا: ۱۹۸۳

(۳) تلاش وتعارف؛ ۱۹۸۷

(۴) انتخاب کلام رجب علی بیگ سرور: ۱۹۸۸

(۵) غالب۔ احوال وآثار: ۱۹۹۰

(۶) رجب علی بیگ سرور۔ چند تحقیقی مباحث: ۱۹۹۱

(۷) آثار غالب (غالب کی کم یاب نظم ونثر کا مجموعہ) ۲۰۰۰

(۸) مرزا غالب کے پنج آہنگ کا قدیم ترین خطی نسخہ (عکسی ایڈیشن) ۱۹۹۷

(۹) دیوان ناسخ (عکسی ایڈیشن) ۱۹۹۷

(۱۰) رائے بینی نرائن دہلوی (سوانح وادبی خدمات) ۱۹۹۷

(۱۱) میر ومصحفی (مجموعہ مقالات) ۲۰۰۳

(۱۲) غالب کی چند فارسی تصانیف: ۲۰۰۵

(۱۳) غالب کی فارسی مکتوب نگاری: ۲۰۰۸

(۱۴)تحقیق وتدوین۔مسائل اور مباحث (مجموعہ مقالات) ۲۰۱۰

(۱۵)تذکرۂ شعرائے سہسوان: ۲۰۱۰

(۱۶)حیات العلماء: ۲۰۱۰(۲۸)

قاضی عبدالودود

قاضی عبدالودود نے اردو ادب میں تحقیق کی روایت کو فروغ دیا۔اس کے آداب کی پاسداری کا سلیقہ سکھایا اور حق گوئی و بیبا کی کا درس دے کر ادب میں حق و باطل کا التباس و یقین اور سیاہ و سفید کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کا ہنر آشکار کیا ہے۔قاضی عبدالودود ایک اصول پسند اور سخت گیر محقق ہیں اور راست گفتاری اور حقیقت پسندی سے کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔گیان چند جین نے انہیں ''بت شکن محقق'' کے نام سے یاد کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قاضی عبدالودود نے اردو ادب کے بہت سے ایسے بتوں کو توڑا ہے جن کی عظمت و برگزیدگی مسلمہ تھی اور ان کا فرمایا ہوا مستند تصور کیا جاتا تھا۔

قاضی عبدالودود ۱۸۹۷ میں ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم خاندانی دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔رواج کے مطابق عربی، اردو اور فارسی پڑھی۔اسی کے ساتھ قرآن کریم بھی حفظ کرنا شروع کیا اور چودہ سال کی عمر میں مکمل قرآن حفظ کر لیا۔اس کے علاوہ عربی صرف ونحو، شرح کافیہ، شرح وقایہ، مختصر المعانی وغیرہ بھی پڑھیں۔بعد ازاں مذہبی تعلیم کو ترک کر کے مغربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ابتدا گھر پر انگریزی سے ہوئی۔پھر محمڈن اسکول میں درجہ پنجم میں داخل ہوئے اور ایک سال بعد علی گڑھ چلے آئے اور سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں درجہ سوئم میں داخل ہوئے۔اس کے بعد قاضی صاحب نے فیصلہ کیا کہ اعلی تعلیم وہ انگلینڈ جا کر حاصل کرینگے چنانچہ انہوں نے اس کی تیاری بھی شروع کر دی۔اس وقت بلگرامی ٹیوٹوریل کالج اس سلسلہ میں اچھا کام کر رہا تھا۔قاضی عبدالودود نے اس کالج میں داخلہ لے لیا۔یہاں لاطینی، جرمنی، اور فرانسیسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں یہاں قاضی صاحب خوب دلجمعی سے حصول علم میں مشغول ہوگئے۔

۱۹۱۶ میں قاضی عبدالودود نے میٹرک کا امتحان دیا۔۱۹۲۰ میں امتیاز کے ساتھ بی،اے کی ڈگری حاصل کی مارچ ۱۹۲۳اعلی تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور بیرسٹری کے مڈل لیمپ میں داخل ہوئے۔۱۹۲۹ میں پٹنہ واپس آئے اور علم وادب کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔انگلستان اور دوسرے مقامات پر بھی ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور بار باران کو اسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔بہر حال کیمبرج سے معاشیات میں ٹرائی پوس کیا اور بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا تھا لیکن ہندوستان واپسی پر صحت کی خرابی کے باعث ملازمت نہیں کی ۔ قاضی عبدالودود عربی و فارسی کے علاوی انگریزی اور فرانیسی کے ذخائر کا بھی بغائر مطالعہ کیا تھا جس سے ان کی نظر کو وسعت اور دانشوری کو تقویت ملی۔انہیں تاریخ سے دلچسپی تھی۔وکالت کی تعلیم نے ان پر الفاظ کے برمحل استعمال اور اس کی معنوی قدر و قیمت کی اہمیت منکشف کر دی تھی۔ بہر حال قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی تمام توانائیاں اور اپنی پوری زندگی تحقیق کے لیے وقف کر دی تھی جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔اور صحیح بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اردو تحقیق کو جتنا متاثر کیا اتنا شاید کسی اور نے نہیں کیا ان کی متعدد کتابیں (مکمل تدوین و نیم تدوین) اہل علم کے مابین سند کا درجہ رکھتی ہیں اور برصغیر میں جن کی بڑی اہمیت و وقعت ہے۔ان کی کتابوں کی بڑے پیمانے پے پزیرائی ہوئی۔کتابوں کے مطالعے سے ان کے تحقیقی ذوق، تبحر علمی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہاں یہ بھی کہنا شاید نامناسب نہیں ہوگا کہ قاضی عبدالودود صاحب کا زیادہ تر علمی تحقیقی کام دوسروے مصنفین و مؤلفین کی لغزشوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی پر مبنی ہے۔دراصل جب وہ کسی تصنیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس موضوع پر تسامحات سے صرف نظر نہیں کرتے بلکہ مختلف حوالوں سے اس کی نشاندہی کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔اور ایسا کرنے میں سامعین کی معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ کچھ نئے انکشافات بھی سامنے آتے ہیں ۔بہر حال ان کی کچھ اہم کتابیں حسب ذیل ہیں۔(۲۹)

(۱) دیوان جوشش: ۱۹۴۱

(۲) دیوان رضا:۱۹۵۹

(۳) قطعات دلدار ۱۹۵۹

(۴) سفر آشوب قلق ۱۹۶۰

(۵) کلام شاد ۱۹۲۳

(٦) شاہ کمالی کمال کا کلام ۱۹۴۲۔۱۹۴۱

(۷) مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق ۴۷۔۱۹۴۱

(۸) ارمغان بہار ۱۹٦۲

(۹) تذکرہ ابن امیں اللہ طوفان ۱۹۵۴

(۱۰) تذکرہ میر حسن ۱۹۳۹

(۱۱) تذکرہ مسرت افزا ۱۹۵۴

(۱۲) خلاصۂ تذکرۃ الاکابر

(۱۳) مآثر غالب ۱۹۴۹

(۱۴) کچھ غالب کے بارے میں

(۱۵) غالب بہ حیثیت محقق

(۱٦) قاطع برہان ورسائل متعلقہ ۱۹٦۷

(۱۷) پٹنہ ہرکارہ نومبر ۱۹۵۹

(۱۸) اردو شعر و ادب چند مطالعے

(۱۹) دیوان نعیم دہلوی

(۳۰) درد و سودا

قاضی عبدالودود نے عبدالحق کی مرتب کردہ ''ذکر میر''، ''انتخاب میر''، ''انتخاب کلام میر'' ''نکات الشعراء''، ''گلشن ہند''، ''خطبات گارساں دسائی'' وغیرہ کتابوں کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور اپنی قیمتی رائے سے بھی نوازہ ہے۔ ''غالب بحیثیت محقق'' میں قاضی عبدالودود نے ''قاطع برہان'' کے سلسلے میں مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی تائید میں لکھے جانے والے رسالوں میں غلطیوں اور تسامحات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس تعلق سے فارسی پر ان کے عبور نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ قاضی عبدالودود نے ''جہان غالب'' کے نام سے بھی چند مضامین سپرد قلم کئے ہیں۔ یہ مضامین اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان میں

مختلف الفاظ لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ غالب نے ان کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔(۳۰)

قاضی عبدالودود کے دوسرے موضوعات پر دیگر اہم کتابوں کے علاوہ غالب کے بارے میں چار تحریریں ملتی ہیں ''کچھ غالب کے بارے میں'' (دو جلدیں) ''جہان غالب'' ''غالب بہ حیثیت محقق اور ''مآثر غالب''۔ یہ کتابیں غالب پر کام کرنے والوں کے وہ علمی خزانہ ہے کہ اس کی اہمیت جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں وہ تحقیقی امور ہیں جو غالب کی حیات اور کلام کے سلسلے میں حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کتابوں کے مجموعی صفحات ۱۲۰۶ ہیں میرا خیال ہے کہ ہر صفحہ اپنے طور پر اتنی اطلاعات بہم پہنچاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کی ایک شخص نے دوسرے موضوعات کو بھی اپنے دائرۂ کار میں رکھا ہے کس طرح اتنے مشکل مراحل سے گزر کر غالب سے متعلق اتنی گتھیاں سلجھائیں ہیں۔

تذکروں سے متعلق قاضی عبدالودود کی معلومات بڑی وسیع اور غیر معمولی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے بہت کم مصنفین اس میدان میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''تذکرہ میر حسن'' ''تذکرہ مسرت افزاء''، ''خلاصۃ تذکرہ الاخبار'' اور ''تذکرہ شعراء مصنفہ ابن امین طولان'' وغیرہ اہم کتابیں جو انہوں نے مرتب کی ہیں بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ قاضی عبدالودود ایک بلند پایہ کے محقق ہیں۔ انہوں نے تحقیق کو ایک فن بنا کر پیش کیا ہے اور ان کی تحریروں کی وجہ سے بہت سے مصنفین تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے محققین کو حزم واحتیاط کا بھی درس دیا۔

قاضی عبدالودود نے ۱۹۳۶ میں ''دیوان جوشش'' مرتب کر کے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''دیوان جوشش'' کی قرأت میں بڑی محققانہ مہارت دکھائی ہے اور یہ کام قاضی عبدالودود جیسا بلند پایہ محقق ہی کر سکتا ہے۔ اس کتاب کے حواشی بھی بڑی عرق ریزی اور انہماک سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں جوشش کے حالات بتائے گئے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جوشش ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیان مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور ۱۲۱۶ھ تک بقید حیات رہے۔ سچی بات تو یہ ہے موجودہ وقت میں اسی نوعیت کا کام ہونے کی ضرورت ہے۔ تاکہ تحقیق وتنقید کے میدان میں کچھ نئی چیزیں بھی سامنے آسکیں۔

(۳۱)

تحقیق میں قاضی عبدالودود کا نام بہت بڑا ہے اور یقیناً ان کا کام بھی اسی نوعیت کا ہے۔قاضی صاحب کے ساتھ یہ ہوا کہ انہوں نے دوسروں کی کمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی میں زیادہ وقت صرف کر دیا اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ خود تحقیق کے لیے بہت سا وقت نہیں نکال سکے۔اگر منصوبہ بند طریقے سے وہ کوئی (تحقیقی وتنقیدی) کام کرتے تو شاید آج ہمارے درمیان ان کی کچھ وقیع واہم نگارشات منظر عام پر آتیں جو علمی وادبی دنیا کے کئے اور سود مند ثابت ہوتیں ان سب کے باوجود ان کا کارنامہ بہت بلند و معیاری ہے۔انہوں نے اردو کے محققین کو فکری تنظیم سے آشنا کیا۔ان کی سخت گیری اور حق گوئی اردو کے محققین کے حق میں مفید ثابت ہوئی اور انہوں نے آداب تحقیق اور آئین تحقیق سکھائے اور اردو کو علمی وقار سے بھی آشنا کیا۔

فن تحقیق میں مختارالدین آرزو کا مرتبہ

ہندوستان میں بہت کم ایسے اردو محقق دکھائی دیتے ہیں ہیں جن کا اردو کی تدریس سے بہت زیادہ رابطہ نہیں رہا اور جنھوں نے کبھی ایم.اے اردو کو بھی نہیں پڑھایا لیکن جب اردو تحقیق کی خدمت کی بات کی جاتی ہے تو ان کا نام نامی بڑے ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔ڈاکٹر مختارالدین احمد بھی ان خوش نصیب لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کی تحقیقی خدمات کا دائرہ تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ان کی خدمات کے پیش نظر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے انھیں ۱۹۸۳ء میں غالب انعام برائے تحقیق دیا۔

میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ تحقیق کے شعبوں میں تدوین ایک مشکل ترین کام ہے اور ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اسی کو اپنایا ہے۔تنقید کے ایک انداز کو تخلیقی تنقید کہا گیا ہے۔ڈاکٹر مختارالدین کو تخلیقی تدوین کا کارگزار قرار دیا جا سکتا ہے۔انھوں نے بہت سے ایسے متون مرتب کیے ہیں جن کی دریافت کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے ۔ان سے پہلے دوسروں نے بھی یہ کام کیا ہے مثلاً عرشی صاحب نے تذکرۂ دستورالفصاحت اور مسعود حسن رضوی صاحب نے تذکرۂ نادر تعمیر کیے ہیں، لیکن مختار صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے کوئی ایسا متن مرتب نہیں کیا جو عام طور سے دستیاب ہو۔ ان کے سوانح کا مطلاعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب یہ ایم.اے عربی کے طالب علم تھے، انھوں نے بحیثیت ایڈیٹر علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء جلد:۲۴، نمبر:۱ مرتب کی۔اس کے شذرات پر ۷رنومبر ۱۹۴۸ء کی تاریخ درج ہے۔شذرات میں ہندو پاک کے اردو رسائل علی گڑھ کے اساتذہ، بالخصوص شعبۂ عربی کے اساتذہ کی

تصانیف کا اس شرح وبسط سے ذکر کیا ہے ۔مندرجات کے مطالعہ سے ان کے تحقیقی رجحان کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے ۔اس شمارے میں پروفیسر مختار الدین آرزو کا ایک وقیع مضمون ہے 'اشعارِ میر پر ایک نظر' یہ مضمون تحقیقی نہیں تنقیدی ہے۔

اگلے سال جب انھوں نے عربی ریسرچ میں داخلہ لیا، تو دوبارہ ایڈیٹر مقرر کیے گئے اور تاریخ ساز پرچہ 'علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء جلد:۲۴، نمبر:۲ شائع کیا۔ یہ شمارہ تحقیق وتنقید غالب میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے ساتھ مختار الدین احمد آرزو ایک اچھے محقق کی حیثیت سے بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں ۔ان کی تحقیقی صلاحیت ان کے مضمون نوادرِ غالب سے ہی ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس سب سے بدر جہا بہتر علی گڑھ میگزین کے لیے تحقیقی مواد جمع کرنے سے ظاہر ہوئی ہے ۔اس کے مشمولات کی فہرت میں یہاں درج کرتا ہوں جس سے اس میگزین کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۳۔ برہانِ قاطع کا قضیہ	مولوی مہیش پرشاد
۱۴۔ غالب کی شخصیت	شوکت سبزواری
۱۵۔ غالب کے خطوط	مفتون احمد
۱۶۔ غالب کا الہامِ شعروادب	عبدالمالک آروی
۱۷۔ کیا غالب کا کلام الہامی ہے؟	شہناز ہاشمی
۱۸۔ غالب بحیثیت محقق	قاضی عبدالودود
۱۹۔ غالب کی عشقیہ شاعری	عبادت بریلوی

تنقید وتبصرہ:

تبصرۂ فرہنگ غالب	قاضی عبدالودود

ضمیمہ:

مآثر غالب:

یہ اہم میگزین ۲۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس غالب نمبر میں تمام ارباب علم وادب کی نمائندگی ہوئی ہے ظاہر ہے یہ اس ایڈیٹر کے لئے بڑے فخر کی بات ہے یہ الگ بات ہے کہ مضامین کے حاصل کرنے میں نگراں رشید احمد صدیقی کا خاص ہاتھ رہا ہوگا لیکن مدیر کو اس کی تحسین سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق غالب کے بیش تر اہم موضوعات اس شمارے میں کھل کر زیر بحث آگئے ہیں۔ان کے علاوہ مدیر نے غالب کے سات خطوط اور ان کی چند قدیم دوسری تحریرون کا عکس، نیز غالب کی کتب خانہ، حبیب گنج کی تصویر بھی شائع کی ہے۔ان سب پر مستزاد ہے۔قاضی عبدالودو کا رسالہ آثارِ غالب جس میں غالب کی متفرق نادر تحریریں اور خطوط شامل ہیں۔

یہی نوعیت مختار الدین احمد کے مضمون نوادرِ غالب کی ہے۔میگزین کے شذرات میں لکھتے ہیں:

> ''نوادرِ غالب کے نام سے ایک ایسا ہی مجموعہ راقم الحروف کے زیرِ ترتیب ہے ،جس میں مرزا کے وہ رسالے ،

رقعات اور خطوط شامل ہیں جو اب تک کسی مجموعے میں نہیں آئے
ہیں ۔لیکن پرانے اخباروں ،رسالوں ،بیاضوں یا قدیم مجموعوں
میں موجود ہیں۔اس مجموعے کے چند خطوط آئندہ اوراق میں آپ
ملاحظہ فرمائیں گے۔''

علی گڑھ میگزین غالب نمبر کی ایک اور خاص بات جو سامنے آئی وہ یہ کہ اس کی وجہ سے مختار صاحب کے مرتب دو اور مجموعے منظر عام پر آئے ۔میگزین کی اہمیت کے پیشِ نظر انجمن ترقی اردو ہند نے فیصلہ کیا کہ اسے دوبارہ کتابی شکل میں ترمیم و اضافے کے بعد شائع کیا جائے ۔انجمن کے ذمہ داروں نے مختار صاحب کو مامور کیا کہ مضامین میں ترمیم اور اضافہ کرائیں ،جس کے بعد مجموعہ تین جلدوں میں شائع کیا جائے۔پہلی جلد احوالِ غالب میں غالب کی زندگی سے متعلق مضامین ہوں،دوسری جلد نقدِ غالب میں تنقیدی مضامین ہوں ،اور تیسری جلد گنجینۂ غالب میں متفرق خطوط واشعار وغیرہ ہوں۔چنانچہ ایسا ہی ہوااور ایک طویل محنت ومشقت کے بعد تین مجموعے سامنے آئے ان کی الگ الگ تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

احوالِ غالب:

اس کی پہلی اشاعت ۱۹۵۳ء میں اور دوسری ۱۹۸۶ء میں ہوئی ۔انجمن کے سکریٹری قاضی عبدالغفار نے مختار صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ مضامین میں ترمیم واضافہ کرایا جائے ۔بعض مضمون نگاروں نے ایسا کیا۔بعض نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے ہر ایک کے سامنے اپنے اپنے مسائل رہے ہونگے بہر حال اس مجموعے میں ۱۸ مضامین ہیں جن میں سے محض چھ میگزین سے ماخوذ ہیں۔

۱۔مرزا غالب از مالک رام۔
۲۔غالب کی خاندانی پنشن از مہر۔
۳۔دہلی سوسائٹی از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔
۴۔ہرمزو ثم عبدالصمد از قاضی عبدالودود۔

۵۔امراؤ بیگم از حمید احمد خان۔

۶۔باقر علی خان کامل از حمیدہ سلطان۔

اس میگزین میں حسب ذیل کے بارہ مضامین بعد کا اضافہ ہیں جو اس طرح ہیں:

۱۔غالب اور علی گڑھ از رشید احمد صدیقی۔

۲۔غالب کے حالات میں پہلا مضمون از مسعود حسن رضوی۔

۳۔غالب کے خود نوشت حالات از اظہار الحق ملک۔

۴۔مرزا غالب کا نسب نامہ از قمر الدین راقم۔

۵۔سرِّ غالب در حدیث دیگراں از مختار الدین احمد۔

۶۔غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک از حمید احمد خان

۷۔روئداد مقدمۂ مرزا غالب از مولوی عبد الحق۔

۸۔معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل از خواجہ احمد فاروقی۔

۹۔مرزا غالب کی تصویریں از مختار الدین احمد۔

۱۰۔من کیستم از قمر الدین راقم۔

۱۱۔خواجہ قمر الدین راقم از مرزا رفیق بیگ۔

۱۲۔غالب کے چند اعزہ ناظمہ بیگم پروین۔

جب ہم اس میگزین ے مضامین پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے چار مضامین خاص اس مجموعے کے لیے لکھے گئے ۔بعض لوگوں نے اپنے پرانے مضامین میں اضافہ کر کے دیا۔اب معلوم ہوا کہ احوالِ غالب میں علی گڑھ میگزین کا محض ایک تہاء یمواد پرانہ ہے،اور دو تہائی مواد نیا ہے۔۔ مختار صاحب مضامین کی کتابت کرا کے دیباچہ لکھوا کر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں آکسفرڈ چلے گئے ۔اسی سال یہ کتاب شائع ہوگئی۔

مجموعے میں مختار صاحب کے دو مضامین ہیں۔ان کا طویل مضمون 'سرِّ غالب در حدیثِ دیگراں' ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مختلف کتابوں اور تحریروں سے وہ حصے نقل کیے گئے ہیں جو غالب سے

متعلق ہیں ۔ ان میں مضمون نگار نے تحقیق کی جو داد دی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ اقتباسات ،معلومات افروز بھی ہیں، دلچسپ بھی ۔ ان میں متعدد ایسی معلومات ہیں جو آج بھی عام قاری کے لیے نئی ہیں ۔ ان میں صفیر بلگرامی کے جلوۂ خضر کا بھی طویل اقتباس ہے ۔ صفیر کسی طرح معتبر راوی نہیں ۔ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے کچھ بھی وضع کر سکتے تھے ۔ اس لیے ان کی روایت کے انھیں بیانات کو انھوں نے قبول کیا ہے جو درایت پر پورے اُترتے ہوں ۔

دوسرا مضمون 'غالب کی تصویریں' میگزین غالب نمبر کے شذرات میں غالب کی تصویروں پر ڈیڑھ صفحہ کا نوٹ تھا اور ایک تصویر شائع کی تھی ،مختار صاحب نے رسالہ آج کل غالب نمبر ۱۹۵۲ء میں اس موضوع پر ایک مستقل مضمون لکھ دیا۔ احوالِ غالب میں مزید معلومات کی بنا پر پھر سے اضافے کیے اور غالب کی آٹھ تصویریں پیش کیں جن میں سے چھے اصلی اور دو جعلی ہیں ۔ ان دو محققانہ مضامین کو شامل کر کے مختار صاحب نے مرتب کہلانے کا استحقاق کماحقہٗ حاصل کر لیا۔ اس کا بھر پور ثبوت ان کے دونوں شامل مضامین ہیں کی دونوں مضامین کے مطالعہ سے ہوتا ہے ۔ احوالِ غالب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ۔ا

نقدِ غالب:

احوالِ غالب کے دیباچے میں پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب نقدِ غالب کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں ہیں:

> ''آج کل اس کے آخری اجزا کے پروف دیکھے جا رہے ہیں اور امید ہے یہ کتاب دو ماہ میں شائع ہو جائے گی ۔'' (ص:۱۳)

لیکن اس کی اشاعت جون ۱۹۵۶ء میں ہوئی ۔ دراصل ہوا یہ کہ مختار الدین احمد اکتوبر ۱۹۵۳ء میں انگلستان چلے گئے اور ۲۱ /اپریل ۱۹۵۶ء کو ہندوستان واپس آئے ۔ ارادہ ضرور رہا ہوگا کہ یہ مجموعہ بھی ۱۹۵۳ء میں شائع ہو جائے لیکن اس میں قاضی عبدالودود کا مضمون غالب بحیثیت محقق شامل کرنا ضروری تھا کہ وہ احوال میں نہ آسکا تھا۔ بہر حال افسوس کہ اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی ۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مرتب کیسے بن سکتے ہیں سر اصل ہوا یہ کہ وہ اس مجموعے میں وہ اپنا ایک تنقیدی مضمون شامل کرنا چاہتے تھے جسے مکمل کر کے آکسفورڈ سے بھیجنا تھا۔ وہاں مصروفیت کے سبب پورا نہ کر سکے۔ پھر قاضی عبدالودود کے مضمون کے بارے میں آخر وقت تک نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ کہاں جا کر ختم ہوگا، اس لیے انھوں نے اپنا مضمون شامل کرنے کا ارادہ فسخ کر دیا۔ انھوں نے مجموعے کے لیے بعض مضمون نگاروں سے ان کے مضمون میں نظر ثانی کرائی ،بعض دوسروں سے نئے مضامین لکھوائے ،جن سب کی کتابت باستثنائے مضمون قاضی عبدالودود،۱۹۵۳ء ہی میں ہوگئی تھی۔ ان سب وجوہات کی بنا پر ان کو اس مجموعے کا مرتب قرار دیا گیا۔

کچھ لوگ نقدِ غالب کو علی گڑھ میگزین غالب نمبر کا نقشِ ثانی بھی جا تا ہے حالانکہ یہ قطعا مناسب نہیں ہے۔ اس کے ۱۴ مضامین میں سے محض حسب ذیل چار غالب نمبر سے لیے گئے ہیں:

(۱) غالب کی عظمت آل احمد سرور

(۲) غالب کی عشقیہ شاعری عبادت بریلوی

(۳) کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا رشید احمد صدیقی

(۴) غالب بحیثیت محقق قاضی عبدالودود

جہاں تک آخر الذکر مضمون کا تعلق ہے یہ برائے نام میگزین کے شمارے سے ماخوذ کہا جا سکتا ہے ۔نقد میں اس کی ضخامت میگزین کے مضمون سے بہت زیادہ ہے۔ اسے بھی نیا مضمون ماننا چاہیے۔ اس کی ضخامت پر مختار الدین احمد نے اپنے تنقیدی مضمون کو قربان کر دیا۔ یہ مضمون اور شیخ محمد اکرام کا مضمون یعنی دیوانِ ناظم میں غالب کا حصہ، تحقیقی ہیں اور نقدِ غالب کے عام رنگ سے بدرنگ بھی ہیں۔ نقدِ غالب کے ۱۲ نئے مضامین کے مصنفین حسب ذیل ہیں:

۱۔ احتشام حسین۔

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

۳۔ حمید احمد خان

۴۔ وحید قریشی،

۵۔ممتاز حسین

۶۔اختر اورینوی

۷۔اسلوب احمد انصاری

۸۔خلیل الرحمٰن اعظمی

۹۔شیخ محمد اکرام،

۱۰۔آفتاب احمد

آفتاب احمد کے علاوہ باقی سب اردو کے معروف ومشہور اہلِ قلم ہیں۔ان سب کے مضامین پر مشتمل مجموعہ مرتب کے لئے وجہ افتخار ہے۔

گنجینۂ غالب:

احوالِ غالب کے دیباچے میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ علی گڑھ میگزین غالب نمبر کے مضامین میں ترمیم وتنسیخ اوراضافے کے بعد ایک مجموعہ تین جلدوں میں تیار کیا جائے گا۔پہلی جلد احوالِ غالب ہوگی، دوسری نقدِ غالب اور تیسری گنجینۂ غالب۔آخر الذکر کی تفصیل دی ہے:

تیسری جلد گنجینۂ غالب زیرِ ترتیب ہے۔اس میں غالب کے غیر مطبوعہ خطوط اور اشعار شائع ہوں گے۔تصانیف کے قلمی ومطبوعہ نسخوں پر مضامین ہوں گے اور یادگارِ غالب سے ذکرِ غالب تک اب تک جتنی کتابیں غالب پر لکھی گئی ہیں ان سبھوں پر تبصرے کیے جائیں گے۔

علی گڑھ میگزین غالب نمبر میں اس قسم کا مواد غالب کے چند خطوط اور تحریروں کے عکس، مختارالدین صاحب کے مضمون نوادرِ غالب اور قاضی صاحب کے رسالہ نما مضمون 'آثارِ غالب' میں موجود تھا۔اب ذرا یہ دیکھ کر کہ علی گڑھ میگزین غالب نمبر کے کون کون سے مضمون ان مجموعوں میں جگہ نہ پا سکے:

ذیل کے مضامین تحقیقی ہیں، انھیں احوالِ غالب میں نہ لیا گیا۔

۱۔غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین — مولانا عرشی

۲۔لطائف غیبی اور غالب — عبدالمجید سالک

۳۔برہان قاطع کا قضیہ — مولوی مہیش پرشاد

۴۔تبصرۂ فرہنگ غالب قاضی عبدالودود

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب میں یہاں ان مضامین کا ذکر کیا کردوں جو تنقیدی مضامین نقدِ غالب میں شامل اشاعت نہ ہو سکے :

۱۔غالب کی شخصیت شوکت سبزواری

۲۔غالب کے خطوط (طرزِ تحریر اور پس منظر) مفتون احمد

۳۔غالب کا الہام شعروادب عبدالمالک آروی

۴۔کیا غالب کا کلام الہامی ہے؟ شہناز ہاشمی

ذیل کے دو مضامین باقیاتِ غالب پر مشتمل تھے۔ اگر مجموعہ گنجینۂ غالب زیور طباعت سے آراستہ ہوتا تو یقیناً اس میں شامل کیے جاتے:

۱۔نوادرِ غالب مختارالدین احمد

۲۔آثار غالب قاضی عبدالودود

خطوطِ اکبرالہ آبادی:

مختارالدین آرزو کے بعد شبیہ الحسن نونہروی علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔اور پروفیسر مختارالدین آرزو کے مشورے پر اکبرنمبر شائع کیا۔اس کے آخر میں مختار صاحب نے خطوطِ اکبر مرتب کر کے شامل کردیے۔ یہ خطوط غیر مطبوعہ تھے، یا پرانے اخبار ورسائل میں بکھرے ہوئے تھے اس طرح ان کی افادیت میں اضافہ ہوگیا اور استفادہ کی شکل اور آسان ہوگئی۔

تذکرۂ شعرائے فرخ آباد:

فارسی کتاب تاریخِ فرخ آباد از مفتی سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی کی۔مختار صاحب کے قول کے مطابق اس کی ابتدا ۱۲۴۳ھ میں یا اس سے کچھ پہلے اور تکمیل ۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔اس کا چوتھا مقالہ تذکرۂ شعرائے فرخ آباد پر مشتمل ہے۔اس تذکرے کو مختار صاحب نے اردوادب بابت جولائی ستمبر ۱۹۵۴ء میں شائع کردیا۔اس میں انھوں نے نمونے کے بعض اشعار کم کردیے جس کے بعد یہ کل ۶۱ صفحوں پر آیا۔ یقیناً یہ ایک اہم ترین تذکرہ ہے جس میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے ۹۵ شعرا کو شامل

کیا گیا ہے۔ جو کبھی فرخ آباد آئے تھے۔ کچھ شعرائے کرام کے نام حسب ذیل ہیں۔

()محمد صادق اختر، انشا

(۱) حجام۔

(۲) شاہ حسین حقیقت۔

(۳) سودا۔

(۴) میر سوز۔

(۵) محبت خان محبت۔

(۶) ظہور اللہ نوا۔

(۷) آصف الدولہ۔

(۸)، عمدۃ الملک امیر خاں انجام۔

اس اہم تذکرے کی دیگر خصوصیات میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں شعراء کے احوال عام طور پر اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

سیر دہلی:

مختار صاحب کے مرتبہ دیوانِ حضور کی ابتدا میں ان کی کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس میں سیرِ دہلی ۱۹۵۲ء بھی شامل ہے۔ اس کے مصنف شیخ محمد ریاض امجد سندیلوی نے محرم ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں دہلی کا سفر کیا اور اسی سال ۶۴ صفحات کا یہ سفرنامہ لکھ دیا۔ اس کا مختصر تعارف پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب کے مضمون ''سرِّ غالب درحدیثِ دیگراں'' میں آ گیا ہے۔ انھوں نے اس سفرنامے کو رسالہ 'صبح دہلی' ۱۹۶۲ء میں شائع کر دیا۔ کچھ نسخے فاضل نکلوا لیے تھے جنھیں کتابی شکل دے دی۔

کربل کتھا:

ڈاکٹر مختار الدین احمد کی تحقیق وتدوین دونوں کا اہم ترین نمونہ کربل کتھا ہے۔ تقریباً یہ متن ناپید سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بازیافت سے ادباء مایوس ہو چکے تھے۔ اس کا تعارف پہلی بار کریم الدین نے اپنے تذکرے ''طبقاتِ شعرائے ہند'' ۱۸۴۸ء میں کرایا اور پھر آزاد نے آبِ حیات میں کریم الدین کے منقولہ

ڈیڑھ دو صفحات کے علاوہ اس کتاب کا پتا نہ تھا اور عبدالودود نے فرمائش کی کہ کہیں سے ذخیرۂ اشپرنگر کا پتا چل سکے تو کربل کتھا ڈھونڈ نا۔ چنانچہ جب مختار صاحب دسمبر۱۹۵۴ء میں مغربی یورپ کے بہت سے کتب خانوں میں گئے۔ معلوم ہوا کہ جنگ کے دوران میں برلن کے کتب خانے کی کتابیں ماربرگ اور ٹیوبنگن بھیج دی گئی تھیں۔ انھوں نے پہلے ماربرگ کے تہ خانے میں ایک ہفتہ تک جملہ آٹھ نو ہزار کتابیں دیکھیں۔ ان میں کربل کتھا نہ تھی۔ ہائیڈل برگ جانے پر کسی کے خط سے پتا چلا کہ مخطوطہ اشپرنگر ممکن ہے ٹیوبنگن میں ممکن ہے موجود ہو۔ بہرحال یہ وہاں وہاں تشریف گئے اور چند گھنٹوں کی تلاش کے بعد کانپتے ہاتھوں سے کربل کتھا کا نسخہ اُٹھا کر دیکھا۔ ۲ رفروری ۱۹۵۵ء کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے ٹیوبنگن سے قاضی عبدالودود کو جو خط لکھا وہ اس طرح تھا:

> ’’وہ مجلس مل گئی... یہیں کے انبار میں دبی تھی۔ ایک تہ خانہ سا ہے جہاں برلن کا بقیہ ذخیرہ محفوظ ہے۔ وہیں پہنچ جاتا تھا اور کتابیں تلاش کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کوشش رائیگاں نہ گئی۔ تقطیع مختصر ہے اور تحریر بہت خوب صورت اور بہت واضح اور خوشی کی بات ہے کہ نسخہ مکمل اوراق ۲۶۱، سطور ۱۱..... وہ مجلس کے عکس پر مختصر تقطیع تقریباً سو مارکس اور متوسط تقطیع پر تقریباً دو سو مارکس خرچ ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ مختصر تقطیع سے کام چل جائے گا۔‘‘

شمالی ہند کی نثر کی قدیم ترین کتاب کو دریافت کرنا بے شک غیر معمولی تحقیق ہے اور مختار صاحب کے تحقیقی کارناموں میں ’’گلِ سرسبد‘‘ ہے۔ یہ صاحب حسبِ معمول اس نسخے کو لیے بیٹھے رہے۔ اس کی دریافت کے بارے میں کہیں ایک مضمون بھی نہ لکھا۔ اس کا حال سن کر دوسرے لوگوں نے موقع غنیمت جانا اور اس کا عکس حاصل کرلیا اور بڑی عجلت سے چھاپ دیا، لیکن چوں کہ کام مکمل نہ تھا اس لیے کتاب بازار میں نہیں دی۔ بعد مختارالدین احمد نے مالک رام صاحب کے ساتھ مل اس متن کو بے مثال انداز سے ترتیب دیا اور ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ سے اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کو وہ شہرت و ناموری حاصل ہوئی کہ کم کتابوں کے بارے میں ایسا دیکھا گیا ہے اس کی تدوین کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''کربل کتھا کی تدوین کے سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ اگر مالک رام صاحب مساعدت نہ کرتے اور ان کا لطف و کرم شامل حال نہ ہوتا تو شاید ہی یہ کتاب اتنے اچھے طریقے سے شائع ہوسکتی ۔ انھوں نے مصروفیات کے باوجود ایک متعدبہ حصے کی اصل مخطوطے سے نقل تیار کی ۔ مقدمہ بنیادی طور پر میرا لکھا ہوا ہے، کچھ حصے انھوں نے لکھے ہیں، زبان کی بحث ساری ان کے قلم کی ہے۔ طباعت کی ساری ذمے داری انھوں نے اٹھائی ۔ کاپیاں میں نے پڑھیں، پروف انھوں نے دیکھے ۔حواشی وتعلیقات میں نے لکھے اور متعدد فہارس میں نے مرتب کیے، لیکن جو کچھ میں کیا، اس پر آخری نظر مالک رام صاحب نے ڈالی ہے۔اس کتاب پر ان کا نام بھی رہے، اس پر مالک رام صاحب کسی طرح تیار نہ تھے ۔ کہتے تھے: آپ کا کام ہے، تھوڑی بہت مدد اہلِ قلم کی تو کرنی چاہیے۔ دراصل میرے اصرار پر وہ راضی ہوئے تھے۔''

ایک اچھی تدوین کی پہچان یہ ہے کہ اس کے شروع میں ایک تحقیقی مقالہ ہو، پھر متن کومختلف نسخوں کی مدد سے اصولِ تدوین کے مطابق مرتب کیا گیا ہے ۔ اس کے آگے اختلافات نسخ، حواشی، فرہنگ اشاریہ اور دیگر ضروری تفصیلات ہوں ہو۔ میرا اپنا خیال ہے کہ کربل کتھا کا مقدمہ جس کا زیادہ تر حصہ مختارالدین کا لکھا ہوا ہے، ہر اعتبار سے جامع و مفید ہے ۔ چوں کہ کتاب کا ایک ہی نسخہ ملتا ہے اس لیے متن کو صحت سے پیش کرنا ایک بہت بڑا چیلنج تھا خاص طور پر اس وقت جب کہ اس کی زبان فرسودہ، اور نا قابل خواند ہو ۔خوش قسمتی سے دونوں مرتب عربی کے عالم تھے واحد نسخے کی وجہ سے اختلاف نسخ کا سوال ہی نہیں ۔قرأت کی تصحیح ہر صفحے کے نیچے فٹ نوٹ میں دی گئی ۔ حواشی بھی فٹ نوٹ میں ہیں۔ اختتامی اجزا میں سب سے پہلے عربی عبارتوں اور فقروں کی فرہنگ ہے جس میں اردو ترجمے کے علاوہ یہ بھی نشان دہی کی ہے کہ یہ عبارت کہاں سے ماخوذ ہے ۔ پھر چار صفحوں میں فہرست مآخذ حواشی ہے

۔ بالفاظ دیگر یہ کتابیات ہے جسے کتاب کے آخر میں آنا چاہیے تھا۔ اس سے قطع نظر کتابوں کے نام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مختار صاحب نے کتنی تحقیق و تدقیق کی ہے ۔ اس کے آگے اعلام، اُمم وقبائل، غزوات وایام، بلاد واماکن، متعلقہ آیات قرآنی، احادیثِ نبوی، اقوال وحکم، کتب ہیں۔ ان سے مرتب کے علم و فضل اورعرق ریزی کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ تمام اندراجات مالک رام صاحب کی نظر سے بھی گزر چکے ہیں۔ اس طرح ہم بہ اطمینان کہہ سکتے ہیں کہ کربل کرکتھا کی تدوین مثالی معیار کی ہے۔ اس کارنامے نے مختارالدین صاحب کو اردو تحقیق میں پایۂ اعتبار عطا کیا۔ اور آنے والے اسکالروں اور محققین کے لئے مشعل راہ بھی ثابت ہوا

گلشنِ ہند یعنی تذکرۂ حیدری:

مختارالدین احمد اہم، ویاناب متون کو ایڈٹ کرنے میں لاجواب شخصیت کے مالک دکھائی دیتے ہیں ۔ کربل کتھا کے علاوہ حیدر بخش حیدری کا تذکرہ گلشنِ ہند بھی دریافت کر کے شائع کیا۔ حیدری کے تذکرے کا متن ملنا تو در کنار، اس کا ذکر بھی نہایت شاذ ہے ۔ مختار صاحب نے ۱۹۵۳ء میں بوڈلین لائبریری، آکسفرڈ میں اس کا نسخہ جگہ جگہ تلاش کیا، اس کی عدم اطلاع پر اپنے عربی کے پروفیسر سے ذکر کیا وہ بھی کئی ماہ کی جستجو کے بعد کہیں سے گلدستۂ حیدری کا نسخہ نکال لائے اس میں یہ تذکرہ مکمل موجود ہے ۔ مختارالدین نے ۱۹۵۵ء میں اس کی نقل کر لی ۔ برٹش میوزیم لندن میں گلدستۂ حیدری میں یہ تذکرہ ناقص ہے یعنی میر سوز کے احوال تک ہے ۔ مختار صاحب نے لندن جا کر اس سے مقابلہ کر لیا۔ ہندوستان واپس آکر وہ حسبِ معمول برسوں لیے بیٹھے رہے۔ ایک عرصے کے بعد سرور صاحب سے اس کی اشاعت کا ذکر آیا تو کتابی شکل میں چھاپنے سے پہلے اردو ادب میں شائع کرنا آسان معلوم ہوا۔ یہ رسالہ اردو ادب شمارہ:۳، ۱۹۶۶ء کے سو صفحات کو محیط ہے ۔ رسالے میں زیادہ سمائی نہ ہوسکتی تھی اس لیے مرتب نے تمہید کا آخری حصہ، جس میں تذکرے پر گفتگو کی تھی ، نیز بعض حواشی قطع کر دیے، بعض دوسرے حواشی کو مختصر کر دیا۔ رسالے میں تذکرہ کتابی شکل میں ہے اور مالک رام صاحب کو معنون کیا گیا ہے ۔ اس سے بھی مختار صاحب کے بلند اخلاق کا پتہ چلتا ہے کہ کو اپنے ساتھ ساتھ مالک رام کو بھی شامل کیا ہے۔

مختار صاحب نے ابتدا میں تذکرے کے ۲۸۹ شعرا کی فہرست دی ہے ۔ پھر ایک تمہید ہے جس

میں حیدری، اس کی مختلف تصانیف اور تذکرے کی دریافت کی تفصیل ہے۔ ان تصانیف میں کئی ایسے ہیں جنھیں نایاب سمجھا جاتا تھا۔ حواشی فٹ نوٹ ہونے کی وجہ سے قاری کو بہت سہولت رہتی ہے۔ یہ حواشی بہت مفید ہیں۔ انھوں نے شعرا کے حالات کو دوسرے تذکروں میں مندرج احوال سے موازنہ کے کے پیش کیا ہے۔ حواشی کے ایک ایک جملے اور ایک ایک شعر کے لیے انھیں کتنی محنتِ شاقہ اور تحقیق و تدقیق کر پڑی ہوگی اس کا اندازہ حواشی پر نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے۔

تذکرۂ آزردہ:

مختارالدین احمد محض تدوینِ متن کے ساتھ ساتھ دریافت وانکشاف متن بھی کرتے۔ ان کے مرتبہ متون میں زیادہ تر ایسے ہیں جنھیں پہلے معدوم یا کمیاب سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک کارنامہ مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی کے تذکرے کی دریافت اور اشاعت ہے۔ آزردہ کے تذکرے کا ذکر صرف گلشنِ بےخار میں سودا کے احوال میں ملتا ہے۔۔ مختار صاحب نے اس تذکرہ کا ایک ناقص نسخہ کرسٹی کالج کیمبرج میں ڈھونڈھ نکالا۔ اس میں ابتدائی ۴۴ صفحات ہی ہیں جو قائم کے حالات کے بیچ ختم ہوجاتے ہیں۔ قائم ۲۶واں شاعر ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود اس ناقص الآخر تذکرہ کے کسی اور نسخے کا علم نہ ہو سکا۔

تذکرے کی پہلی اشاعت مالک رام صاحب کے رسالہ تحریر، جلد:۴، شمارہ۴، ۱۹۷۰ء میں ہوئی جہاں یہ ۱۱۶ صفحات کو محیط ہے۔ اسی کو مالک رام کی علمی مجلس دلی نے کتابی شکل میں شائع کردیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔ دونوں میں ایک لفظ کا فرق نہیں۔ مختار صاحب کے مرتبہ دیوانِ حضور ۱۹۷۷ء کی ابتدا میں جہاں ان کی دوسری کتابوں کی فہرست ہے۔

پروفیسر مختارالدین صاحب نے اپنی تدوین کے مقدمے میں آزردہ کے حالات اور شاعری کے نمونے دیے ہیں اور پھر مختصراً تذکرے کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے بعد فہرست شعرا ہے جو تقریباً ۱۰۶ ناموں کو محیط ہے۔ آگے تذکرے کا متن ہے۔ اصل مخطوطے کا متن نہایت غلط لکھا ہوا ہے۔

مختار صاحب نے خاصی محنت متن کی صحیح قرأت میں صرف کی ہے۔تذکرے کا متن ص:۶۴ پر ختم ہوتا ہے ۔اس کے بعد بیش بہا حواشی ہیں، جو ۶۵ سے ۱۲۰ تک ہیں۔مقدمے میں لکھا ہے:

''حواشی میں تفصیل کی بجائے اختصار کے اصول پر عمل رہا ہے۔دونوں آخذ تذکروں، تذکرۂ ہندی اور مجموعۂ نغز سے جملہ اضافی معلومات دی گئی ہیں۔ضروری کوائف بعض دوسری جگہوں سے بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مقصود یہ تھا کہ صرف بنیادی حالات یکجا ہو جائیں اور قاری کی واقفیت عامہ پر اعتماد کیا جائے۔''

یہ کافی اور مناسب ہے۔ہم مدوّن تذکروں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہر شاعر کے احوال کا مقابلہ دوسرے تذکروں میں مندرجہ حالات سے کرے گا۔تدوین کا بنیادی مقصد متن کی فراہمی ہے۔ مختار صاحب نے بعض مقامات پر مذکورہ دو تذکروں کے علاوہ بعض دوسرے تذکروں سے بھی مدد لی ہے ۔حواشی میں اور کئی مفید معلومات ہیں۔شعرا کے نمونۂ کلام میں جو اشعار دیے ہیں انھیں کہیں کہیں ان شعرا کے دیوان میں دیکھ کر درست کیا ہے اور اختلافِ نسخ کی صورت میں حواشی میں اندراج کر دیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسواحد قلمی نسخے والے تذکرے کی تدوین ہر طرح سے تشفی بخش ہے۔اور اس سے مختار صاحب کے کام کی اصل اہمیت کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا

دیوانِ حضور:

یہ دیوان شیخ غلام یحیٰ حضور عظیم کا ہے جو علی ابراہیم خلیل، صاحبِ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم کے معاصر تھے۔اسے مختار صاحب نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔کلیم الدین احمد کے نام انتساب ہے۔کتب خانۂ عمادیہ پٹنہ میں ایک مجموعہ متفرق چیزوں پر مشتمل ہے۔ان میں پانچویں نمبر پر حضور کے اشعار کا انتخاب ہے جو ۱۹/اوراق پر مشتمل ہے۔اس میں ایک قصیدہ، ۳۷ غزلیں (جن میں بعض کا محض ایک شعر شامل انتخاب ہے)، پانچ قطعات، آٹھ فردیات، چار مثنویات اور آٹھ متفرق اشعار ہیں۔

مرتب نے ص:۱۹ تا ۲۷ پر حضور کی شاعری کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کسی اعتبار سے درخورِ التفات نہیں۔اس کے باوجود مختار صاحب نے اس کے کلام کو تدوین کے جملہ تقاضوں کے ساتھ مدون کیا ہے، سبھی ضروری اجزا لے لیے ہیں، تذکروں سے حضور کے حالات

دیے ہیں، دیوان اور مخطوطے کی کیفیت، زبان واملا اور عروض کے عنوانات کے تحت متعلقہ پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے، قافیائی جائزہ لیا ہے۔ نیز دوسرے شعرا کے ہم قافیہ اشعار کی نشان دہی کی ہے۔ متن میں ہر نظم یا غزل کے فوراً بعد مفصل حواشی دیے ہیں۔

تذکروں میں چھے ایسے اشعار ملتے ہیں جو دیوان حضور میں نہیں۔ مرتب نے انھیں بھی دیوان میں شامل کیا لیکن مقدمے کے ص: ۱۸ پر حضور کی تصنیف سے شاہ رکن الدین عشق کے قطعۂ تاریخ وفات کا ذکر ہے۔ یہ قطعہ عشق کے مزار پر منقوش ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے حضور کے ۱۲۰۳ھ میں زندہ رہنے کا ثبوت ملتا ہے، غالباً یہ فارسی قطعہ دیوان میں شامل نہیں کیا گیا۔ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مختار صاحب نے دیوانِ حضور کو بڑی توجہ سے مرتب کیا ہے۔ موجودہ عہد میں اسی نوعیت کا کام منظر عام پر آنے کی ضرورت ہے۔ دراصل مختار الدین آرزو صاحب کی جب جملہ خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق و تدوین میں جو معیار انھوں نے قائم کیا ہے وہ آج بھی لائق توجہ ہے۔ ان کے کارنامے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں مشرقی علوم کی ترویج میں آپ کی دانشورانہ خدمات کا اعتراف برصغیر میں ہوا ہے۔

حواشی

۱۔ نقوش (ادب عالیہ) جولائی ۱۹۶۰ء ادارہ فروغ اردو لاہور

۲۔ شعبہ جاتی مجلّہ تحقیق: جام شورو، جلد ۱۸، شمارہ ۱۰، جری تا جون ۲۰۱۱ء

۳۔ مختصر تاریخ ادب اردو/محمد عقیل رضوی ص ۵۲۶/

۴۔ اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی/صابر سنبھلی ص/۴۔۱۰/اقرا آف سیٹ، جامع مسجد دہلی ۲۰۰۹

۵۔ ایضاً

۶۔ تاریخ ادب اردو/جلد ۲//وہاب اشرفی/ص/۹۵۴۔۹۵۶/ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی ۲۰۰۷

۷۔ مالک رام ایک مطالعہ/علی جواد زیدی ص/۵۔۱۰/کتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی

۸۔ ایضاً/ص/۲۷۔۳۰

۹۔ تاریخ ادب اردو/جلد ۲//وہاب اشرفی/ص/۹۵۶۔۹۵۷/ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی ۲۰۰۷

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ تذکرہ ماہ وسال/مالک رام ص ۴۲۵/مکتبہ جامعہ دہلی

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ تاریخ ادب اردو/جلد ۲//وہاب اشرفی/ص/۱۰۰۴۔۱۰۰۵/ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی ۲۰۰۷

۱۵۔ دیکھنا

۱۶۔ تاریخ ادب اردو/جلد ۲//وہاب اشرفی/ص/۸۹۹۔۹۰۰/ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی ۲۰۰۷

۱۷۔ مسعود حسین کی ادبی خدمات/ریحانہ سلطانہ ص/۱۸۰۔۱۸۹، ایس ایس گرافکس حیدرآباد ۱۹۹۵ء

۱۸۔ پروفیسر مسعود حسین کی علمی وادبی خدمات/مرزا خلیل احمد بیگ/ص ۵۰۔۸۰، بیکن بکس گلگشت ملتان/۲۰۰۷

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ (رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات، ص ۶۴۔۹۲ مکتبہ جامعہ دہلی ۲۰۰۲

۲۲۔ ماہ نامہ ضیاء وجیہ، شعائر اللہ خان وجیہی ص ۳۸۔۴۰/ اکتوبر ۲۰۰۷

۲۳۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ (پروفیسر نثار احمد فاروقی: حیات و ادبی خدمات، ص ۴۰۔۴۲ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۹۳ء

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ علی گڑھ میگزین خصوصی شمارہ (علی گڑھ میں اردو تحقیق) ایڈیٹر محمد عمران خان/ ص ۹۷۔۸۶/ شعبۂ اردو اے، ایم یو علی گڑھ۔

۲۶۔ ارمغان علمی (نذر حنیف نقوی)/ ڈاکٹر سید حسن عباس/ ص/ ۳۹/ مرکز تحقیقات اردو فارسی/ گوپال پور، باقر گنج سیوان (بہار) ۲۰۱۰ء

۲۷۔ ایضاً ص ۵۰۔۸۰

۲۸۔ اردو بک ریویو

۲۹۔ قاضی عبد الودود کی علمی اور ادبی خدمات/ ڈاکٹر محمد نور الاسلام ص ۱۸۔۳۰/ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۰۰

۳۰۔ قاضی عبدالودود/ پروفیسر وہاب اشرفی ص ۱۵۔۱۸ ساہتیہ اکادمی/ ۱۹۹۹ء

۳۱۔ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن/ گیان چند جین/ ص ۹۔۱۵/ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی/ ۲۰۰۰

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	مطبع	سن اشاعت
۱۔	لسان العرب	ابن منظور مکرم الدفریقی المصری (جلد ا)	بیروت	۱۳۰۰ھ
۲۔	تاج العروس من جوہر القاموس۔	السید محمد مرتضیٰ الحسینی	طبعۃ الکویت	۲۰۰۸
۳۔	مصباح الغات	عبدالحفیظ بلیاوی	مکتبہ دیو بند	۲۰۰۶
۴۔	دھنجد	انٹرنیٹ پر موجود فارسی لغت		
۵۔	ادبی اورلسانی تحقیق اصول اورطریق کار۔	ڈاکٹ عبدالستار دلوی،	شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی بمبئی	۱۹۸۴
۶۔	رہبر تحقیق	اردو سوسائٹی	شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ	۱۹۷۶
۷۔	تحقیق کا فن	گیان چند جین		
۸۔	المبحث العربی	انٹرنیٹ		
۹۔	تحقیق شناسی	رفاقت علی شاہد	القمر انٹر پرائیز زغزنی اسٹریٹ لاہور	۲۰۱۰
۱۰۔	اردو میں اصول تحقیق (جلد اول)،	ڈاکٹر سلطانہ بخش،	مقدرہ قومی زبان اسلام آباد۔	۱۹۸۶
۱۱۔	جدید اردو تنقید اصول ونظریات،	ڈاکٹر شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ،	۲۰۰۲
۱۲۔	تحقیق وتدوین	پروفیسر ابن کنول	کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی	۲۰۰۶
۱۳۔	اردو میں تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ	۲۰۰۵
۱۴۔	تدوین حدیث	(مقدمہ) سید سلیمان ندوی	مطبع اسحاقیہ کراچی	۱۹۹۸
۱۵۔	امام اعظم اور علم حدیث	مناظر احسن گیلانی	،انجمن دار العلوم الشہابنیہ سیالکوٹ	۱۹۹۸۱
۱۶۔	قرآن کریم			
۱۷۔	تذکرہ الحفّاظ (جلد اول)	امام ابوعبداللہ شمس الدین الذہبی،	حیدر آباد دکن	۱۹۰۰
۱۸۔	حفاظت اور صحت حدیث	محمد فہیم عثمانی	طبع دوم دار الکتب لاہور	۱۹۸۹
۱۹۔	مقدمہ ابن خلدون	عبدالرحمٰن بن محمد	دار الکتب بیروت	۲۰۰۳

۲۰۔ محدثین عظام ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، مجلس نشریات کراچی ۱۹۹۷

۲۱۔ ترجمان السنہ مولانا بدرالدین سعید کمپنی کراچی ۱۹۹۶

۲۲۔ حجۃ اللہ البالغہ (مترجم) عبدالحق حقّانی حامد کمپنی لاہور ۱۹۹۷

۲۳۔ آثار الحدیث ڈاکٹر حامد محمود دارالمعارف لاہور ۱۹۸۹

۲۴۔ سیرۃ النبی (جلد اول) علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ ۲۰۱۱

۲۵۔ علم رجال الحدیث ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، مکتبہ فردوش مکارم نگر لکھنؤ ۱۹۸۵

۲۶۔ تدوین، تحقیق، روایت رشید حسن خان اے/ایس پرنٹرز نئی دہلی ۱۹۹۹

۲۷۔ مبادیات تحقیق عبدالرزاق قریشی ادبی پبلشر، بمبئی ۱۹۶۸

۲۸۔ قاضی عبدالودود کے علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر محمونورالاسلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰

۲۹۔ اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے، ڈاکٹر معین الدین عقیل، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۸

۳۰۔ آگہی منظرنامہ وہاب اشرفی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۲

۳۱۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا سعادت حسن خان ناصر نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۱

۳۲۔ یادگار شعراء محمد رجا انصاری اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵

۳۳۔ مقدمہ تاریخ اردو زبان مسعود حسن خان ایجوکیشنل بک ہاؤ علی گڈھ ۱۹۹۸

۳۴۔ سرسید اوران کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی وفکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ، ۱۹۹۴

۳۵۔ مطالعہ حالی ڈاکٹر شجاعت علی ناصر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ، ۱۹۹۴

۳۶۔ حالی ہندوستان ادب کے معمار مالک رام ساہتیہ اکادمی، دہلی ۱۹۹۵

۳۷۔ مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر منیر جہاں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ، ۱۹۰۵

۳۸۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ ڈاکٹر انور سدید عزیز بک ڈپو، لاہور ۱۹۹۸

۳۹۔ آثار پھلواری شریف موسوم بہ اعیان وطن/مرتبہ سید شاہ محمد شعیب، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ،

۱۹۴۷

۴۰۔ اخبارالاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی ادبی دنیا ۱۹۹۴

۴۱۔ اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی۔صابر سنبھلی اقرا آفسیٹ، جامع مسجد، دہلی، ۲۰۰۹

۴۲ ارمغان علمی (نذر حنیف نقوی) ڈاکٹر سید حسن عباس، مرکز تحقیقات اردو فارسی ، گوپال پور باقر گنج سیوان (بہار) ۲۰۱۰

۴۳۔ آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب کا ارتقاء۔ڈاکٹر ارشاد ندوی نوگانوی

۴۴۔ انتخاب کربل کتھا۔ مرتبہ حنیف نقوی اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۲۰۰۷

۴۵۔ آئین اکبری جلد دوم بحوالہ نذر خدابخش ۲۰۰۲

۴۶۔ بیسویں صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین ۔سوانح ،آثار و مآخذ۔ڈاکٹر سنجیدہ خاتون، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔طبع دوم ۲۰۰۸

۴۷۔ تاریخ ادب اردو جلد ۲ وہاب اشرفی ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷

۴۸۔ تاریخ جدید بہار واڑیسہ ازفوق بلگرامی مطبع اکبری ۱۹۱۵

۴۹۔ تذکرہ علمائے بہار ابوالکلام شمسی پٹنہ ۱۹۹۰

۵۰۔ تذکرہ ماہ وسال مالک رام مکتبہ جامعہ، دہلی ۲۰۱۱

۵۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ازدانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۹۷۸

۵۲۔ سبحۃ المرجان مشمولہ نذر خدابخش ۲۰۰۱

۵۳۔ طبقات شعرالہند عطا کاکوی مطبع غیر مذکور ۱۹۱۷

۵۴۔ عربی فارسی اور علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ (سیمنار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ) مرتب سید اطہر شیر ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ ۱۹۸۳

۵۵۔ عہد اسلامی کا بنگال از محمد یحییٰ ندوی خدابخش لائبریری ۲۰۰۵

۵۶۔ فضلی اور ان کی کربل کتھا مرتبہ حنیف نقوی غالب نامہ جنوری ۱۹۸۴

۵۷۔ قاضی عبدالودود پروفیسر وہاب اشرفی ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۹

۵۸۔ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن گیان چند جین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۰۰۰

۵۹۔ پروفیسر قمر الہدیٰ سے انٹرویو جواب تک غیر مطبوعہ ہے

۶۰۔ مالک رام ایک مطالعہ علی جواد زیدی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۲۰۱۱

۶۱۔ مسعود حسین کی ادبی خدمات۔ ریحانہ سلطانہ ایس ایس گرافکس حیدر آباد، ۱۹۹۵

۶۲۔ پروفیسر مسعود حسین کی علمی و ادبی خدمات۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ بیکن بکس گلگشت ملتان، ۲۰۰۷

۶۳۔ نذر خدابخش پاکیزہ آفسیٹ پریس پٹنہ ۲۰۰۱

۶۴۔ مختار نامہ ڈاکٹر عطا خورشید، مہر الہی ندیم۔ علی گڈھ ہیر یٹیج پبلیکیشنز علی گڈھ۔ ۲۰۰۲

۶۵۔ پروفیسر مختار محقق و دانشور۔ مرتب شاہد ماہلی غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۵

۶۶۔ مقالات عرشی امتیاز علی عرشی مجلس ترقی اردو کلب روڈ، لاہور ۱۹۷۰

۶۷۔ مقالات عرشی اخلاق آہن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷

۶۸۔ مقالات قاضی عبدالودود کلیم الدین احمد

۶۹۔ مقدمہ دیوان الشعر الحادرۃ رضا لائبریری رام پور، ۲۰۱۲

۷۰۔ مقدمہ کربل کتھا مرتبہ مختار و مالک رام اشاعت پٹنہ ۱۹۶۵

۷۱۔ منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی۔ مترجم، محمود احمد فاروقی، ؛ ژتیخ غلام اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۲

۷۲۔ نذر خدابخش خدابخش فیلوز پاکیزہ آفسیٹ پریس، پٹنہ ۲۰۰۱

۷۳۔ نذر مختار مجلس مختار، نئی دہلی

۷۴۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ از ابوالحسنات ندوی، معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۶

رسائل وجرائد

۱۔ امکان ممبئی

۲۔ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جون ۱۹۹۳

۳۔ رسالہ تحقیق حیدر آباد سندھ، شمارہ نمبر ۱۲۔۱۳

۴۔ شعبہ جاتی مجلّہ تحقیق۔ جام شورو، جلد ۱۸، شمارہ ۱۰، جنوری تا جون ۲۰۱۱

۵۔ تہذیب الاخلاق۔ جولائی ۱۹۹۱

۶۔ سالنامہ، ممبئی، جولائی ۱۹۴۴

۷۔ سر سید ہال میگزین (مدیر اصغر عباس) سن ندارد

۸۔ ماہ نامہ ضیاء وجیہ۔ شعائر اللہ خان وجیہی، اکتوبر ۲۰۰۷

۹۔ اردو بک ریویو۔ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۰

۱۰۔ مجلّہ علوم اسلامیہ۔ جون ۱۹۶۰

۱۱۔ علی گڑھ میگزین خصوصی شمارہ (علی گڑھ میں اردو تحقیق) ایڈیٹر محمد عمران خان، شعبۂ اردو۔ اے ایم۔ یو علی گڑھ، ۲۰۱۰

۱۲۔ علی گڑھ میگزین۔ مرتبہ قمر رئیس۔ شمارہ اول۔ ۱۹۵۷

۱۳۔ غالب نامہ (سہ ماہی) دہلی، جنوری ۱۹۹۲

۱۴۔ غالب نامہ (سہ ماہی) دہلی، جنوری ۱۹۹۶

۱۵۔ قومی زبان، کراچی ستمبر ۱۹۹۹

۱۶۔ قومی زبان، کراچی جنوری ۱۹۸۸

۱۷۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ (رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات) مکتبہ جامعہ، دہلی، ۲۰۰۲

۱۸۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ (پروفیسر نثار احمد فاروقی: حیات و ادبی خدمات) مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۹۳

۱۹۔ ماہنامہ جدید اردو، کلکتہ، مئی ۱۹۴۲

۲۰۔ معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۸۹

۲۱۔ ماہ نامہ مخزن، لاہور، فروری ۱۹۵۱

۲۲۔ معارف رضا، کراچی، اگست ۱۹۹۴

۲۳۔ رسالہ معاصر، شمارہ ۵۸۔۱۹۸۳

۲۴۔ نقوش (ادب عالیہ)، ادارہ فروغ اردو، لاہور۔ جولائی ۱۹۶۰

۲۵۔ نقوش، لاہور، ستمبر ۱۹۶۵

۲۶۔ نقوش، لاہور، اپریل۔ جون ۱۹۶۶

MUKHTARUDDIN AARZOO BAHAISIYAT MOHAQIQ

Thesis submitted to University of Delhi

for the Degree of Ph.D

2011-2015

Submitted by

MOHD. ZUBAIR

Under the Supervision of

Prof. N.M. KAMAL

Department of Urdu

University of Delhi

Delhi-110007

پروفیسر مختارالدین احمد آرزو کا شمار یقینی طور پر دنیا کے ممتاز ترین اسکالروں میں ہوتا ہے۔ان کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع وعریض ہے۔عربی اردو اور فارسی زبانوں میں ان کی خدمات پائی جاتی ہیں۔ بظاہر وہ ہم کو عربی زبان وادب سے منسلک نظر آتے ہیں مگر انہوں نے اردو اور فارسی کے مسلم الثبوت محقق ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان زبانوں کے اہل علم میں ان کے کارناموں کو بڑی توجہ اور احترام کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔

پروفیسر مختارالدین احمد تحقیق وتدوین کے مرد میداں ہیں۔ان کا تحقیقی شعور نہایت پختہ ہے۔وہ ہر بات کو چھان پھٹک اور ٹھونک بجا کر پیش کرنے کے عادی ہیں کسی واقعہ یا فن پارے کو تاریخی واقعات اور فنی کسوٹی پر کس کر تحریر کرتے ہیں۔وہ کسی قلم کار کی بات یا تحریر کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے بلکہ وہ زیر بحث مسئلے کے جملہ پہلوؤں کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے غور وفکر کرتے ہیں۔مزید اس تعلق سے تمام جزئیات پر مکمل یک سوئی کے ساتھ مطالعہ، محاکمہ اور تحقیق کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور اس کے بعد قول فیصل کو سپرد قلم کرتے ہیں۔اس عمل میں خواہ کتنا ہی وقت لگے یا کتنی ہی محنت کرنی پڑے ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔اسی طرح جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنا بھی ان کی طبیعت سے پرے ہے۔انہی وجوہات کی بنا پر ان کے تحقیقی کارنامے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان کی تحقیق کا معیار نہ صرف ان کی مرتب کردہ کتابوں میں ملتا ہے بلکہ ان کے مقالات کا معیار بھی انتہائی بلند ہے۔ان کے مقالات اور مضامین کو پڑھ کر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔وہ ان مقالات میں اس قدر اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں کہ دوسرے ضمنی موضوعات کی نشاندہی خود بخود ہو جاتی ہے۔دراصل

تحقیق وتدوین ہرایک کے بس کی بات نہیں ہے اس میدان میں کام کرنے کے لیے تحقیقی ذوق، تبحر علمی، وسعت نظر اور مختلف میدانوں میں اچھی معلومات درکار ہوتی ہے تب یہ کام انجام کو پہنچتا ہے۔ آرزو صاحب میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین ہندو بیرون ہند میں ان کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پروفیسر مختارالدین احمد آرزو نے بہت کچھ لکھا ہے، ضخامت، تنوع، گہرائی وگیرائی ہر اعتبار سے ان کا کام توجہ کا طالب ہے۔ لیکن ان تمام کاموں میں اولیت وافضلیت ''کربل کتھا'' کو حاصل ہے۔ فضلی کی ''کربل کتھا'' جو تقریباً ایک صدی سے مفقود تھی جس کی دریافت کا سہرا مختارالدین احمد آرزو کے سر ہے۔ یہی ان کا وہ بیش بہا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے مختارالدین احمد محققین کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند اور بھی اہم مخطوطات ہیں جو انھیں کی کاوشوں سے زیور طباعت سے آراستہ ہوئے اور افادۂ عام کے لیے منظر عام پر آئے اور طلبا واسکالر نے بھر پور فائدہ اٹھایا ان میں حیدر بخش حیدری کا تذکرہ ''گلشن ہند'' مفتی صدرالدین آرزو کا ''تذکرہ ہائے اردو'' یا ''تذکرہ شعرائے اردو'' شیخ یحیٰ حضور عظیم آبادی کا ''دیوان حضور'' اور سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی کا ''تذکرہ شعرائے فرخ آباد''، اسی طرح خطوط اکبر، ذاکر صاحب کے خطوط، غالبیات میں نقد غالب اور احوال غالب وغیرہ۔

جہاں تک فضلی کی ''کربل کتھا'' کا تعلق ہے تو اب تک کی معلومات کے مطابق شمالی ہند کی اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف ہے۔ یہ ایک زمانے تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے اور اردو نثر کا یہ اہم فن پارہ تقریباً نہ کے برابر تھی، بلکہ اہل علم اس کی بازیافت سے مایوس ہو چکے تھے۔ اتفاق سے اس کتاب کی گمشدگی کے تقریباً ایک سو سال کے بعد اس کی دریافت ہوئی۔ یہ گرانقدر کارنامہ پروفیسر مختارالدین احمد آرزو نے مالک رام کی معاونت کے ساتھ انجام دیا۔ اور اس فن پارے کو غیر معمولی انہماک کے ساتھ مرتب کر کے اپنے تحقیقی ذوق، تبحر علمی اور وسعت مطالعہ کا ثبوت پیش کیا۔ مختارالدین احمد ہمارے ان محققین ومدونین میں ہیں جنہوں نے ادب کے سمندر میں غواصی کر کے ادب وتحقیق کے خزانے میں گرانقدر اضافے کیے اور اعتبار بخشا ہے۔ ''کربل کتھا'' ان کی نگارشات میں سرفہرست ہے۔

کسی بھی اچھی تدوین کا معیار کا اندازہ اس کی ابتدا میں موجود مقدمہ سے کیا جاتا ہے اور پھر متن کو مختلف نسخوں سے اصول تدوین کے مطابق مرتب کیا گیا ہو۔ اس کے آگے اختلافات نسخ، حواشی، فرہنگ اور اشاریہ ہوں ''کربل کتھا'' کا مقدمہ جو کہ زیادہ تر مختارالدین احمد آرزو کا لکھا ہوا ہے ہر اعتبار سے جامع اور معتبر ہے۔ چونکہ کتاب کا ایک ہی نسخہ مل سکا تھا اس لیے متن صحت کے ساتھ پیش کرنا کار دشوار تھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ اس کی زبان فرسودہ معرب اور مفرس ہے۔ لیکن خوش قسمتی یہ تھی کہ دونوں مرتبین عربی کے بھی عالم تھے۔ اور نسخہ واحد ہونے کی وجہ سے اختلاف نسخ کا سوال ہی نہ تھا۔ لہٰذا قرأت کی تصحیح ہر صفحہ کے نیچے فٹ نوٹ اور حواشی فٹ نوٹ میں ہیں۔ اور اختتامی اجزاء میں سب سے پہلے عربی عبارتوں اور فقروں کی فرہنگ ہے جس میں اردو ترجمہ کے علاوہ یہ بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ عبارت کہاں سے ماخوذ ہے۔ پھر چار صفحوں میں فہرست ماخذ حواشی ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں کتابیات کی فہرست ہے جو کہ کتاب کے آخری صفحات پر ہے۔ کتابوں کے نام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب نے کتنی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ اعلام، امم وقبائل، غزوات وایام، بلد واماکن، متعلقہ ایات قرآنی، احادیث نبوی، اقوال وحکم کتب ادادۂ متن، الفاظ مستعملہ قدیم کی فہرستیں بھی موجود ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر مرتب کے علم وفضل اور عرق ریزی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح ہم پورے اعتبار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''کربل کتھا'' کی تدوین مثالی معیار کی ہے۔ اور اس کارنامے نے مختارالدین احمد آرزو کو پایۂ اعتبار بخشا ہے۔

اسی طرح جب غالب کے حوالے سے بات کی جاتی ہے تو اس میں بھی مختارالدین آرزو کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ غالب کے حالات اور خطوط کے سلسلے میں ان کی کاوشیں اور دلچسپیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان کا نام بجا طور پر ماہر غالبیات میں لیا جاتا ہے۔ بلکہ میں یہاں پر مختصراً یہ کہتا ہوں کہ غالب پر کام کرنے والا کوئی اسکالر، کوئی نقاد پروفیسر مختارالدین احمد کی مرتب کردہ کتابوں کے ان مقالات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ بالفاظ دیگر غالب کے سلسلے میں کوئی بھی تحقیق بغیر ان کتابوں سے رجوع کیے مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سلسلے میں ان کا قابل ذکر کارنامہ ''احوال غالب''، ''نقد غالب'' اور علی گڈھ میگزین کا غالب نمبر شامل ہے۔

اسی طرح مکتوباتی ادب کے ادبی وتاریخی اہمیت وارتقاء کونظر میں رکھتے ہوئے متقدمین کے اس دور کی چار اہم وممتاز شخصیات یعنی غالب، مصطفیٰ غوث، بیخود، سرسید احمد خاں اور محمد حسین آزاد کے خطوط کی بازیافت کی اوران پر مناسب تعارفی نوٹ اورحواشی لکھے اور شائع بھی کرائے یہ بہت وقیع کام ہے جس کوانہوں نے انجام دیا۔اس کے علاوہ متاخرین ومعاصرین میں ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود وغیرہ کے خطوط بھی آپ نے بڑی محنت سے شائع کیے۔

قلم کو یارانہیں کہ پروفیسر مختارالدین احمد کی ادبی وتحقیقی خدمات کا ذکر ہواوران کی عربی زبان وادب کی خدمات کا ذکر نہ کیا جائے۔دراصل وہ عربی ہی کے آدمی تھے۔انہوں نے بین الاقوامی شہرت کی حامل علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے عالم اسلام کے مایۂ نازمحقق اورعربی کے جید عالم علامہ عبدالعزیز یمینی کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔اورآکسفورڈ یونیورسٹی سے پروفیسر گب کی نگرانی میں ۱۶ ماہ کی قلیل مدت میں ڈی فل کا مقالہ پیش کیا۔ان کی عربی خدمات میں **الامیر موید الدوله اسامه بن منقذا الكسائی الشیذری، فضائل من اسمه احمد و محمد لابن بكير البغدادی، المختار من شعرابن الدّمينيه، الحماسة البصرية لصدر الدين على بن ابى الفرج البصرى ، رسالةالمبّرد النحوی، كتاب مجالس الميمنى للعلامة الشيخ الاستاذ عبدالعزيز الميمنى قدّ له وحققه علّق عليه الدكتور مختارالدين الأحمد۔**

تحقیق وتدوین کی خشک اورسنگلاخ وادیوں کا یہ مسافر گل گلستان بلبل وچمنستان کی سیر کرتا ہوااور فصل گل سے وسعت دامن کی دعا لیتا ہوااورنشۂ عشق ومحبت سے سرشار، بادصبا سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا غزل کی زلف گرہ گیر کوسلجھاتا ہوا بھی نظرآتا ہے۔اگرانھوں نے تحقیق وتدوین کے اعلیٰ نمونے پیش کیے تو ان کی شاعری میں بھی سلاست اورروانی کے ساتھ غزل کا چٹخارہ ملتا ہے۔نمونہ شاعری ملاحظہ ہو:

سکوں کے نام سے گھبرائے گی عمر رواں میری
قیامت تک نہ کم ہونگی خدا بے تابیاں میری
کبھی تو پر اثر ہونگے نالے فغاں میری

میں چپ سنتا رہوں گا وہ کہیں گے داستاں میری

مری بے تابیِ دل ڈھونڈھ لے گی خود ہی منزل کو

تو اے سعی عمل نذر سکونِ کارواں کیوں ہو

تلاشِ یار میں پائے سبک سے کام لیتا ہوں

مری وحشت خرامی دشت پر بار گراں کیوں ہو

تحمل کا سبق لیتا رہے انساں اگر غم سے

خوشی حد سے گذر کر وجہ مرگ ناگہاں کیوں ہو

پڑی رات بھر ساقی، سحر کو توبہ کر لینا

ابھی سے آرزوئے بادہ کش خوف اذاں کیوں ہو

بہار صحن گلشن کب رہیں آتش گل ہے

چمن کی داستاں کیا داستان سوز بلبل ہے

بتِ آتشِ شعا کے عارضوں گلگلوں پہ کاکل ہے

کہ صبح نور پروردہ اسیر شام سنبل ہے

مجھے ڈر ہے صدا دونوں کی آپس میں ٹکرائے

ادھر ہیں شیخ کے نعرے ادھر آواز قلقل ہے

عجب انداز سے اس شوخ نے گیسو سنوارے ہیں

فلک پر صورت آئینہ حیراں سب ستارے ہیں

ورق بکھرے ہیں شاید مصحف ہستی بسمل کے

وگرنہ ہاتھ میں قاتل کے کیوں قرآں کے پارے ہیں

زیرِنظر مقالہ ''مختارالدین احمد آرزو بحثیت محقق'' کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چونکہ مقالہ کا تعلق تحقیق سے ہے لہٰذا پہلے دو ابواب میں تحقیق اور اصول تحقیق پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

پہلا باب ''تحقیق منظر و پس منظر'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس کو چھ حصوں میں تقسیم کر کے تحقیق کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تحقیق کی تعریف جو کہ متعدد محققین

نے کی ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد تحقیق کی قسمیں، تحقیق کے مقاصد اور تحقیق کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر کے دو ذیلی عنوان میں تحقیق کے سرچشموں کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور اسلامی طرز تحقیق کے عنوان سے تحقیق کے منبع اصلی تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اور سب سے آخر میں جدید سائنسٹفک تحقیق کے عنوان سے مغربی طرز تحقیق کا جائزہ لے کر اس باب کو اپنے اختتام تک پہنچایا گیا ہے۔

باب دوم ''اردو میں تحقیق کی روایت'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) ''اردو میں تحقیق کا آغاز وارتقا'' اس میں اردو زبان وادب میں تحقیق کی ابتدا سے لے کر آج تک تحقیقی کارناموں کو لانے کی کوشش کی ہے اور پورے تحقیقی کارنامے پر ایک طائرانہ مگر وقیع نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرا حصہ (ب) ''جدید اردو تحقیق اور اصول تحقیق'' اس میں جدید اردو تحقیق کا معیار اور مقام کے ساتھ ساتھ بعض محققین نے تحقیق کے جو اصول مرتب کیے ہیں ان کا بھی خاطر خواہ جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم ''مختارالدین احمد آرزو آئینہ ایام میں'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے اور اس باب کو پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلے تین حصوں میں مختارالدین احمد کے وطن اصلی صوبہ بہار کا سماجی ومعاشی اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے بہار کے بعض علمی خانوادوں کا ذکر کیا گیا ہے اور زبان وادب کی خدمات میں ان کا جو حصہ رہا ہے اس کو مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوتھا حصہ پروفیسر مختارالدین آرزو کی زندگی سے متعلق ہے اس میں موصوف کے خاندان، پیدائش، تعلیم وتربیت، ملازمت اور شاعری وافسانہ نگاری کے ساتھ اہل وعیال حتیٰ کہ اعزازات تک کے ذکر پر محیط ہے۔ پانچویں حصہ میں پروفیسر مختارالدین آرزو کی تحقیقی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کو بارہ مختلف خانوں میں رکھا گیا ہے (۱) اردو تصنیفات وتالیفات کا جائزہ (۲) عربی تصنیفات کا جائزہ (۳) انگریزی تصنیفات وتالیفات کا جائزہ (۴) ان کے اشاریے ومقالات (۵) ان کے وہ مضامین جو انھوں نے اپنے ہم عصروں پر لکھے ہیں (۶) وہ مضامین جو انھوں نے مستشرقین شخصیات پر قلم بند کیے ہیں (۷) تذکرہ علماء وصوفیہ (۸) تذکرہ ادباء وشعراء مشاہیر جو کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے تھے۔ (۹) غالبیات